زندگی

مصنّفہ

چوہدری افضل حق

پبلشر

قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

سنہ ۱۹۳۸ء

بارِ چہارم

قیمت مجلد عہ بغیر جلد ۱۲؍

زندگی

فہرستِ مضامین

دیباچہ

زندگی کی تصنیف کا محرک نہ تقابل کا خیال تھا نہ کسی سے مسابقت مدِ نظر تھی۔ گورکھپور جیل میں میری قید کی تنہائیوں کا واحد مشغلہ یہی تصنیف تھی۔ اس کا ماخذ نہ ڈیوانیا کامڈیا ہے، نہ ابنِ عربی کی کوئی تصنیف، تاہم یہ خیال اچھوتا نہیں بلکہ تمام مذاہب کا یہ یکساں کارفرما اصول ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ یہی اصول اس کتاب کا اساس و بنیاد ہے۔ بیشک آتشیں شریعت لے کر آنے والے نے عمل اور پاداشِ عمل کی حقیقت کو جن طریقوں سے انسانوں کے ذہن نشین کرایا یہ کتاب اُس کی صدائے بازگشت ہے۔ زندگی خیر الناس من ینفع الناس کی تفسیر ہے، اور لوگوں میں زندگی کا شعور پیدا کرنے کی ایک سعی ہے، عزیزوں اور پڑوسیوں کے حقوق کی نگہداشت کرنے اور خدمتِ خلق کے جذبہ کو بروئے کار لانے کی ایک کوشش اور کاوش ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے گوناگوں تجربوں کی بنا پر آنے والی نسلوں کے لئے میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کو زندگی میں کامیابی کے ساتھ کہہ دیا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی ہے کہ جس نے اس کتاب کو پڑھا ہے اُسے میرا مقصد آسانی سے سمجھ میں آگیا ہے۔ اب

مزید حواشی کی ضرورت نہیں۔ زندگی کے نئے مسافروں کے لئے یہ کتاب بہترین رہنما ہوسکتی ہے۔ عمر رسیدہ احباب کے لئے بھی اس کے بعض ابواب عمر رفتہ کی تصویریں یاد یا آئندہ کا ہولناک تصوّر ہوسکتے ہیں۔ وہ قومیں جو زندگی کے ڈراما کو ایک بیکار تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے کی خُوگر ہیں اور اپنی زندگی کو اہلِ دُنیا کے لئے مفید بنانے سے لاپرواہیں، کیا تعجب ہے کہ وہ نئی اُمنگوں کے ساتھ انسانیت کی تعمیر میں لگ جائیں۔

غمگین و اسیر بلبل سے آزاد فضا میں اُڑنے والے طائر کی طرح رنگین نوائی کی توقّع کون کرسکتا ہے۔ مجھ جیسے جیل کے افسردہ خاطر پرندہ سے کسی شگفتہ تحریر کی اُمید نہ کی جاسکتی تھی چنانچہ کتاب کو پسندِ خاطر پاکر بعض احباب نے میرے اس کتاب کے مصنّف ہونے پر تعجّب کا اظہار کیا۔ میں اس تعریض کو بھی بہترین تعریف سمجھتا ہوں۔

آخیر میں مَیں یُو پی گورنمنٹ اور گورکھپور جیل کے افسران کا شکرگزار ہوں جنھوں نے بلا تامّل کتاب کی تصنیف کی اجازت دے دی۔

فضل حق

ایم۔ ایل۔ سی

مقدمہ

چودھری افضل حق صاحب کا ارادہ تھا کہ "زندگی" کے آغاز میں ایک مبسوط دیباچہ لکھ کر وہ تمام اسباب بیان کر دیئے جائیں جو اس کتاب کی تحریر کے محرک ہوئے۔ اور ساتھ ہی اُن مقامات کی شرح بھی کر دی جائے جن کے متعلق عوام میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ لیکن ابھی وہ کتاب کی ترتیب سے پوری طرح فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اُن کی گرفتاری اور اسیری کا مرحلہ پیش آیا۔ اور اب یہ کتاب کسی مبسوط دیباچہ اور تفسیری حواشی کے بغیر شائع ہو رہی ہے۔

زندگی کا دیباچہ تو چودھری صاحب خود لکھیں گے اور اُسے دوسرے ایڈیشن کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔ میں مختصراً کتاب کے عام انداز اور مطالب کے متعلق چند باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

بظاہر زندگی کا انداز اطالوی شاعر ڈانٹے کی مشہور تصنیف "ڈیوائنا کامیڈیا" سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کی نظر سے فتوحاتِ مکیہ کے وہ ابواب نہیں گزرے جن میں شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی نے اپنی مباحث میں عالمِ علوی کی کیفیت بیان کی ہے وہ یقیناً اسے "ڈیوائنا کامیڈیا" کی صدائے بازگشت سمجھیں گے۔ لیکن اہلِ نظر کے نزدیک یہ انداز ایک مسلمان اہلِ قلم کے لئے اس قدر اجنبی نہیں کہ اسے ڈانٹے کا شرمندۂ احسان ہونا پڑے

اس کے علاوہ "ڈیوائنا کامیڈیا" اور "زندگی" کو ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو مغرب کو مشرق سے ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جن دنوں چودھری صاحب گوشۂ زندان میں بیٹھے زندگی کی تصنیف میں مصروف تھے۔ مشرق کے مشہور حکیم اور شاعر علامہ اقبال ڈانٹے کی کتاب کا جواب لکھ رہے تھے۔ حضرت علامہ کی یہ تصنیف جاوید نامہ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ دونوں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے مطالب میں بہت حد تک تشابہ و تماثل پایا جاتا ہے۔ دونوں میں اگر کوئی نمایاں فرق ہے تو وہی جو حکیم اور شاعر اقبال اور زنداں نشیں فضل حق کے درمیان ہے۔ وہاں جو باتیں ہزاروں شاعرانہ اداؤں اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں وہ یہاں سیدھے سادے الفاظ میں کہہ ڈالی گئی ہیں۔

حضرت علامہ کے مخاطب خواص ہیں اور چودھری صاحب کے عوام۔ اس لئے وہاں بعض مقامات پر اشاروں اور کنایوں سے کام لیا گیا ہے اور یہاں رمز و کنایہ کے سارے حجاب اُٹھا دیئے گئے ہیں۔ حضرت علامہ کی جولاں گاہِ تخیل ساری کائناتِ ہستی ہے۔ لیکن چودھری صاحب کا دائرۂ فکر و نظر زیادہ تر اُن مسائل تک محدود رہا ہے، جن کا تعلق اقوامِ مشرق سے ہے۔ بعض مقامات پر اُنھوں نے نہایت استقصا سے کام لیا ہے۔ اور اکثر ایسے مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی مباحث کی جزئیات و تفاصیل بیان کر دی ہیں، جن کی طرف آج تک توجہ نہیں کی گئی۔ کتاب کے ان حصّوں کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چودھری صاحب کا مطالعۂ زندگی کس قدر وسیع ہے۔ اس

سے میرا مقصود ہرگز یہ نہیں کہ زندگی کو جاوید نامہ پر فوقیت دی جائے یا چودھری صاحب کو علامہ اقبال کا مدِمقابل ثابت کرنے کی سعی کی جائے۔ دونوں کا فرقِ مراتب ظاہر ہے۔

"زندگی" صحتِ خیال اور پاکیزگیٔ مطالب کے اعتبار سے دورِ حاضر کے اکثر معنی طراز ادیبوں کی دقیقہ سنجیوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور بے خوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی مفید کتابیں اُردو میں بہت کم شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی کی سطور میں جوش و سرمستی اور خلوص و صداقت کا جو پرتو نظر آتا ہے وہ ہمارے ادیبوں کی الفاظ آرائیوں کو کہاں نصیب ہے سے

"یک ذرّۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ"

چراغ حسن حسرت

بابِ اوّل

معمۂ آفرینش

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سپیدۂ صبح دُلہن کی نیند سے کھلنے والی آنکھوں کی طرح آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔ اور موسم بچے کے تبسّم سے زیادہ خوشگوار تھا۔ پرندے اپنے دلکش نغموں سے کلیوں کو بیدار کر رہے تھے اور میں شوالک کی چوٹی پر اپنی کُٹیا میں بیٹھا قدرت کے عالم فریب حُسن کو دیکھ کر قدیر کی حمد میں ترانہ ریز تھا۔ یک بیک کسی نے چٹان کے عقب سے ساز کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑا۔ مضراب کی بے قاعدہ چوٹ باقاعدہ نغمے میں تبدیل ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سُریلی نسوانی آواز نے اثر کا ایک بحرِ ناپیدا کنار بہا دیا۔ جس کی امواجِ مسرت سے میری کشتیٔ حیات ہچکولے کھانے لگی۔ بوئے گُل اور نغمۂ شیریں انسان کا دامن پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ مجھے راگ نے مغنّی کا شوق دلایا۔ میں اُٹھا تاکہ دیکھوں کہ کس نے میرے پُرسکون دل میں تلاطم پیدا کر دیا۔ میں بڑھا مگر افسوس کہ راگ ختم اور ساز خاموش ہو چکا تھا۔ میں نے چٹان کے نکڑ سے آگے بڑھ کر جو کچھ دیکھا۔ وہ بازیافت ہے قصّۂ کلیم و طور کی۔ محرابی چٹان

کے نیچے سادہ مگر پاکیزہ لباس میں ایک حُسن کی دیوی ساز و مضراب لئے بیٹھی تھی کہ کوئی نیا ترانہ چھیڑ دے۔ میری آہٹ پا کر اُس نے اپنی نرگسی آنکھیں اُٹھائیں جراٗت شکن تیوروں کو دیکھ کر قدم رُک گئے۔ مَیں اُس عقیدت مند اچھوت کی طرح کھڑا ہو گیا۔ جسے صرف دُور سے دیوی کے درشن کی اجازت تو ہے مگر مندر میں داخل ہو کر پاؤں چھُونے کا حکم نہیں۔

سُورج کرنوں کا زریں تاج لے کر اُس ملکۂ حُسن کی رسمِ تاجپوشی ادا کرنے کے لئے نکلا۔ وہ اُٹھی۔ پہاڑی سے اُتری۔ دامنِ کوہ کے سبزہ زار میں خاموش ندی کی طرح چلی گئی۔ میں اُسے اس حسرت سے دیکھتا رہ گیا جیسے منزل سے دُور اُفتادہ اور درماندہ مسافر غروب ہوتے ہوئے آفتاب کو۔ اس کے بعد آنکھیں شوقِ دید میں ہمیشہ فرشِ راہ رہنے لگیں میں کٹیا کے دروازے پر اُمید لے کر بیٹھتا لیکن مایوسی لے کر اُٹھتا تھا۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ مگر اس کا گزر نہ ہُوا۔ ایک دن کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اُمیدیں سجدہ ریز ہوئیں۔ زبان پُکاری۔ خدایا! یہ وہی ہو۔ معلوم ہُوا کہ آج تاثیر دُعا کے ہاتھ پر بیک چُکی تھی۔ وہ دلآرام دروازے کی دہلیز پر کھڑی تھی اور چاہتی تھی کہ اندر داخل ہو کر رونق کاشانہ بنے لیکن میرے گھر کی تنگی اور تاریکی سے کچھ وہ پریشان اور اس کے شایانِ شان سامان نہ ہونے سے میں حیران۔ اُسے بیٹھنے اور مجھے بٹھانے میں تردد تھا۔ آہ میری بے بسی کو کون شاعر بیان کرے۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا

آخر وہ مایوس ہو کر لوٹ گئی۔ مدت تک میرے خواب و خیال کی دنیا پر اُس کی حکمرانی رہی۔ صنم آشنا ہوتے ہی میں درد آشنا بھی ہو گیا۔ ساز و سرود انیس تنہائی بنے۔ ایک دن میں مستِ سرود تھا۔ شام دن کی زندگی کو ختم کر چکی تھی۔ طیور بسیرا ڈھونڈ رہے تھے۔ بادلوں میں کچھ زردی باقی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے نغموں کے ساتھ کسی اور کے نغمے بھی ملے ہوتے ہیں۔ میں چونکا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی مغنیہ تھی اور مستِ سرود ہو کر اپنا رباب بجا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر بھولے زخم تازہ ہو گئے۔ میں نے شرم کے مارے مُنہ ڈھانپ لیا۔ کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھولیں تو میں تنہا تھا ماہتاب ستاروں کی فوج میں گھِرا کھڑا تھا۔ تیتریاں روشنی میں خوش وقت ہو رہی تھیں۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ تقدیر بگڑ کر بن گئی۔ موسم بہار جا کر آ گیا۔

صبح اُٹھا۔ میرا دل سینے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ جدھر نظر اُٹھتی تھی قدرت باغ باغ دکھائی دیتی تھی۔ گلزار کے سبز پوش پھولوں کے زیور پہنے کھڑے تھے۔ ہوا بہار کی تعریف میں گنگنا رہی تھی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مسکراتی ہوئی آئی۔ آنکھ مچولی کھیلنے والوں کی طرح پیچھے سے میری آنکھیں بند کر کے کہا کہ میں اب تیری ہو گئی۔ اس احساس سے کہ وہ اب میری ہو گئی ہے مسرت کا سمندر اُمنڈ آیا۔ اور میں بےبس تنکے کی طرح اُس میں بہا چلا گیا۔ جب میں ذرا آپے میں آیا تو اپنے آپ کو ادعوئے ایک نئے مقام اور نئے لوگوں میں پایا۔ اس دُنیا میں اچانک آ نکلنا طلسم ہوشربا کے افسانے سے کیا کم تھا۔ لاکھ سر مارا

خاک سمجھ نہ آئی - کچھ مدت رعبِ حُسن مانعِ سوال رہا - آخر مناسب موقع پاکر میں نے اُس طلسماتی ملکہ سے آوارہ وطنی کی وجہ پوچھی - تو اُس نے کلی کی طرح مسکرا کر کہا - کہ اے جویائے راز اُس بے نیاز نے اس آب و ہوا میں ہماری نشو و نما کی از بس صلاحیت رکھی ہے - متروک ملک میں یہ ممکن نہ تھا - اس سرزمین میں تم کوئی ایسا سر نہ دیکھو گے جس میں ترقی کی ہوا نہ ہو - ہمت کے معرکوں کا یہی تو میدان ہے -

" مگر محبوب تمہیں یہ بات کس نے بتائی - ہم یہاں کیونکر پہنچے ؟ "

" میں شوالک کی بلند ترین چوٹیوں پر ایک دن مستِ خرام تھی اور اپنا رباب بجاتی اور خدا کی حمد گاتی تھی - جنت کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا میں یکایک - مجھے لاسلکی کے آوارہ پیغام کی طرح ایک خاص حرکت محسوس ہوئی - میں نے جب غور کے کانوں سے سُنا تو قدسیوں کی زبان کو اپنے ہی متعلق رطب اللساں پایا - دُوریِ مقام کی وجہ سے میں تمام رازوں سے کماحقہٗ تو واقف نہ ہو سکی - مگر جس قدر بھی سُنا - یقیناً تم اُس کے متحمل نہیں ہو سکتے - قدسیوں کے لطیف اشاروں کو جنسِ لطیف ہی سمجھ سکتی ہے "

اس طوطیِ شکر ریز نے آخری الفاظ کی ظاہری تلخی کو اپنے حُسنِ بیان سے دُور کر دیا - میں جان گیا کہ اُسے افشائے راز میں تامل ہے اور حقیقت کو الفاظ کے پردے میں مستور رکھنا چاہتی ہے - اس لیئے میں نے بھی اُسی کا سا اندازِ تکلم اختیار کر کے کہا - کہ اے جانِ جہاں - میں تو خوب جانتا

ہوں کہ مَیں جسمِ کثیف ہوں اور تُو رُوحِ لطیف ۔ کہاں خاک اور کہاں عالمِ پاک ۔ مَیں متشکک نہیں ہوں ہاں متجسّس ضرور ہوں ۔ کیا مَیں پوچھ سکتا ہوں کہ وطنِ مالوف یہاں سے کتنی دُور ہے ؟ اس پری رُو نے چھوٹے سے خوبصورت مُنہ سے ایک بڑا خوشگوار قہقہہ لگایا اور کہا " دُھند کا باریک پردہ درمیان ہے ۔ نظر اُٹھاؤ تو دُور دکھائی دیتا ہے ۔ چل پڑو تو چشمِ زدن میں جا پہنچو ۔ جس طرح آنکھ کھُلنے پر ہم نے اپنے آپ کو یہاں پایا ۔ بس آنکھ بند ہوتے ہی وہاں موجود ۔ چندے یہیں قیام کرو ۔ سود و زیاں کو پہچانو ۔ پُر منفعت مال پر ہاتھ ڈالو ۔ گھاٹے کا سودا نہ کرو تاکہ مراجعتِ وطن پر امن و عیش میں بسر ہو ۔ مبارک ہوگا وہ دن جب ہم گوہرِ مقصود سے مالا مال ہو کر واپس لوٹیں گے "

اُس نے تو بات ختم کر دی ۔ لیکن میں علامتِ استفہام بنا بیٹھا رہا ۔ میرے لئے یہ نزدیک و دُور کا معمّہ ابھی تک حل طلب تھا ۔ مجھے عالمِ استعجاب میں پا کر مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی ۔ اور اک ادائے مستانہ اُس کے سر سے پاؤں تک چھا گئی ۔ ایک غلط انداز نگاہ سے اُس نے مجھے دیکھا تاکہ معلوم کرے کہ اُس کی ان باتوں کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہے ۔ مَیں نے اُس کا مطلب پا کر قصّہ ختم کرنے کے لئے کہا ، کہ اے دیوی ! تُو عقلِ کُل ہے اور میرا علم محدود ۔ مجھے یارائے کلام نہیں ۔

مذہباً تو ہم شوالک کی چوٹی پر ہی ایک دوسرے کے شریکِ زندگی ہو چکے تھے ۔ رسماً آج چند ہمسایوں کی موجودگی میں قاضی کی وساطت سے

میاں بیوی بنے۔ اور اسی جگہ یک جان ہو کر جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دن بسر کرنے لگے۔ دل محبوب کی محبت کا گرویدہ تھا۔ اور آنکھ ہر وقت اس کے حسنِ بے مثال کی تماشائی۔ اس کی شاذ شاذ فرمائشیں بارِ خاطر نہ تھیں۔ میری استطاعت سے بڑھ کر کبھی کوئی مطالبہ نہ ہوتا تھا۔ گو وہ نورِ ہدایت تھی لیکن سخت گیر نہ تھی۔ میری کوتاہیاں اشاروں اور کنایوں میں بتا دیتی تھی۔ میری کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتی تھی۔ اور میرے حسنِ عمل پر تحسین و آفرین کے پھول برساتی تھی۔

ترغیبِ گناہ

میں جلد ہی محکمۂ انصاف میں ملازم ہو گیا۔ محنت اور تدبیر سے میں نے اپنی تقدیر کو بنایا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں خاصا سرمایہ جمع کر لیا۔ ایک دن علی الصبح میں گھر سے نکل کر سیر کے لئے جا رہا تھا۔ سورج سردی میں کانپتا کانپتا نکلا اور جاڑے کی تاب نہ لا کر پھر کہر کے لحاف میں دبک گیا۔ آنسو بھری آنکھوں کو جس طرح چیزیں دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہیں عین وہی عالم تھا۔ اس دھندلکے میں میں نے کسی کو اپنی طرف اس طرح آتے دیکھا جیسے موسلا دھار بارش کے وقت سطحِ سمندر پر بادبانی کشتی۔ آنے والے نے چند قدم پر آ کر سلام کیا۔ نزدیک آ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سلام کا جواب دے کر ہاتھ ملایا۔ یہ ایک معمر بزرگ تھے۔

فید انگرکھا زیب بر تھا۔ ڈاڑھی ناف سے بھی قدرے نیچی تھی۔ مونچھیں تراشیدہ
ہیں۔ ایک لمبی تسبیح کے دانوں پر انگلیاں اس طرح پھر رہی تھیں جیسے
ب کہنہ مشق استاد کی انگلیاں ہارمونیم پر۔ اس نے مجھے یوں
اطب کیا:۔

"محنت کش نوجوان! میں تجھ سے مل کر ازحد مسرور ہوا ہوں۔ تیری
ت اور دیانت داری کی شہرت نے مجھے تیرا گرویدہ بنا دیا ہے۔"

میں نے کہا "معزز بزرگ میرے لئے یہ فخر کا مقام ہے کہ میں
پ جیسے بزرگوں کی نظرِ التفات کا مرجع بنا۔ افسوس ہے زندگی کے ان
ں پر جو آپ کے قدموں سے دور محرومی میں بسر ہوئے۔" وہ مسکرا کر بولا۔
ے وارفتۂ حسن۔ جب کبھی پیوستگیِ عشق سے دل اکتا جائے تو میرے
یب خانے پر آ کر دل بہلایا کر۔ شوالک کی پہاڑی لڑکی کے دلدادہ نوجوان!
ں خاک نے اور کئی تابناک گوہر پیدا کئے ہیں۔ اگر نظرِ انتخاب اٹھے تو
ں نہ لوٹے۔ مگر تیری سادہ لوحی قابلِ رشک ہے۔ تو سیپ کو ہی موتی سمجھ
پھولا نہیں سماتا۔ اس وقت تو مجھے کچھ کام ہے۔ کبھی شام کے وقت
ت پاؤ تو کھڑے کھڑے غریب خانے تک ہو جانا۔ وہاں تیری
لگی کے ہزاروں سامان ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا نام اور پتہ بتایا
سکرا کر چلا گیا۔ اس کی پیشانی پر شکن اور آنکھوں میں فتنہ خیز چمک تھی۔
ہ بڑا لسّان تھا۔ مگر اس کی گفتگو پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔
سارا دن میں اس ملاقاتی کی گفتگو کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا

رہا۔ شام کو انہی خیالات میں مستغرق واپس گھر لوٹا۔ وہ حور میری آمد پر خوش ہوتی۔ لیکن مجھے متفکر سا پاکر گھبرائی۔ گویا لمحہ بھر کے لئے بہار آئی اور پھر خزاں چھا گئی۔ میں اس کی گھبراہٹ کی وجہ سمجھ کر اپنے آپ کو خوش ظاہر کرنے لگا۔ اور ہنسا۔ میری ہنسی سے اس کی جان میں جان آئی۔ گھر پھولوں بھرے باغ کی طرح کھل گیا۔ وہ انتظامِ خانہ داری میں اس طرح پھرنے لگی جس طرح صحنِ چمن میں کبکِ خوش رفتار۔

جب وہ متاعِ خوبی کھانا لے کر آتی تو طعام کے ساتھ سلسلۂ کلام بھی شروع ہو جاتا۔ کبھی میٹھی باتوں سے شکر ریزی کرتی۔ کبھی چٹکلے سنا کر حدیثِ مائدہ میں نمکینی پیدا کرتی۔ اس طرح گھر کا نان و نمک من و سلویٰ سے سوا مزہ دیتا۔ میری زندگی کیا تھی؟ محبت و عشق کا ایک اچھوتا راگ جیسے مسرت کی پری اطمینان کا جھولا جھولا کر گا رہی ہو۔"

آج کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے کہا۔ اے جانِ جہاں تو سمجھتی تھی کہ تیرا راز صرف فرشتوں کے سینوں میں ہی چھپا ہوا ہے۔ لیکن وہ کب کا بوئے گل کی طرح رسوائے زمانہ ہو چکا۔

اس نے ایک دلنواز تبسم سے کہا۔ "میرے سرتاج! میرا کوئی راز نہیں ہے، البتہ میں خود رازِ ہستی ہوں۔ بجز خالق کے میرا کوئی رازداں نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم دنیا کے دمبازوں کے فقروں میں نہ آجاؤ۔ میں تو ہر بلا و ابتلا سے مامون و مصئون ہوں۔ مجھے تیرے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا اور ہمسایہ عورتوں تک سے بات چیت ایسی ہی ناپسند ہے جیسے عروس

تو کو سسرال کے گھر میں لب کشائی۔ مجھے تمہاری فکر دامنگیر ہے۔ تم مرد ہو بزرگوں سے سنا ہے کہ گناہ مردوں کے گرد و پیش اس طرح منڈلاتے رہتے ہیں جس طرح کالی بلائیں آدھی رات کے وقت مرگھٹ میں۔

میں نے اس بزرگ کی ملاقات کا حال سنایا اور ساری گفتگو دہرائی۔ جب بتایا کہ خانِ دوراں اس کا نام اور عشرت منزل اس کا مقام ہے تو اس کا رنگ زرد اور جسم سرد ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو اُبل آئے۔ کاجل کی دھاریں رخساروں پر بہ نکلیں۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ اے سرمایۂ زندگانی اس پریشانی کا کیا سبب ہے؛ کچھ مجھ پر تو کھلے۔ اُس نے کچھ جواب تو نہ دیا لیکن وہ ساون کی جھڑی کی طرح آنسو بہاتی رہی۔ شب تیرہ و تار تھی۔ ہوا کے تند جھونکے مکان سے ٹکرا رہے تھے۔ میں پوچھ پوچھ کر تھک گیا۔ لیکن وہ رو رو کر نہ ہاری۔ آخر کار وہ روتے روتے لیٹ گئی۔ میں پوچھتے پوچھتے سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو صبح مسکرا رہی تھی اور وہ سلفچی لئے منہ ہاتھ دُھلانے میرے سرہانے کھڑی تھی۔ اس کے گھنگریالے بال ہوا کے جھونکوں سے اس طرح لہرا رہے تھے گویا بحرِ حسن میں موجیں اٹھ رہی تھیں۔

روٹھی ہوئی رفیقۂ حیات کو منانے کے لئے خود روٹھ جانا چلتا جادو ہے چنانچہ میں نے خلافِ معمول ایسا ہی کیا اور صاف کہہ دیا کہ نہ تو میں کھانا کھاؤں گا۔ اور نہ گھر سے جاؤں گا۔ میں بناوٹ کے کھٹ کھٹ کرتا ہوا سیڑھیوں سے اُترا آنگن سے گزر کر کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ اور دروازے کو اندر سے زنجیر لگا کر چھپرکھٹ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنی اس حرکت پر پشیمان سا ہونے لگا۔ سوچا کہ یا تو وہ ناز بردار ہا، یا یہ تغافل شعار یار۔ اس گوہر شب چراغ

کو اپنی قدر معلوم نہیں۔ ورنہ کہیں زینتِ محل ہوتی۔ چترِ شاہی سر پر قربان ہوتا تخت
پاؤں چھوتا۔ حق تو یہ ہے کہ اُس دُرِ شاہوار کی خاکساری نے مجھے قدر ناشناس
کر دیا۔ اس کے پاؤں دھو دھو کر بھی پیتا تو حق ادا نہ ہوتا۔ میں دوڑ کر قدموں پر سر
رکھ دینا چاہتا تھا کہ اس کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھٹکھٹا کر بھرائی ہوئی
آواز میں بولی "خدارا میرا قصور معاف کرو۔ باہر آؤ جو پوچھو گے بتاؤنگی۔ جو کہو گے کرونگی"
اس پر میں اور بھی اکڑ گیا۔ وہ منت و زاری کر رہی تھی اور میں چپ سادھے پڑا تھا۔ جب
بار بار اس نے ہر سوال کا جواب دینے کا اقرار کیا تو میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

غم اس کے رُوئے زیبا پر اس طرح چھایا تھا جس طرح چاند پر بادل کا ایک آوارہ
ٹکڑا۔ فاتحانہ مسکراہٹ میرے لبوں پر تھی۔ وہ مضمحل اور افسردہ ہو کر پلنگ پر جا
بیٹھی، اس کے ہاتھ کی لگائی ہوئی کیاریوں پر اوس کے قطرے اس طرح ڈھلک
رہے تھے جیسے مغموم دوشیزہ کے رُخسار پر آنسو۔

مَیں نے کچھ تامل کے بعد پھر وہی قصہ چھیڑا کہ اے راحتِ جاں خان دوراں
کا نام اور مقام سُن کر تو کس لئے غمناک ہو گئی۔ وہ متانت سے بولی۔ اے خوش بخت
دل کی بعض کیفیتیں زبان بیان نہیں کر سکتی۔ کل رات سے ایک غم میرے دل کو
کھا رہا تھا جسے صرف آنسوؤں کی زبان ہی بیان کر سکتی تھی۔ اور آپ کو اصرار کہ
اُسے میری زبان سے سنیں۔ مَیں تعمیلِ ارشاد تو کیا چاہتی تھی مگر مناسب الفاظ نہ پا
کر اظہارِ حال سے معذور تھی۔ ہاں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ یہ کیفیت کل کے ایک خواب سے
پیدا ہوئی ہے۔ تب سے اب تک طبیعت میں اک بیقراری سی ہے۔ سنو وہ کیا خواب ہے:۔

" شوالک کی چوٹی پر گلزار کھلا ہے۔ پھول کھلکھلا رہے ہیں۔ کلیاں مسکرا رہی

ہیں۔ نرگس اُن کی بہار دیکھ کر ہمہ تن چشم بنی ہوئی ہے۔ چند دوشیزہ لڑکیاں آئیں۔ اپنی اپنی پسند کے مطابق ایک ایک پھول توڑ کر لے چلیں۔ مجھے بھی ایک گُل کی رعنائی بہت بھائی۔ میں نے اُسے شاخ سے توڑ کر سُونگھا اور آنکھوں سے لگایا، اور ان لڑکیوں کے ساتھ ہولی۔ سب نے اپنا اپنا پھول دامن میں چھپا لیا مگر میں اپنے پھول کو ہاتھ میں لئے لُطف اندوز ہو رہی تھی۔ یکایک سامنے سے چند شوخ وشنگ نازفروش عورتیں آتی دکھائی دیں۔ اُنہوں نے کوشش کی کہ سب کے پھول چھین لیں۔ کسی نے زور اور کسی نے زاری سے اپنے پھولوں کو بچایا فقط ایک میرے کام نہ زاری آئی نہ زور آیا۔

"میرا پھول میرے ہاتھ میں تھا۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر چھین لیا۔ آہ اگر میں جانتی تو اپنے پھول کو چھپائے رکھتی۔ میں چلاّتی رہی کہ یہ پھول میرا ہے لیکن اس نے سُونگھا اور کہا کہ نہیں اب یہ میرا ہے! میں رونے لگی وہ ہنس دی۔ باقی دوشیزہ لڑکیاں اپنے پھولوں کو سینے سے لگائے جلد جلد قدم اُٹھا کر چلی جا رہی تھیں اور میں فرشِ گیاہ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ جس عورت نے میرا پھول چھینا تھا میں نے اُسے پھر لجاجت سے کہا کہ خدارا میرا پھول مجھے دے دو۔ لیکن اُس نے پھول کو چٹکیوں سے مسل کر کہا کہ یہ لو۔ ساتھ والیاں بہت دُور نکل چکی تھیں۔ میں مایوس ہو کر اُٹھی اور روتی دھوتی ان سے جا ملی۔ اُنہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے کر چلنے سے انکار کر دیا کیونکہ میرا پھول پامال ہو چکا تھا۔"

اپنا خواب بیان کر کے وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر با چشم پُرنم بولی "اے میری زندگی کے پھول اس خواب کی تعبیر تو خدا ہی جانتا ہے مگر جب سے آنکھ کھلی

ہے۔ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہوں "۔

اس کی سُرمگیں آنکھوں سے آنسو اس طرح ٹپ ٹپ برسنے لگے جیسے ساون کی کالی گھٹاؤں سے بارش کے قطرے۔ اس سے پیشتر تو میں اُسے محبت کا کنول سمجھتا تھا اور اپنے آپ کو اس کنول کا شیدا بھونرا۔ لیکن آج یہ محسوس ہوا کہ میں گُل ہوں اور وہ بُلبل۔ اس احساس سے خوشی سینے میں نہ سمائی اور مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر آئی۔ جنسِ لطیف کا محبت آشنا دِل اتھاہ سمندر ہے اور مرد کی محبت ایک جوئے کم آب۔

اُسے وارفتۂ محبت پا کر مجھ میں آہستہ آہستہ سرد مہری پیدا ہونے لگی شکر گزاری سے گردن جھکانے اور آنکھوں پر بٹھانے کی بجائے میں اُسے آنکھیں دکھانے لگا۔ میری یہ طوطا چشمی دیکھ کر وہ نرگس کی طرح حیران ہو گئی۔ کہاں ابتدائے عشق کی وہ شوراشوری۔ کہاں یہ انتہا کی بے نمکی۔ وہ میری خدمت گزاری میں اپنی عظمت سمجھتی تھی مگر میں جگر دوز طعنوں سے اس کا سینہ چھلنی کر دیتا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ گھر مجھے کاٹ کھانے کو آتا اور میں دروازے کے اندر قدم رکھنے سے گھبراتا۔

گناہ

ایک دِن شام کو وہی کوزپُشت بوڑھا خان دوران مجھے بازار میں مِلا۔ ور گلے کا ہار ہو گیا کہ "آج ضرور میرے گھر کی رونق بڑھاؤ۔ اور ماحضر تناول فرماؤ" مَیں نے ہزار عذر کیے۔ لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔ طوعاً و کرہاً اس کے ساتھ ہو لیا۔ بازار اور گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک شاندار عمارت کے قریب پہنچے بجلی کے روشن قمقموں نے رات کو دن بنا رکھا تھا۔ مکان کے گرداگرد ایک خوشنما باغیچہ

تھا۔ صدر ڈیوڑھی میں قدم دھرتے ہی میں اس خیال سے رُکا مُبادا اندر کوئی پردہ نشین ہو۔ بوڑھا کچھ مسکرایا اور بولا کہ "یہی راحت منزل ہے جس میں میں اور میری بیٹی عشرت جہاں رہتے ہیں۔ عشرت جہاں پردہ کی پابند نہیں"۔ میں آگے بڑھا۔ غلام گردش میں متعدد خادم ملے جن میں کچھ عورتیں بھی تھیں۔ کمسن اور خوبصورت۔ ان سب پر ایک اچٹتی نظر ڈالتا ہوا میں ایک نہایت آراستہ کمرے میں داخل ہوا۔ دیواروں پر ایسی تصویریں آویزاں تھیں جن کا جسم منت کش لباس نہ تھا۔ حسن برہنہ کی ایسی فیاضانہ نمائش سے حیا گریزاں تھی۔ انہیں دیکھ کر میرے جذبات میں تلاطم برپا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خادمہ نے عشرت جہاں کی آمد کی اطلاع دی۔ خان دوراں دروازہ کی طرف بڑھا۔ میں صوفے سے اٹھا۔ ایک زہرہ تمثال کمرے میں داخل ہوئی۔ خان نے تعارف کرایا۔ وہ اٹھلاتی اور مسکراتی ہوئی دوسرے صوفے پر جا بیٹھی۔ مصفا چہرے پر بکھرے ہوئے سیاہ بال مطلع تاباں پر کالی گھٹا کا سماں باندھ رہے تھے۔ چھلکتے ہوئے پیمانے سے ملتی جلتی آنکھیں سرور کی شراب برسا رہی تھیں۔ اس نے ایک انگڑائی لی۔ سینے پر آبِ رواں کا ہلکا سا دوپٹہ لہریں لے رہا تھا۔ جس سے دریائے حسن کے حباب صاف نظر آنے لگے۔ عشرت جہاں کیا تھی؟ مصورِ قدرت کا ایک شاہکار! وہ باتوں سے پھول برساتی اور مسکرا کر بجلیاں گراتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھی اور الماری میں سے اپنے ہاتھ کی بنائی ایک تصویر اُٹھا لائی۔ اس میں ایک بُلبلِ شیدا کو شاخِ گُل پر بیٹھے ہوئے دکھایا تھا۔ جس کی نظریں پھول پر جمی ہوئی تھیں۔ خان دوراں نے تصویر پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ اور کہا کہ ماشاءاللہ

خوب ہے۔ پھر تصویر میری طرف بڑھائی۔ میں فنِ تصویر کشی میں چنداں ماہر نہیں۔ اپنی اس کم علمی کو چھپانے کے لئے مُنہ سے تو کچھ نہ بولا۔ صرف سر ہلا کر داد دی۔ اور موضوعِ گفتگو بدلنے کے لئے مکان کی تعریف شروع کر دی۔ مَیں تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا رہا۔ لیکن وہ عشق کی گھاتوں میں مصروف تھی۔ اس کی ہر نگاہِ غلط انداز میں ایک دعوت پنہاں تھی۔ آخر دسترخوان پر کھانا چنا گیا۔ میں تو دل و جگر کو کباب بنا رہا تھا اور نظروں کے تیر کھا رہا تھا۔ اور خان دَوراں مجھے کم خوری کا مجرم ٹھہرا رہا تھا۔ انہیں گِلوں شِکووں میں ہم دسترخوان سے اُٹھے۔ میں نے عقل و ہوش سے ہاتھ اُٹھایا۔ باہم مقابل بیٹھے۔ اَب عشرت جہاں کی طبعِ رسا نے میرے تفننِ طبع کا اور سامان کیا۔ بربط اُٹھایا۔ اُنگلی میں مضراب پہنی۔ تاروں کو زبان ملی۔ حُسنِ یوسف کو لحنِ داؤدی عطا ہُوا۔ در و دیوار پر وجد طاری ہوا اور فضا میں ایک سُرور سا چھا گیا۔

پھر ناز و نیاز کا سلسلہ شروع ہُوا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد معاملہ بگڑ گیا۔ حسن نے کمانِ ابرو سے مژگان کے تیر برسانے شروع کئے۔ میں اِک آہِ بے اثر لے کر سینہ سپر ہُوا۔ مگر ایک ہی وار میں سینہ چھلنی ہو گیا۔ میں نے ایک آہ کی اور اُٹھا۔ بدحواسی میں رخصت مانگی۔ خان دوران بولا۔ پھر کب آؤ گے۔ جواب دیا کہ جب بُلاؤ گے۔ زبان "خان" سے مصروفِ مکالمہ۔ مگر آنکھ "عشرت" سے جویائے جواب تھی۔ عشرت جہاں نے سبقت کر کے کہا۔ "یہ وضع داریاں تکلّف ہیں اور تکلّف منافضِ محبّت، آج رُخصت لے کر جاتے ہو تو کل بن بلائے آؤ"۔ مَیں نے تسلیم کے لئے سر جھکا کر تعمیلِ حکم کا وعدہ کیا۔ خان دَوران سے رخصت

لی ۔اور عشرت جہاں کی طرف الوداع کہہ کر ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ اور بے تکلف ساتھ ہوئی۔ ہم دروازہ سے اُتر کر باغیچہ میں پہنچے۔ ہوا عنبر بیز تھی۔ اور شب کی تاریکی حوصلہ خیز۔ میں نے ہاتھ دبایا، اس نے سسکی لی۔ وہ میرے قریب، میں اُس کے نزدیک ہُوا۔ دونوں کے آغوش کھُل گئے۔ رازِ محبت ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوگیا۔ پتوں کی ہلکی سی سرسراہٹ سے میں چونکا۔ اس سے الگ ہوگیا۔ وہ نیچی نظریں کر کے بکھرے بال سنوارنے لگی۔ میری سراسیمگی کو دیکھ کر اُس نے معشوقانہ شوخی سے قہقہہ لگایا۔ پھر آگے بڑھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر الوداع کہی۔ اور چل دیا۔

آج کی سرگزشت سے دِل باغ باغ تھا۔ مگر گھر پہنچا تو بیوی کو مغموم پایا۔ میں ابتدائے عشق میں برہمیٔ مزاج کا یہ عالم دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا۔ نہ میں نے کچھ پُوچھا، نہ اس نے کچھ کہا۔ میں نے پیٹا۔ وہ پٹی۔ اِدھر میں مار پیٹ کر سوگیا۔ اُدھر وہ پٹ پٹا کر پڑ رہی۔ صبح کو آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ بے گناہ بیوی اپنی نازک اُنگلیوں سے میرے بالوں کو شانہ کر رہی ہے۔ اس ادائے معصومانہ سے مراد یہ تھی کہ وہ ناکردہ گناہ ہر اُس حرکت سے تائب ہے جو میری کدورتِ قلب کا باعث ہوئی۔

گھروں کے ہزاروں خوفناک جھگڑے نیک سرشت بیویاں ایسے ہی انداز و لجوئی سے مٹا دیتی ہیں۔ میرا دِل پگھل کر پانی ہوگیا۔ ندامت آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ شبنم کے آنسو مُرجھائے ہوئے باغوں کو کھلا دیتے ہیں۔ میں خجالت سے رو دیا۔ وہ اطمینان سے مسکرائی۔ مجھے گدگدایا اور اُٹھایا۔ رات کی سرگزشت رفت گزشت ہوگئی۔ وہ کھانے پکانے میں مصروف اور میں کچہری جانے کی تیاری میں

مشغول ہوگیا۔ جب عدالت جانے کے ارادے سے نکلا تو محنت کی راہ دُور اور دشوار دکھائی دی۔ ہاں محبت کی منزل قریب اور دلکش نظر آئی۔ چنانچہ میں قدم قدم پر رُکا اور دمبدم ارادہ بدلا۔ کدھر جاؤں؟ کچہری کی طرف یا منزلِ محبوب کی سمت۔ چوک میں پہنچ کر قوتِ فیصلہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مجبور ہو کر گذرگاہ سے الگ ایک باغیچہ میں بیٹھ گیا۔ تخیل نے درختوں کی سبز جھالر میں سے جھانک کر دیکھا تو منزلِ محبوب کا نظر فریب منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ بجلی کے قمقموں کی تیز روشنی سے باریک ریشم کے اندر عشرت جہاں کا خوبصورت جسم جھلک رہا تھا۔ ساقئے بزم افروز کی مے گوں آنکھیں نوازش ہائے پیہم میں مصروف تھیں۔ انگلیاں اسی طرح ساز پر رقص میں مصروف اور شیریں نغموں سے گردوپیش کی ساری فضا معمور۔ خدا جانے میں کب تک اس بہشتِ خیالی میں طرب ونشاط کے مزے لوٹتا رہتا۔ ناگاہ ایک خوبصورت تیتری حُسن کے بازو پھیلائے روشنی میں کھیلتی نظر آئی۔ پل بھر میں وہ جنت نگاہ اور فردوسِ گوش منظر مٹ گیا۔ اور زریں پروں والی کھلنڈری، تھوڑی دیر دل بہلانے کے بعد درختوں کے سبز پتوں میں اوجھل ہوگئی۔

میں نے چاہا کہ پھر عشرت جہاں کے تصور کی تجلیات سے دِل کو نُورانی کروں لیکن خیال آیا کہ کب تک فرشِ خاک پر بیٹھا عالمِ افلاک کی سیر کرتا رہوں گا کچہری جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ میں گھبرا کر اُٹھا۔ بے اختیار دفتر کی طرف بڑھا۔ تخیل کی فسوں سازی کا کیا کہوں کہ کتنی بار کرسیِ عدالت پر بیٹھے بیٹھے وہ خلد نما منظر آنکھوں کے سامنے آیا اور گیا۔ اور کتنی دفعہ وہ گھنگھریالے بالوں اور

گلابی گالوں والا محبوب دکھائی دیا اور روپوش ہوا۔ میرا منشی مجھے عالمِ محویت میں پا کر حیران تھا۔ آخر بولا۔ آج آپ کی طبیعت پریشان ہے۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ کہ ہاں یونہی سی سرگرانی ہے۔ وقتِ معینہ تک بادلِ ناخواستہ میں کچہری میں کام کرتا رہا پھر اُٹھ کر گھر آیا۔ بیوی نے بلائیں لیں۔ بوٹ اُتارے۔ کپڑوں کو برش کرنے لگی۔ میں کسل اُتارنے کے لئے کوچ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے ایک منقش ڈبیہ لا کر دی کہ کسی نے شاید سوغات بھیجی ہے۔ کھولی تو مخمل کے ٹکڑے میں تھوڑا سا پارہ تھا اور بس۔ اور وہ خفیف سی جنبش سے لرزش میں آ جاتا تھا میں اس پیامِ محبت کو سمجھ گیا۔ اور عشرت جہاں کے ذہنِ رسا کی داد دینے لگا۔ اس شکل پر یہ عقل، کون قربان نہ ہو جائے۔ کیسی شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ یہ تحفہ بھیجنے سے اس سیم تن کا یہ مقصد تھا کہ تیرے انتظار میں میرا مخمل سا نرم دل سیماب سے زیادہ مضطرب اور بیقرار ہے۔ افشائے راز کے خوف سے ڈبیا کو جیب میں ڈال لیا۔

اب وفا کیش بیوی اور اس جذبات میں ہلچل ڈالنے والی عورت کے درمیان فیصلہ تھا۔ صبح کے وہ آنسو جو ندامت سے بہے تھے عشق کی آگ کو جو اس شام بھڑکی بجھا نہ سکے میں محبت کی بہتی گنگا کو چھوڑ کر جوالا مکھی کے درشن کو چل نکلا۔ عشرت منزل میں پہنچا تو وہ اس اشتیاق سے ملی جیسے مدت کا بچھڑا اتفاقیہ آ ملتا ہے۔ پھر بے تکلفی سے پوچھا کہ چائے پیجئے گا۔ میں نے کہا میں تو چاہ کا بھوکا ہوں وہ بات پا کر محظوظ ہوئی۔ باورچی خانہ کو بھاگی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آئی۔ قالین کے ایک اُبھرے ہوئے کنارے میں پاؤں اُلجھا اور گر پڑی۔ اِک نگاہِ ناز

سے میری طرف دیکھا اور امداد کے لئے ہاتھ پھیلایا۔ میں نے لپک کر اس بارِ عزیز کو اُٹھایا۔ اور قالین کے کنارے کو درست کیا تاکہ پھر اس "حادثۂ جانفزا" کے وقوع کا احتمال نہ رہے۔ چوٹ لگنے کا کس کافر کو یقین تھا۔ تاہم دستِ شوق ڈرتے ڈرتے اس کے پاؤں پر پڑے۔ اور پھر شوخی سے بڑھتے بڑھتے پنڈلی تک پہنچے۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز نے چلمن کے پیچھے سے پکارا کہ "چائے حاضر ہے"۔

چائے پی کر فارغ ہوئے تو عشرت جہاں بولی کہ اگر چاہ ہے تو نباہ کی فکر کرو۔ دفعتہً مجھے اپنی عافیت کا خیال گزرا۔ غیر کا گھر اور محبت کے یہ عہد و پیمان۔ دیوار سنتی ہے اور تصویر دیکھتی ہے۔ وہ میرے سکوت کا منشا سمجھ کر بولی۔ کہ یہ خانہ بے تکلف ہے اور میں آپ کی ادنیٰ کنیز۔ کسی کی موجودگی میری خوشیوں میں حارج نہیں ہو سکتی اور نہ میری آزادیاں کسی پابندی کی متحمل ہیں میں نے کہا کہ آغازِ شباب میں بزرگوں کی نگرانی سے خوردوں کی روگردانی آدابِ معاشرت کے قرین نہیں۔ جواب ملا کہ اوّل تو آدابِ معاشرت کے مشرقی قانون روشنی کے اس زمانہ میں درخورِ اعتنا نہیں۔ بغرضِ بحث اگر آپ کے مفروضہ کو درست مان لیا جائے تو میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ قبلہ بزرگوار آزادیِ رائے اور آزادیِ عمل کے اَن تھک مفسّر ہیں ان کے نزدیک سوسائٹی کے قوانین کے خلاف افراد کی بغاوت ترقی کی دلیل ہے میں نے مجبور ہو کر کہا۔ آپ آزاد سہی مگر میں پابند ہوں۔ خوبرو اور نیک خو بیوی میری تغافل شعاریوں پر صبر اور میری خطا کاریوں پر چشم پوشی کرتی ہے کس جُرم پر اس کو چھوڑوں۔ کس طرح دوسرے رشتۂ الفت جوڑوں۔ اُس نے میری محبت

کو مسکرا مسکرا کر بیدار کرنے کی ناکام کوشش کی ۔ پھر التجا بھری نگاہ سے رحم کی
درخواست کی ۔ وقت کی بات ہوتی ہے کہیں ٹس سے مس نہ ہُوا ۔

اس نے میری طرف دیکھا ۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائی ۔ سُرخ سُرخ
ڈورے نرگسی آنکھوں میں نمایاں ہوئے ۔ آج مجھے حسین عورت کے آنسوؤں کا
اثر معلوم ہُوا جو کام دیو کے تیروں میں سب سے زیادہ بیخطا ہیں ۔

"اے حسین عورت کی آنکھوں کے آنسوؤ ۔ تم سحرِ سامری سے زیادہ پُراثر ہو ۔
وہ بہادر جو سیلِ حوادث سے مُنہ نہیں موڑتے تمہارے بہاؤ میں بےکس تنکے کی
طرح بہتے نظر آتے ہیں ۔ تمہارے سکون میں طوفان ہے ۔ خاموشیوں میں ہنگامے ہیں ۔
ظاہر تم بےحقیقت سے نظر آتے ہو مگر دُنیا کے ہزاروں انقلاب تمہارے
شرمندۂ احسان ہیں ۔ ہر قاعدہ کی استثناء ہے ۔ ہر درد کی دوا ہے مگر تمہارے
وار کا کوئی توڑ نہیں ۔ سب حربے جواب دے جاتے ہیں لیکن اے حسین عورت کے
آنسوؤ تمہیں وہ ہتھیار ہو جن کا وار کبھی اوچھا نہیں پڑتا ۔ رُوٹھوں کو منانے کے
لئے بگڑوں کو بنانے کے لئے جہاں عقل تدبیر سے عاجز آ جائے تو تم ہی کام آتے
ہو ۔ تاریخِ عالم کا وہ پہلا حادثہ جسے ہبوطِ آدم سے تعبیر کیا جاتا ہے اے حوّا کی
بیٹی صرف تجھ ہی کو معلوم ہے کہ کیوں وقوع پذیر ہُوا ۔ قدسیوں کا معلّم جب آدم
کو بہلانے میں تمام ترغیب و تحریص ضائع کر چکا تو آدم کو خدا کی نافرمانی پر آمادہ
کرنے والی حسین حوّا کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سوا اور کیا چیز تھی ؟"

ہاں اس نے مجھے غمناک آنکھوں سے دیکھا اور میں مسحور ہو گیا ۔ مجھے
مشتعل کرنے کے تمام سامان کیئے گئے تھے ۔ تاکہ میرے لئے کوئی راہِ گریز

نذر ہے۔ تمام وہ سنگار جو حُسن میں کشش پیدا کرتے ہیں۔ وہ زیورات جو خوبصورتی میں افزائش کا باعث ہوتے ہیں۔ عطر جو جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ ایمان کی غارت گری میں مصروف تھے۔ خوشی کے برق رفتار لمحے گزر رہے تھے۔ رات ہوگئی۔ کھانا کھایا۔ اس مستِ شباب نے ساز کے تاروں کو چھیڑا۔ برقی قمقمے کی روپہلی شعاعیں اس کے خوبصورت بربط پر تڑپ رہی تھیں۔ نغمے بیتاب ہوکر نکل رہے تھے۔ وہ گاتی تھی اور مسکراتی تھی مسکراتی تھی اور گاتی تھی۔ اس سامانِ طرب پر دورِ شراب کا اضافہ ہُوا۔ پہلے تو میں نے دُخترِ رز کو مُنہ لگانے سے انکار کیا۔ لیکن جب دستِ سیمیں گلے میں حمائل ہوئے تو میں مان گیا۔ چند گھونٹ حلق سے اُترے ہی تھے کہ میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اس کی صحبتِ نیم شبی کی داستان ایسی شوخ اور عریاں ہے کہ صفحۂ قرطاس اس کی تحریر سے محجوب و شرمسار ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں، کہ آفتاب جب لیلائے شب کے آغوش سے علیحدہ ہُوا، تو میں نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو کھول کر دیکھا عشرت جہاں سامنے کھڑی تھی۔ اس کی شرمائی ہوئی آنکھیں شب کی بے حجابیوں کی خبر دے رہی تھیں۔ اور بکھرے ہوئے بال میری دست درازیوں کے شکوہ سنج تھے۔

ضمیر کی ملامت

گناہ کے ابتدائی مشاغل اکثر دلفریب ہوتے ہیں۔ مگر انتہائی مراحل دل شکن ہوا کرتے ہیں۔ دو روز قبل میں شادان و فرحاں گھر گیا تھا۔ آج متأسف

اور پریشان ہو کر لوٹا۔ رفیقۂ حیات نے میری طرف متجسسانہ دیکھا۔
میری حالت ایسے مجرم کی سی ہوگئی جو موقعِ واردات پر پکڑا گیا ہو۔ متاہل زندگی میں غیر کے گھر شب باشی کس کس طوفان کا باعث نہیں بنتی مگر عالی ظرف اہلیہ نے خطا کار خاوند کی غلطی پر چشم پوشی کی۔ بازپرس کے لئے زبان بھی نہ ہلائی۔ آج سارا دن بیوی کی وفا شعاری میری عشرت پسندی پر غالب رہی مگر غروبِ آفتاب سے طبیعت بگڑی۔ اِدھر اس کی آنکھ لگی۔ اُدھر میں کھسکا اور آغوشِ عشرت میں جا کر دم لیا۔
حیا معصیت پسند انسان کے پاس ایک دو دفعہ ناصحِ مشفق بن کر آتی ہے۔ طریقے طریقے سے سمجھاتی ہے۔ اگر نہ مانے تو اس کی کوتاہ اندیشی پر آنسو بہاتی ہوئی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ عشرت جہاں سے ایسی راہ و رسم بڑھی کہ شرم و حیا اُٹھ گئی۔ موسم کی مناسبت کو مدِنظر رکھ کر لباس بنوا لانا میری خوشی کا جزو تھا۔ آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی فرمائشیں ہونے لگیں جنہیں میں خوشی خوشی پورا کرتا رہا۔ پھر بڑے بڑے مطالبے پیش ہوئے۔ مگر حُسنِ طلب کی داد دیتا ہوں کہ اس کی کوئی بات گراں نہ گزری۔ پہلے پان پھر پاندان، عطر کے بعد عطردان مانگا گیا، کون سی بڑی فرمائش تھی، وہ بھی لا دیا گیا۔ ایک دن بولی کہ میری سہیلی کی ناک میں مچھلی کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ عرض کیا کہ بنوا دینگے۔ پھر کہا کہ پڑوسن کے کنگن کی گھڑت کچھ اور ہی طرح کی ہے۔ میں نے کہا ویسی ہی لا دینگے۔ ایک دن میں اس کے حُسنِ گلوسوز کی تعریف کر رہا تھا کہ تیرا مکھڑا چاند کا ٹکڑا ہے کہا۔ یہ مکھڑا جھومر کا محتاج ہے۔ جواب دیا کہ یہ احتیاج بھی باقی نہ رہیگی۔ آہستہ

آہستہ میں نے گھر جانا چھوڑا اور وہیں کا ہو رہا۔ میں نے کہا کہ تنخواہ تم ہی رکھا کرو۔ وہ ہنس کر بولی کہ حساب تو نہ مانگو گے میں نے کہا کہ قیامت کے دن۔

اگرچہ ہم بہت گھل مل گئے تھے مگر جام محبت کو دو آتشہ کرنے کے لئے کبھی یونہی بگڑ بیٹھتے تھے۔ خان دوراں ثالث بالخیر بن کر آتا تھا۔ اسے سمجھاتا اور مجھے مناتا تھا۔ غرض زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔ مگر تا بکجے، وہ فضول خرچ میں لاپروا۔ برسوں کی کمائی مہینوں میں اڑائی۔ آپ جانتے ہیں کہ بجُز کے میخوار کے منہ دختِ رز نہیں لگتی۔ نہ بے زر عاشق کو کوئی منہ لگاتا ہے۔ اب سب خوشیاں ایک ایک کرکے ترکِ موالات کرنے لگیں۔ کچھ روز قرض لے کر وقت پورا کیا۔ مگر پریشانیوں نے چھاؤنی ڈالی۔ تفکرات نے ہجوم کیا۔ معلوم ہوا کہ مقروض و مہجور ایک ہی منزلِ مصیبت کے دو مختلف مسافر ہیں۔ جو تر ددات کا پشتارہ سر پر اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔

غرض جاڑا جوں توں کرکے کٹا۔ بہار آئی۔ یہ وہ موسم ہے جب جنت اپنی دلفریبیاں دنیا کو مستعار دے دیتی ہے۔ مگر قرض کی پریشانی اور تنگدستی نے موسمی تغیرات سے شادماں ہونے کا احساسِ لطیف مجھ سے چھین لیا۔

جب میں قرضخواہوں کے تقاضے پورے نہ کر سکا تو تنخواہ کی ضبطی عمل میں آئی۔ اور فاقہ کشی تک نوبت پہنچی۔ ایک دن میں بیٹھا رمضان المبارک کی برکتوں کا باب پڑھ رہا تھا کہ خان دوراں میرے پاس آیا۔ مجھے پریشان پاکر سنر ددہؤا۔ میں نے اپنی تنگ دستی کا حال عشرت جہاں کے باپ کو کبھی نہ بتایا تھا۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید میرا بھرم کھل گیا۔ تاہم خان دوران نے نہایت ہمدردانہ

طریقت سے واقف [illegible]ال کیا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اُسے سب کچھ کہہ ڈالوں۔

جب اُس نے حدیثِ فاقہ سُنی تو مسکرا دیا اور کہا کہ تم حاکمِ وقت ہو۔ لیکن تمہیں خزانوں کی خبر نہیں۔ غور کرو گے تو دفتر کی مسلوں میں سونا بکھرا پاؤ گے۔ ضرورت مند عقلا کے اشارے کو سمجھ جاتا ہے۔ میں جان گیا کہ اخلاق سوزیوں کے بعد ضمیر فروشیوں کی راہیں دکھائی جا رہی ہیں۔ اب رشوت ستانی کے سوا جس سے میرا دامن اب تک پاک تھا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ نئی راہ میں قدم رکھنا ہر چند تردّدات سے خالی نہیں۔ مگر مجبوری نے مشکلیں آسان کر دیں۔ منشی کو معاملہ سمجھا دیا۔ وہ تو اشارے کا منتظر تھا۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک پیدا ہو گئی۔ اور خوشی سے بولا کہ غریب نواز دُنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں۔ پہلے تو میں ڈر ڈر کر بچوں کا پیٹ پالنے کا سامان کر لیا کرتا تھا۔ اب صاف کہہ دیا کروں گا کہ انصاف کا چھکڑا عدالتی دلدل میں پھنسا ہے۔ سُرخ بیلوں کے بغیر اس کا نکلنا محال ہے۔

ایک دن قتل کا ایک ملزم میری عدالت کے سپرد ہوا۔ ملزم کی صورت فقیرانہ تھی لیکن اس کے حرکات و سکنات شریفانہ تھے۔ چہرے پر سفاکی کی علامتیں نہ تھیں بلکہ وقار و تمکنت ٹپکتی تھی۔ آنکھوں میں مجرمانہ چمک کی بجائے معصومانہ دلفریبی پائی جاتی تھی۔ جب کبھی وہ نظر اُٹھاتا تو اثر کی ایک لہر ہر طرف دَوڑ جاتی تھی۔ اُن کے خلاف عینی شاہد پیش ہوئے۔ تاہم میرا دل اس کی

لگانے سے پرہیز کیا۔ اور مزید غور و فکر کے لئے سماعتِ مقدمہ دُوسرے دن پر ملتوی کر دی۔

آج جب عدالت سے فارغ ہو کر آیا تو خدا جانے کیوں جی بے ساختہ گھر جانے کو چاہا۔ اگرچہ عشرت جہاں کی بہارِ حسن میرے دماغ کو ہر وقت رشکِ فردوس بنائے رکھتی تھی تاہم گاہے ماہے اس پاک دامن رفیقۂ حیات کی وفا شعاریوں کا خیال بھی آ جاتا تھا۔ مدت کے بعد میں نے گھر کا رُخ کیا۔ جھجک جھجک کر قدم اندر رکھا۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑا۔ پھُولوں سے لدی کیاریاں، سدا بہار پودے سب خشک ہو چکے تھے۔ دروازوں کے خوبصورت پردے، خوشنما تصویریں اُتری ہوئی تھیں۔ قدِ آدم آئینوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ قالین لپیٹ کر کونوں میں رکھے تھے۔ رفیقۂ حیات مغموم و ناشاد باورچی خانے میں زانو پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ آہٹ پا کر چونکی۔ نظر اُٹھا کر دیکھا۔ چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ مگر جلد ہی پھُول کی طرح مُرجھا گیا۔ ہنگامی ملاقات کی خوشیوں کو فراق کے اندیشہ نے مٹا دیا۔ اسے یقین تھا کہ میرا یہاں آنا رمتے جوگی کا آنا ہے کیونکہ کسی اور ہی جگہ ہے۔ میں نے خالی گملوں، مُرجھائی ہوئی کیاریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس موسمِ بہار میں یہ عالمِ خزاں؟ اُس نے گردن نیچی کر کے کہا کہ ہاں جب میری مسرتوں کا کنول ہی کملا گیا تو آبیاری کا ہوش اور گلشن کی بربادی کا افسوس کیا ہو۔ پوچھا کہ تصاویر، آئینے اور دوسرے سامانِ آرائش کا یہ کیا حال ہے؟ کہا کہ جب آپ نے رُونمائی کی قسم کھا لی تو سامانِ خود نمائی کی مجھے حاجت کیا۔ یہ جواب باصواب پا کر بجائے قائل ہونے کے میں اُسے

آنکھیں دکھانے لگا۔ میں نے غصہ میں آکر ہاتھ اُٹھایا۔ اُس نے عاجزی سے ہاتھ باندھے۔ خشم کے مقابلے میں حلم نے فتح پائی۔ میں کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے بڑبڑاتا باہر نکلا ہی چاہتا تھا کہ وہ نیک بیوی میرا دامن پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی اور بولی کہ ٹھیرو ایک بات تو سُن جاؤ۔ وہ وقت یاد ہے کہ تمہیں ایک خواب کی دریافت پر اصرار تھا اور مجھے انکار۔ آج بن پوچھے عرض کئے دیتی ہوں مسلسل تین روز سے ایک ہی خواب دیکھ رہی ہوں کہ جہنّم کے چھوٹے بڑے شیطان آگ سے سُرخ لوہے کی زنجیریں لئے تمہاری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ بار بار مجھ سے تمہارا پتہ پوچھتے ہیں۔ خدارا بتاؤ کس صحبت میں تمہاری زندگی بسر ہوتی ہے اور تم نے مجھے کیوں بھلا رکھا ہے۔

مجھے یہ باتیں ناگوار گزریں۔ میں نے غصے سے دامن جھٹکا اور چل دیا۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی۔

جب میں کعبۂ مقصود یعنی منزلِ محبوب کے قریب پہنچا تو شام ہونے والی تھی۔ سورج دامنِ اُفق میں جلدی جلدی مُنہ چھپا رہا تھا۔ میں عشرت منزل میں داخل ہونے کو تھا کہ کسی نے آواز دی۔ مُڑ کر دیکھا تو علاقہ کا ایک بڑا رئیس میرے منشی کے ساتھ ساتھ جلد جلد آتا دکھائی دیا۔ میں ٹھہر گیا جب نزدیک آیا۔ تو میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے ہاتھ ملانے کی بجائے تعظیم سے سر جھکایا۔ اس کا متردد چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ یہ سلام روستائی ہے منشی کی طرف نظر اٹھائی۔ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بتایا کہ یہ موٹی مُرغی حاضر ہے۔ چنانچہ میں نے رئیس کو عزت سے بٹھا کر محبت سے پوچھا کہ

تشریف آوری کا کیا باعث ہے۔ وہ جھجک جھجک کر بولا کہ صاحب میں آپ کے
پاس ایک غرض کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ وہ ملزم جو آج حضور کے سامنے پیش ہوا،
میرا بھتیجا ہے، لیکن میرے لہو کا پیاسا اور جان کا دشمن ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس
کی رہائی میری موت کا باعث ہو گی۔ یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ نوٹوں کا ایک
بڑا بنڈل نکالا اور مرتعش ہاتھوں سے پیش کیا۔ راشی افسر کے سامنے نوٹوں کے
بنڈل سے زیادہ موثر سفارش اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے پوپلا سا منہ بنا کر نوٹوں
کو اٹھایا اور اس ڈاکٹر کی طرح جو نہایت بے تابی کے ساتھ مریض کے لواحقین سے
فیس وصول کر کے مفت کا احسان رکھنا چاہتا ہے۔ کہا "صاحب اس تکلیف کی
کیا ضرورت تھی۔ گھر کا ہی معاملہ ہے۔" رئیس بولا کہ بیس ہزار کی حقیر رقم آپ کے
لئے ناچیز تحفہ ہے۔ بیس ہزار کی رقم سن کر میں چونکا۔ دل خوشی سے اچھلا، پھر یہ سوچ
کر کہ اس موٹی اسامی سے یہ چھوٹی رقم یونہی قبول نہ کرنی چاہیئے، بولا کہ حق الخدمت
دینے کا خیال ہے تو دل کھول کر خرچ کیجئے۔ ورنہ معاملہ کو انصاف پر چھوڑ دیجئے۔
بالآخر بڑی حیل و حجت اور ردّ و کد کے بعد ڈیڑھ لاکھ پر فیصلہ ہوا۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔
میں بھی خوش خوش عشرت جہاں کے پاس پہنچا۔ خیال نے عرش اور فرش کی
پیمائش کی۔ عیش و طرب کے ہزاروں نقشے ذہن میں پیدا ہوئے۔ میں بار بار اطمینان
کا سانس لیتا تھا۔ آخر خوشی کے تصورات میں ہی نیند آگئی۔ جب مہر تابندہ کی روشن
کرنیں بستر پر پڑیں تو میں اٹھا۔ خوشی خوشی کچہری گیا اور ملزم کو طلب کیا۔ جب
وہ سامنے آیا تو ندامت سے میری گردن جھک گئی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں
طلائی طلسم میں پھنس چکا تھا۔ میں نے ابروؤں پر شکن ڈال کر کہا کہ صفائی

کا کوئی گواہ۔ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا "خدا"۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا "معزز جج! دُنیا میں امتحان ہوتا ہے نتیجہ آخرت میں نکلتا ہے۔ یاد رکھ کہ جان بخشی اور جان ستانی تیری قلم کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ تیری سیاہی کے قطروں میں خون کے دریا ہیں۔ تیری جنبشِ قلم موت وحیات کا فیصلہ کرنے والی ہے اگر منصف اغراض سے آلودہ ہو کر جان ومال کے فیصلے کرے تو دوزخ اپنا آتش فشاں مُنہ کھول دیتا ہے۔ جنّت خوشی کے دروازے بند کر لیتی ہے۔ میں تجھے عاقبت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ بے سُود رعایت ضمیر سے مشورہ طلب کر۔ گردن زدنی سمجھتا ہے تو حاضر ہوں۔ ورنہ یاد رکھ کہ اس دُنیا سے مر کر میں تیرے سر پر بھوت کی طرح سوار رہوں گا خوشیاں تلخیوں میں بدل دوں گا"۔ میں نے سپاہیوں کو گھور کر دیکھا اور کہا کہ اسے اس وقت لے جاؤ اور چار بجے سے کچھ دیر پہلے فیصلہ سننے کے لئے لے آؤ۔

جب میں کچہری آیا تھا تو ہوا میں کامل سکون تھا۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ قلم نے جب ظلم پر کمر باندھی تو ہوا تیز ہوئی۔ خونی فیصلہ جب لکھا گیا تو سُرخ آندھی کا طُوفان اُٹھا۔ چار بجے کے قریب سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ نوجوان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہوا کے تُند جھونکے عمارت سے سر ٹکرانے لگے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت انتقام پر اُتر آئی ہے۔ میرا دل دہل گیا۔ سوچا کہ معصوم کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا عوض مجھے شاید آج ہی مل جائے گا۔ فیصلہ سُنا جا چکا تھا۔ تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ فیصلے پر نظر ثانی کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اتنے میں ایک بلا کا جھٹکا محسوس ہوا، زمین میں زلزلہ آیا۔ پرند درختوں سے اُڑے۔ کچہری کے سامنے پیپل کا ایک درخت تھا۔ وہ زمین پر آرہا۔ سب سہم کر رہ گئے۔ دل

چاہا پکار کر کہہ دوں کہ یہ نوجوان بے گناہ ہے۔ مگر خدا جانے کیوں رُک گیا۔ بارے زلزلہ تھما۔ جان میں جان آئی۔ آندھی تھمی۔ اوسان بجا ہوئے۔ اپنے فعل پر بہت کچھ پشیمانی تھی۔ رقم ملنے پر قدرے خوشی ہوئی۔ پشیمانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات لے کر میں گھر پہنچا۔ کبھی مجھے اس رئیس کی سنگدلی کا خیال آتا تھا جس نے اپنے بیگناہ بھتیجے پر پہلے قتل کا الزام لگوایا۔ پھر لاکھوں روپیہ خرچ کر کے پھانسی پر چڑھوایا تاکہ خاندان کی جائداد پر بے شرکتِ غیرے قابض رہے۔ کبھی مجھے میرا ضمیر ملامت کرتا تھا کہ میں نے دُنیا کی دولت کے لئے عاقبت کا عذاب مول لیا۔ مگر جوں جوں دیر ہوتی گئی ضمیر کی آواز بھی کمزور پڑتی گئی اور میں پرانے پاپی کی طرح رشوت ستانی اور انصاف فروشی میں اور بیباک ہوتا گیا۔

عشرت کے ہاں ڈیرے ڈالے دو برس ہو چکے تھے۔ بہاریں بھی لوٹیں۔ گرمی اور سردی بھی کاٹی۔ جب تیسری برسات کا روح افزا موسم شروع ہوا تو ایک دن جب کہ جنت کی ٹھنڈی ہوائیں چشمہ حیات سے جان پروری کا سامان لے کر آرہی تھیں۔ کالی گھٹائیں کوثر سے پیاس بجھا کر کسی مستِ شباب کی طرح جھومتی اٹھیں اور روئے عالم پر چھا گئیں۔ اس مستانہ موسم میں مور سرشار ہو کر ناچ رہے تھے۔ کوئل بیتاب ہو کر پکار رہی تھی۔ پھواروں کی بن آئی۔ ہوا گاتی تھی۔ شاخیں جھومتی تھیں۔ پتے تالیاں بجاتے تھے۔ عشرت موسم کی مناسبت سے دھانی جوڑا پہنے بنی ٹھنی تھی۔ وہ غرورِ حسن سے اٹھلاتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ قریب [illegible] کہا آؤ جھولا جھولیں۔ مکان کے شمال مغربی حصے میں پیپل کے ایک مضبوط تنے سے [illegible] ریشم کے موٹے موٹے ڈورے لٹک رہے تھے۔ دو نوخیز

خادمائیں جھولا جھلانے کے لئے ہمارے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ہم دونوں جھولے میں بیٹھ گئے، جھولا لحظہ بلحظہ بلند ہونے لگا۔ بلندی کی ہوائیں اُودی گھٹائیں یونہی طبیعت پر کیا غضب نہیں ڈھاتیں۔ لیکن جب عشرت جہاں جیسا محبوب بھی ہمکنار ہو تو کون ہے کہ اَنَا الْمَوْجُوْدُ لَاغَیْرِیْ کا دعوےٰ نہ کر بیٹھے۔

عین اس وقت جب کہ ہم بلند فضا میں تھے میں نے پستی کی طرف دیکھا دیوارِ چمن سے ملحق چند کچے مکان اور گھاس پھُوس کے چھپر دکھائی دیئے۔ کہنے کو تو وہ جھونپڑے تھے مگر صفائی کے لحاظ سے بنگلے معلوم ہوتے تھے۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں قطار در قطار سبق آموزی میں مصروف تھے۔ جب جھولا پھر بلندی پر پہنچا تو میں نے عشرت جہاں سے ملحقہ مکانوں کی بابت سوال کیا کہ یہ عمارت کیسی ہے؟ وہ لاپروائی سے بولی کہ یہاں ایک بھونڈی سی مُعلانی بچوں کے ساتھ مغز کھپائی کیا کرتی ہے۔ وہ ان جھونپڑوں میں بیٹھ کر محلوں کے خواب دیکھتی ہے۔ اور بچوں کو سبز باغ دکھاتی ہے۔ کسی کو کہتی ہے کہ تو ارسطوئے زمان ہوگا، کسی کے کان میں پھُونکتی ہے کہ تو سکندرِ ثانی بنے گا۔

انہی باتوں میں ہوا میں خنکی بڑھی۔ پھر پھوار پڑنے لگی۔ جھولا رُکتے رُکتے بارش شروع ہوگئی اور برآمدہ میں پہنچتے پہنچتے موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ عشرت جہاں کا ململ کا کُرتہ بھیگ کر جسم کے ساتھ چپک گیا۔ پلکوں پر بارش کے قطروں نے موتیوں کی لڑی پرو دی تھی۔ جب کائنات خوب نکھر چکی تو بارش تھمی میں کوہسار کی سیر کے بہانے سے عشرت منزل سے نکلا۔ اور ادھر مکتب کا رُخ کیا۔ دروازہ پر ایک بوڑھے سے چپڑاسی نے مجھے روکا۔ اور کہا کہ جب

تک اندر جانے کی اجازت طلب نہ کر لوں۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ میں وہیں رکا۔ وہ اندر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لوٹا۔ مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی ساتھ ہو لیا۔ مجھے ہیڈ معلمہ کے دفتر میں لے گیا۔ عشرت جہاں کے بیان کے بعد تصوّر نے مغلانی کی جو تصویر کھینچی تھی وہ اصل حقیقت سے بالکل دُور تھی، وہ تو ایک حُور تھی جو عرش سے اتر کر فرش پر آ بیٹھی تھی۔ گو وہ حُسن کی دولت سے مالامال تھی۔ تاہم تیکھے چتون اور بانکی ادائیں جو رنگیں مزاجوں کی وارفتگی کا سامان کرتی ہیں۔ بالکل اُس میں نہ تھیں۔ بیشک استانی پر حُسن کی فراوانی تھی۔ لیکن شوخیاں نسوانی حجاب میں اس طرح کھوئی ہوئی تھیں، جیسے ساکن سمندر میں موجیں۔ اس کے چہرہ پر روحانیت کا نُور جھلک رہا تھا اور بوالہوس سے بوالہوس نگاہ بھی احترام کے پھول چڑھانے پر مجبور تھی۔

ہمارے پاؤں کی آہٹ پا کر اُس نے آنکھوں کو آہستہ آہستہ اُٹھایا خوش آمدید کہہ کر خالی کُرسی کو میرے آگے بڑھایا۔ جُونہی میں بیٹھا اس نے نرم آواز میں کہا کہ آپ نے شاید پہلی ہی مرتبہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے مکتب کو سرفراز فرمایا ہے۔ میں اس کرمفرمائی کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اس کی آواز میں ایسا اثر تھا جو جذبات کو برانگیختہ کرنے کی بجائے روح خفتہ کو بیدار کرتا تھا میں نے دریافت کیا کہ مدرسہ کے اخراجات کا کفیل کون ہے۔ جواب مِلا کہ چند اہل کرم کے دامن کا سہارا ہے۔ میں نے مدرسہ کے معائنہ کی اجازت طلب کی۔ وہ میرے ساتھ ہو لی۔ مدرسہ میں عالم سکوت تھا۔ کوئی آواز کان میں نہ آتی تھی۔ کمروں میں

ایک جماعت سے گزر کر دوسری جماعت میں جا رہے تھے کہ یکایک چیخنے
کی آواز سُنی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ایک عورت ایک لڑکے اور لڑکی کو جو چلا رہے
ساتھ لئے ہماری طرف آ رہی ہے۔ بچوں کی دست درازی سے مال کے
تار تار اور مُنہ لہولہان ہو رہا تھا۔ استانی ٹھہر گئی اور میں بھی رُکا۔ عورت
نزدیک آ کر کہا "ذرا ان کو سنبھالو۔ میرے سر سے یہ عذاب ٹالو" پھر لڑکے کی
اشارہ کر کے بولی۔ دیکھو یہ ابھی کل کا بچہ ہے۔ مگر کُل محلہ اس کی حرکتوں سے
ہے۔ یہ ابھی سے چھوٹے بچوں کی ٹولیاں بناتا ہے۔ خود سرغنہ بن کر مردوں
چڑاتا ہے۔ عورتوں کو ستاتا ہے، راہگیروں کو پریشان کرتا ہے۔ استانی
متانت سے بولی۔ ان کے خرچ کا کفیل کون ہوگا؛ عورت بولی اُستانی جی،
سُہاگ لُٹے مدت گزری۔ اگر کوئی میرا نگران ہوتا تو ان بچوں کا یہ حال
اُستانی بولی۔ بی بی میں معذور ہوں، مقدرت ہوتی تو اعانت سے دریغ
اہلِ محلہ کے پاس جاؤ۔ انہیں امداد پر رضامند کرو۔ عورت نے کہا۔
بھلا کسی کو پرائی کیا پڑی۔ کون اپنا گنوا کے دوسروں کا سنوارے۔ تم
دِلوں کی بات کرتی ہو۔ اس جگ میں ایسا کون ہے جو یتیموں کو تعلیم دلا
اُستانی بولی۔ تم صبر کرو۔ قدرت بے پروا ہے رحم افراد و اقوام
لینے میں بڑی مستعد ہے۔ اگر اہلِ محلہ اس کے سر پر دستِ شفقت نہیں
عنقریب یہ سب کو چچا بنائے گا۔ بڑا ہوگا تو نہ صرف اہلِ محلہ کا سر پھوڑے
اہلِ شہر پر قیامت برپا کرے گا۔ لوگ اس سے بھاگیں گے۔ یہ راستہ نہ
گڑگڑائیں گے یہ رحم نہ کھائے گا۔ جو سوسائٹی اپنے مفلوک الحال بچوں کی

توجہ نہیں کرتی۔ بچے بڑے ہو کر اُس سے انصاف نہیں کرتے۔ مٹنے والی قوم کے اسباب تنزل میں بڑا اسبب بچوں کی تعلیم و تربیت سے سوسائٹی کی مجرمانہ غفلت ہے۔ لاکھوں جوہر قابل اسی طرح خاک میں مل گئے۔ اگر ان بچوں کی صحیح تعلیم اور عمدہ تربیت کا انتظام ہوتا تو اُن میں سے ایک ایک خدا جانے کیا کیا انقلاب آفرینیاں کرتا۔ دُنیا کی ترقی کے دَور باہمت بچوں کے شرمندۂ احسان ہی تو ہیں۔ اے نیک بیوہ تیرے بیٹے سوسائٹی کے مؤثر ہتھیار ہیں۔ اب دیکھ قوم ان ہتھیاروں کو اپنے گلے پر آزماتی ہے یا دشمنوں کے مقابلے میں ان کو سپر بناتی ہے۔ یہ ہلاکت اور حفاظت دونوں کے کام آ سکتے ہیں۔ اگر سوسائٹی ان بچوں کی تعلیم اور تربیت میں غفلت برتے گی تو یہ بے پروا اور بخیل ہمسایوں سے خطرناک انتقام لیں گے اور قوم کے لئے رحمت کی بجائے زحمت بن جائیں گے عورت نے کہا تو میرے بچے دُنیا کے لئے رحمت کا باعث کیوں ہوں۔ ان کو کیوں نہ اللہ کے لئے تم ہی تعلیم دلاؤ۔ استانی بولی بچوں کی تعلیم و تربیت تو میرا نصب العین ہے اور میری خوشی کا باعث۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہہ دیا۔ سرمایہ کی قلّت اس نیکی کے راستے میں حائل ہے۔"

اب مجھے بھی خیال آیا کہ اتنی جائز اور ناجائز کمائی عیش و عشرت میں گنوائی۔ بُرائیوں کے پہاڑ سر پر اُٹھائے یہ تھوڑی سی نیکی بھی کر لوں چنانچہ میں نے دس ہزار کا چک ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے لکھ دیا۔ اُستانی نے شکریہ ادا کیا۔ اس عورت کی آنکھوں سے مارے خوشی کے آنسو نکل آئے میں نے وہاں سے رُخصت چاہی اور واپس لوٹا۔

عشرت کی مدبھری آنکھوں کو پریم کے ساغر دیتے ایک مدت گزر گئی۔ اور میری عیش کوشی اور انصاف فروشی کی شہرت بھی عام ہوتی گئی۔ حاکمِ اعلےٰ نے حالات کو بہتر بنانے کے لئے تنبیہ کی۔ مگر جنونِ خیزیٔ عشق نے اصلاح کی گنجائش کہاں چھوڑی تھی۔ میں ایک دن سیہ مستی کے عالم میں حاکم کے پاس پہنچا۔ نشہ شراب میں خدا جانے کیا کچھ بکا۔ اس کے دوسرے دن ملازمت سے برطرفی کا پروانہ پہنچ گیا۔ اب سب نشے ہرن ہو گئے۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ گراں بارِ جیب اپنے بوجھ سے بتدریج سبکدوش ہو رہی تھی۔ جب کبھی انجام کار کا خیال آتا۔ تو دل گھبرا تا تھا۔ مگر غم دورِ شراب کا فور ہو جاتا۔ اور عشق کی ناعاقبت اندیشی فکرِ فردا سے غافل کر دیتی۔ چار ماہ اور حسن پر عشق مچلتا رہا۔ آخر جیب نے اپنی ساری امانت واپس کر دی۔ وہ فراموش گارِ عشق جسے دانایانِ دُنیا فاقہ کہتے ہیں۔ گھڑی گھڑی آنے لگا اور انواع و اقسام کی صورتیں بنا کر مجھے ڈرانے لگا۔ بازار میں ابھی ساکھ باقی تھی اسے دے کے کچھ دن اور کاٹے اب عشرت منزل میں جو کیفیت مجھ پر گزری اس کی روداد ہزاروں گمراہوں کی عبرت کا باعث ہو سکتی ہے۔ تنگدستی اور فاقہ مستی کی آمد پر خدا جانے میں کیسا گنہگار ہو گیا کہ محبوب کی محبت بار آنکھیں مجھ سے پھر گئیں۔ نگاہِ ناز جو نت نئے انداز میں جذبِ توجہ کا سامان کیا کرتی تھی۔ اب بھُولے سے بھی میری طرف نہ اُٹھتی۔ میں نے منکسرانہ انداز میں وجہِ ناراضگی پوچھی۔ ایک متمردانہ تُرش رُوئی سے اس نے میری طرف دیکھا مُنہ چڑایا اور چل دی۔ میں نے موقع پا کر پھر شکوہ کیا کہ اے جانِ جہاں یا تو عشق کی وہ گرمجوشی یا یہ سرد مہری۔ آخر وجہ کیا؟ بولی کہ موسم یوں ہی بدلا کرتے ہیں۔

پھر حوصلہ کر کے دریافت کیا کہ میری تقصیر۔ جواب۔ بلا تقصیر۔ میں یہ سن کر اس جواری
کی طرح جو ابھی داؤ ہار کر آیا ہو سر بزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے شام ہو
گئی۔ آخر گھر سے اکتا کر غم غلط کرنے کے لئے باہر آیا۔ اور ہنگاموں کی دنیا سے
دور نکل کر ویرانے میں چلا آیا۔ کچھ رات گزرنے پر واپس لوٹا تو عشرت منزل کا دروازہ
درِ خیبر کی طرح بند پایا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ تو کوئی جواب نہ پایا۔ صبح سے ایک
کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہ گئی تھی۔ شام کے کھانے کے لئے عشرت کے خوانِ کرم
پر نظر تھی سو وہاں سرے سے ہی مداخلت کی راہیں مسدود کر دی گئیں۔ الٰہی! اب
کدھر جاؤں؟ بیوی کے پاؤں پکڑ دوں۔ نہیں۔ اس حال میں اس کے پاس جانے
سے مر جانا بہتر ہے، پھر اب کیا کروں؟ یہ خیال تھے جو دل میں اٹھ رہے تھے۔
آپ جانتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لمبی گھاس پاس ہی برآمدے
بن پڑی تھی اسی کا اوڑھنا بچھونا بنا کے کونے میں پڑا رہا۔ پہلے بوندا باندی، پھر
موسلادھار بارش کے ساتھ ہوا کے فراٹے شامل ہوئے مصیبت کی یہ رات جتنی طوفانی
تھی اتنی ہی طولانی نظر آئی۔ میں نے تصور ہی تصور میں کئی دفعہ آفتاب کو جلوہ بار
دیکھا آنکھیں کھول کے نظر ڈالی تو وہی اندھیری رات تھی۔ آخر خدا خدا کر کے سویرا
ہوا۔ بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ دن چڑھے میری آنکھ لگ گئی اور اس وقت کھلی جب
سورج بہت چڑھ آیا تھا۔ اٹھنے میں عجلت کی۔ ادھر ادھر احتیاط سے دیکھا
عشرت کے گوش آشنا قہقہے نے مجھ پر برقِ خاطف کا اثر کیا نظر اٹھا کر دیکھا تو
عشرت جہاں میرا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ خان دوراں خدا جانے کب سے سرہانے
کھڑا تھا کہ اٹھتے ہی میرے کپڑوں سے خس و خاشاک جھاڑنے لگا۔ اس

کارویہ اِس دوست نما دُشمن کا تھا جس کو اظہارِ ہمدردی سے ذلت میں اضافہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ میری گردن شرم سے جھک گئی۔ خان دوران نے گردن جھکا کر کہا۔ اوہو! آپ اور یہ خاک۔ ساتھ ہی اُس نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ میں نے چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اُس میں سما جاؤں لیکن گنہگار کی دُعائیں قبول کب ہوتی ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ستم پیشہ آسمان جفا کے ترکش کے سارے تیر مجھ پر ہی خالی کردے گا۔ ناگاہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت جوان عشرت منزل سے نکلا اور عشرت کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ دونوں مجھے لنکھیوں سے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ رقابت کی آگ دوزخ کی آنچ سے سوزندہ تر ہے۔ میں انگاروں پر لوٹنے لگا۔ عشرت جہاں قریب آکر بولی کہ اب ہماری ملازمت کرلو مگر میرا غرور اس ذلت کی تاب نہ لایا۔ اسی حالت میں وہاں سے نکلا۔ خان دوران میرے ساتھ ہولیا۔ احتیاج نے احتیاط پر مجبور کیا۔ میں احاطے سے باہر جاکر رُکا۔ خان کمال مہربانی سے بولا کہ لاڈلی اولاد ماں باپ کا کہا کب مانتی ہے۔ میں اس لڑکی کے ہاتھوں سخت مجبور ہوں۔ رات لاکھ سمجھایا کہ وہ باہر ہیں اس نے ایک نہ سُنی۔ دروازے بند کر لئے مگر میری ایک اور بیٹی بڑی اطاعت گزار اور وفا شعار ہے۔ وہ ہر کس و ناکس کی امداد کرتی ہے۔ میں اس تک تمہاری رہنمائی کے لئے تیار ہوں۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ میں ساتھ ہو لیا۔ وہ آگے آگے چلا۔ میرا غرور خاک میں مل چکا تھا۔ مسکنت نے تمکنت کی جگہ لے لی تھی۔ شادیاں اور آزادیاں زر کے ساتھ ہیں۔ بے زر تو سب کے سامنے بے بسی سے دانت نکال دیتا ہے۔ قلاش سے بڑھ کر دُنیا میں بے عقل اور کون ہوتا ہے۔ مجھے

خیال تک نہ آیا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ یا تو کبھی بازار میں اکڑ کر چلتا تھا یا آج شرمندہ دسر افگندہ جا رہا تھا۔ کبھی تو بازار کی وسعت مجھے تنگ معلوم ہوا کرتی تھی۔ آج کمال عجز سے زمین کے ساتھ لگا جا رہا تھا۔

عُسرت کی راہ

چلتے چلتے ایک کچے مکان کا دروازہ نظر آیا۔ اور ہم ایک لمبے دالان میں داخل ہوئے اس احاطہ میں سینکڑوں کچی کوٹھڑیاں تھیں۔ ایک بڑے کمرے کے سامنے ایک بھاری بھرکم جوان پہچوان سامنے دھرے کش پر کش لگا رہا تھا اور آسمان کی طرف مُنہ کر کے دُھواں چھوڑ رہا تھا۔ جونہی اس نے خانِ دَوران کو دیکھا اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ بصد مشکل اُٹھا۔ ہزار دقّت سے چند قدم بڑھا۔ خان دوران کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بس اتنی ہی نقل و حرکت سے اس کا سانس پھُول گیا اور اس کی کیفیت لوہار کی دھونکنی کی سی ہو گئی۔ خان دوران نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ یہ میرا بیٹا کاہل خان ہے جو اپنی بہن عُسرت جہاں کے پاس رہتا ہے۔ خان دَوران نے اس سے دریافت کیا کہ عسرت بیگم یہیں ہے؟ اُس نے کچھ کہا تو نہیں مگر تنفّس کی تیزی سے ہاں ہاں کی آواز سی نکلی۔ کاہل خاں کے کمرے کے ساتھ ہی عُسرت جہاں کی آرامگاہ تھی۔ خان دَوران نے ادھر کا رُخ کیا میں بھی ساتھ ہو لیا۔ دیکھا کہ فرشِ خاک پر ایک ضعیفہ صف بچھائے بیٹھی ہے۔ زمانے نے اس کے جامۂ ہستی پر جا بجا شکنیں ڈالی ہوئی تھیں۔ اردگرد زائروں کا ہجوم تھا جو کمال احترام و عقیدت سے بیٹھے تھے۔ جونہی اس نے خان دوران کو دیکھا

از راہِ تکریم اُٹھ کھڑی ہوئی اور نقاہت کی وجہ سے پھر جلد بیٹھ گئی۔ خان نے مجھے اس سے روشناس کرایا۔ اس کے پاس بٹھایا اور خود چپکے سے چلا گیا۔

عسرت جہاں نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ دُنیا چند روزہ ہے سب کو خالی ہاتھ جانا ہے۔ امیر اور غریب کا ایک ہی ٹھکانا ہے۔ اس دنیا میں غریب کا پیٹ تو بھر جاتا ہے مگر امیر کی آنکھ نہیں بھرتی۔ اے دُنیا کے لوگو قناعت کرو۔ خواہ مخواہ دھن دولت کے پیچھے مارے مارے نہ پھرو۔ خدا روزی رساں ہے تم اطمینان سے جہاں بیٹھو گے وہاں قسمت کا لکھا پاؤ گے۔ ابھی اس نے بات ختم نہ کی تھی کہ ایک ہلڑ سا ہؤا۔ سب نے دیکھا کہ ایک امیر کے گھر سے روغنی نان کے چند خوان غریبوں میں تقسیم ہونے کے لئے آئے ہیں۔ وہ بے کار اور نان و نفقہ سے محتاج لوگ جو مختلف کوٹھڑیوں میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ دیکھتے ہی بھاگے۔ جس کے ہاتھ جو آیا لے بھاگا۔ تنومند کمزوروں کا حصہ بھی لے اُڑے اور وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر خیال آیا کہ بدبخت اُمراء اپنی ثروت و دولت کی نمائش کے لئے بیکاروں کی جماعت میں اسی طرح اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ غریبوں کے لئے علم و ہنر محنت و مشقت کی راہیں نہیں کھولتے بلکہ داد و دہش کا بے محل اظہار کر کے قوم کے ایک حصے کو قطعی بے کار کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اگرچہ میرا ابھی پیٹ خالی تھا مگر اس دھینگا مشتی کو دیکھ کر میں نے اُٹھنے کی ہمت نہ کی۔ جب ہنگامہ ذرا فرو ہؤا تو عسرت جہاں سے اکثر نے اپنی حاجتیں بیان کر کے مشورہ طلب کیا۔ اُس نے سب کے واسطے کوئی نہ کوئی شیطانی راہ تجویز کی۔ پھر مجھ پر مہربان ہوئی اور کہا کہ چھوٹے سے پیمانہ پر ایک قمار خانہ کھول لو۔ میں نے سُنا تو مجھ پر

گویا بجلی گر پڑی۔ وہاں سے لوٹا اور دل میں عہد کیا کہ اگر معقول ملازمت نہ ملی تو
مزدوری کر کے کھاؤں گا مگر کسی ذلیل پیشہ کو ذریعہ معاش نہ بناؤں گا اور اس مالزاد
عسرت کے کبھی قریب نہ جاؤں گا جو عورتوں کو قحبہ خانے اور مردوں کو قمار خانے
کھولنے کے مشورے دیتی ہے۔ ذلیل پیشوں پر اُبھارنا اس کا کام ہے۔ چنانچہ
کوئی دیانت دار پیشہ اختیار کرنے کا عہد کر کے میں اس شہر سے چل نکلا۔ اور ایک
دُور دراز شہر میں جا کر مزدوروں کی ایک ٹولی میں بیٹھ گیا۔

اس شہر میں ایک مخیر شخص رفاہِ عام کے لئے ایک بڑی سرائے بنا رہا تھا
میں وہاں مزدوری کرنے کے لئے چلا گیا۔ ایک تغار میرے سپرد کی گئی اور میں
اس خیال سے شرمندہ ہو گیا کہ اگر کوئی شناسا دیکھ پائے تو کیا کہے۔ اس
خیال کا آنا تھا کہ میں ساری تیزی اور چستی بھول گیا۔ اور گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر
دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ چلا۔ اتنے میں معمار پکارا کہ میاں مزدور اس معشوق
خرام سے کام نہ چلے گا۔ حرام نہ کھاؤ۔ میں چونک اُٹھا اور جلد جلد قدم اُٹھانے لگا
چوتھی دفعہ جو تغار اُٹھائی۔ ہاتھ پھسل گیا۔ کپڑے گارے میں لت پت ہو گئے
میری ہیئت کذائی کو دیکھ کر کوئی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ آخر ایک نے رحم کھا کر منہ د
ایک مسخرے نے کہا چلو کوئی بات نہیں، خربوزے کے چھلکے سے پاؤں پھسل
ہی جاتا ہے۔ اس بیہودہ سی بات پر پھر لوگ ہنسنے لگے اور میں شرمندہ ہو
اتنے میں مالک مکان آیا۔ سب نے میری کیفیت ہنس ہنس کر بیان کی۔ اس نے
مجھ سے دریافت حال کیا۔ میں نے کمال پریشانی میں کچھ مختصر سا قصہ کہہ د
اسے میرے حال پر رحم آیا۔ اور مجھے حساب لکھنے کے کام پر لگایا اور سامان عمـ

کی خرید و فروخت میرے ذمہ ہوئی۔ میں نے پائی پائی پر نگاہ رکھی۔ مالک میرے کام سے اتنا خوش ہوا کہ سارا کاروبار میری نگرانی میں دے دیا۔ اور میری تنخواہ میں معقول اضافہ کر دیا۔ دُنیا جو میری نظر میں تاریک ہو گئی تھی پھر روشن نظر آنے لگی۔ اب میں روپوں میں کھیلنے لگا۔ میں نے بھی تھوڑا کھایا۔ زیادہ بچایا اور کچھ روپیہ ماہ بماہ بیوی کے نام بھیجتا رہا۔

موسم بدل رہا تھا۔ میں نے مالک مکان سے چند دن کی رخصت لی۔ اور اپنے شہر کو چل دیا۔ بسنت کا دن تھا۔ کچھ عورتیں اور مرد ندی کے کنارے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ابھی اور بسنتی پگڑیاں پہنے اور دوپٹے اوڑھے میلے میں آ رہے تھے۔ حسن کا دریا ہر طرف بہہ رہا تھا۔ عشق کی موجیں اُٹھ رہی تھیں جوانی اُمنگوں کی تال پر ناچ رہی تھی۔ جب میں نے کئی نوجوان جوڑوں کو محبت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتا دیکھا تو متاہل زندگی کی وہ جنت یاد آئی جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا تھا۔ رفیقۂ حیات کی یاد نے سانپ سینہ پر لوٹا دیا۔ قدرناشناس دل میں غبار سا اُٹھا لیکن گھر جانے میں شرمندگی محسوس کرتا تھا۔ اگر گناہ کی آلودگیوں سے ضمیر پاک ہوتا تو فراق کی بے تابیوں میں ماہیٔ بے آب کیوں ہوتا۔ سیدھا گھر ہی نہ پہنچتا۔ مگر قدم قدم پر رُکتا تھا اور گھر جانے کے تصور سے اس طرح ڈرتا تھا جس طرح آوارہ مزاج بچہ عذرِ معقول کے بغیر سکول سے غیر حاضر رہ کر پھر وہاں جانے سے گھبراتا ہے۔ تیوہار نے دُنیا کو گدگدا دیا تھا۔ ہر طرف ہنسی خوشی کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ میں اس خیال میں غلطاں تھا کہ گھر کیسے جاؤں اور رفیقۂ حیات کو مُنہ کیسے دکھاؤں۔ آخر

دل کڑا کر کے قدم گھر کی طرف اُٹھایا۔ محلّے کے قریب پہنچا۔ تو چاہا کہ بھاگ جاؤں کہ اتنے میں ایک نیک ہمسایہ عورت نے مجھے پہچانا اور لپک کر میری طرف آکر بولی کہ بھائی اتنی مدت گھر سے باہر رہے۔ گھر والی کو دیکھا کس حال میں ہے، اب میں نے جلدی جلدی قدم اُٹھایا۔ دہلیز پہ پہنچا تو قدم رُک گئے میں رُکا ہی تھا کہ اندر سے آواز آئی "حسبی اللہ" میں بمجبوری اندر داخل ہوا۔ آرزوئے دید کے باوجود ندامت سے میری آنکھیں نہ اُٹھیں۔ میری پریشان حالی کو اُس نے دیکھا سخت مضطرب ہوئی۔ اُٹھی۔ بلائیں لیں۔ اب میری نگاہ اس کے چہرہ پر پڑی۔ آہ اُس کے باغ حسن میں جوانی کا پھول مُرجھا چکا تھا۔ اور وہ ایک تپسوی کی طرح سُوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔ تاہم آنکھوں میں عصمت کا رُوحانی نور بدستور جھلک رہا تھا۔ جس نے دل کے تاریک تہ خانہ کو پھر سے روشن کر دیا۔ اپنے مجرمانہ تغافل اور اُس کی شوہر پرستی کے خیال نے مجھ کا سر اس کے پاؤں پر رکھ دینے پر مجبور کر دیا۔ میرے سر جُھکانے پر اس نے ہزار بار استغفار پڑھی اور پھر سجدۂ شُکر ادا کیا کہ اللہ نے پھر ہمیں ملا دیا۔

فرشتوں نے خوشی کی ایک نئی دُنیا ہم پر کھول دی۔ مسرّت کا سمندر اُمڈ آیا۔ میری ندامت اس کی محبت کی گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔ چاہا کہ دل کھول کر اپنے گناہوں کا اقرار کروں مگر اُس نے گڑے مُردے اُکھاڑنے سے احتراز کیا اور کہا کہ اقرارِ عیب بے سبب رسوا ہونے کے مترادف ہے۔ مرد کو عورت کی نظر میں مؤقر رہنا چاہئے۔ اگرچہ میں آپ بیتی بیان نہ کر سکا۔ مگر وہ قرائن سے حقیقت بھانپ گئی۔ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ ملازمت بھی بوالہوسی کی نذر کر

چکا ہوں۔ اخلاقی تنزل کے علاوہ مالی تباہی پر بھی اس نے مجھے مطعون نہ کیا بلکہ حق تو یہ ہے کہ غریبی میں اس کا ایثار اور جذبۂ خدمت اور بھی بڑھ گیا۔ باوجود صحت کی بدحالی کے وہ اُٹھی، پانی گرم کیا۔ میں نہایا۔ وہ ناشتہ تیار کر کے لائی۔

راہِ نجات

غرض اب میں گھر کے آرام اور آسائش کا لُطف اُٹھانے لگا عشرت جہاں کا خیال بھی آتا تو فوراً اپنی پُرعصیاں زندگی سے پریشان ہو جاتا جب اس بیگناہ نوجوان کے پھانسی پا جانے کا خیال گزرتا تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، گناہگاروں کی بے اطمینان زندگی سے پاکباز واقف نہیں ہوتے۔ میں کیا بتاؤں کہ باوجود گھر کے پورے آرام کے گذشتہ بداعمالیوں نے زندگی کیونکر تلخ کر رکھی تھی۔ میں اپنے گناہوں کا کفارہ دینا چاہتا تھا۔ ہر وقت تسبیح و مصلا سے کام تھا۔ رات دن استغفار میرا وظیفہ ہو گیا۔ ایک دن میں گھر سے باہر گیا راستہ میں ایک سبز پوش پیر کو مریدوں کے حلقے میں بیٹھا پایا۔ گھونگریالے بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ پر بشاشت اور لبوں پر تبسّم تھا۔ آنکھوں کے کاجل نے جمالِ ظاہری کو اور بھی جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ راسخ الاعتقاد مرید پنکھا جھل رہے تھے۔ اور حضرت قبلہ تصوّف و سلوک کی باتیں کر رہے تھے:۔

"دھن دولت آنی جانی ہے۔ یہ دُنیا فانی ہے۔ جو دُنیا میں بدحال ہوگا

وہ عاقبت میں خوشحال ہوگا۔ بس اللہ اللہ کرنا چاہیئے اور کسی بات پر کان نہ دینا چاہیئے۔ حواس کا تعطل روح کی بالیدگی کا باعث ہوتا ہے۔ ؎

آنکھ ناک مُنہ موند کر نام نرنجن لے
بھیتر کے پٹ تب کھُلیں باہر کے جب دے"

اتنے میں ایک صاحب جو حضرت موصوف کے خلیفۂ اول تھے آئے کہا کہ کیا آپ بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیا مضائقہ ہے۔ غرض سر جھکا کر بیٹھ گئے اور اللہ ہُو کا ورد ہونے لگا۔ میں نے بھی ہر نماز کے بعد ذکر شروع کیا۔ دُنیا کے اور کاموں سے دِل اُچاٹ ہونے لگا۔ بعض اوقات میں ایسا کیف و سرور میں کھو جاتا کہ دُنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ ایک دن میں اپنی رفیقۂ حیات کو مخاطب کر کے پکار اُٹھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ داغ عصیاں اس عبادت سے دھل رہے ہیں۔ اُس نے میرے غلط الیقین کے اظہار پر مجھے تعجب سے دیکھا اور کہا کہ یہ خیال خام ہے۔ عبادت بیشک قلب میں طاقت پیدا کرتی ہے مگر جب تک عبادت عمل کے ساتھ شامل نہ ہو، کوئی عبادت عبادت نہیں۔ سچ پوچھو تو قولی عبادت بغیر عملی عبادت کے سرے سے ہی قابل ستائش نہیں۔ عبادت سے بیشک رُوح میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ مگر جس طرح کوئی پہلوان محض طاقت کے باعث نیکوکار اور پرہیزگار نہیں مانا جا سکتا۔ اسی طرح عبادت گزار محض روح کی طاقت سے نیکوکار نہیں کہلا سکتا۔ وہ شخص جو دن رات اللہ کی عبادت کرتا ہے مگر بیوی بچوں کے حقوق اور ہمسایہ کی تکلیف کا خیال نہیں کرتا۔ کبھی نیک جزا کا مستحق نہیں۔ عبادت نیکیوں کا ذریعہ ہو سکتی ہے، خود نیکی نہیں۔ اور سزا حُسن

عمل اور سُوءِ عمل پر منحصر ہے۔ نہ کہ عبادت اور ریاضت کی کثرت اور قلت پر۔

مجھے عبادت کی اس تفسیر سے مایوسی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ آخر میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ اگر عبادات گناہ کا کفارہ نہیں تو وہ کون سا عمل ہے جو گناہوں کے داغ دھو سکتا ہے۔ وہ بولی، میرے آقا۔ داغدار کپڑا خواہ کتنی بار دھویا جائے وہ نئے لباس کی برابری نہیں کر سکتا۔ ہاں۔ گناہ کا داغ حُسنِ عمل سے صاف ہو سکتا ہے۔ میں عقیدت مند مرید کی طرح نہایت عجز سے بولا۔ میرے گناہوں کو کون سا عمل دھو سکتا ہے۔ میری رفیقۂ حیات مسکرائی اور کہا کہ کفارہ کا اصُول یہ ہے کہ اگر کسی بیگناہ کو قتل کیا ہے تو کسی کی جان بچاؤ۔ جھُوٹ بول کر کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو سچ کہہ کر کسی کو فائدہ پہنچاؤ۔ ناحق کسی کا حق چھینا ہے تو کسی حق دار کو حق دلاؤ۔ اگر اپنے ملک وقوم یا نوعِ انسانی کی کوئی اہم خدمت انجام دے سکو تو نجات قطعی یقینی ہو جاتی ہے۔ بنی نوعِ انسان کے لئے جان کو جتنی جوکھوں میں ڈالو گے اتنا ہی اجر پاؤ گے۔ خدا کی پیاری مخلوق کے لئے جو کوئی جتنا کچھ کھوئے گا۔ اس سے کہیں زیادہ حاصل کرے گا۔ اس لئے اے آقا! گناہوں کی کثرت سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ فوراً توبہ کر کے بندگانِ خدا کی خدمت کا عزم بالجزم کرنا چاہئے۔

اے آقا! امتحان کے میدان میں اُترے بغیر خدا کی خوشنودی میسّر نہیں آ سکتی۔ رُوٹھے ہوئے خدا کو منانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ انسان خوف، نقصِ مال، اور نقصانِ اولاد سے آزمایا جاتا ہے، تنگ دستی گھسیٹ گھسیٹ کر کفر کے دروازے تک لے جاتی ہے۔ جو ان حالات میں ثابت قدم رہے اور خدمتِ خلق سے

مُنہ نہ موڑے۔ اس کی توبہ قبول اور نماز مقبول ہوتی ہے۔ تب خدا اپنے فضل کے دروازے اس پر کھول دیتا ہے۔ پھر کبھی فکر اور فاقہ پاس نہیں آتے

اے خداوندِ مجازی! اعمالِ انسانی کے اس نکتہ کو یاد رکھو کہ عافیت کوشا سے خدا نہیں ملتا۔ بعض عاقبت نا اندیش لوگ خدا کو پہاڑوں اور جنگلوں کی تنہا اور حجروں کے گوشوں میں تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ لوگوں کو میدانِ امتحان اور قعرِ دریا میں بُلاتا ہے تاکہ سچا طالب امتحان کی سختیوں اور بلاخیز موجوں کا مقابلہ کر کے اس تک پہنچے اور اس طرح دُودھ پینے والے اور خون دینے والے مجنوں میں فرق ہو جائے۔ جو اُس کی پرکھ میں پُورا اُترتا ہے۔ وہ سونے میں تُلتا ہے اور موتیوں میں کھیلتا ہے۔

اے آقا! افسوس ہے اس گنہگار پر جو محض زبانی استغفار پر قناعت کرتا ہے اور بقیہ عمر عزلت گزینی میں بسر کرتا ہے۔ ہلاکت ہے اس کے لئے جو تماشا گاہِ عالم میں خود بازی گر بننے کی بجائے محض تماشائی بنے رہنے پر قانع ہے۔

اے میرے آقا! اگر خدا کی پیاری مخلوق کی خدمت کرتے کرتے جان جسم سے الگ ہو جائے تو نجات یقینی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خادم خدا کی محبوب ترین مخلوق ہے۔ وہ بغیر حساب کتاب کے بہشت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

میں نے تعجب سے پوچھا کہ اے محبوب! آخر خدمت میں یہ کرامت کیوں؟

مَیں نے دیکھا کہ اُس حُورِ نورانی کے چہرے پر ایک جلال سا آ گیا اور آنکھوں میں ملکوتی روشنی جھلکنے لگی۔ ان خوش گوار تغیرات نے اس کے حسن کو

پر لگا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ وہ سنبھل کر بولی۔ کہ اے خداوندِ مجازی! جو لوگ نیک راہ میں دولت صرف کرتے ہیں وہ مخیر کہلاتے ہیں۔ ملک کے لئے قید و بند کی سختیاں اُٹھانے والے محبِ وطن مشہور ہو جاتے ہیں جو بال بچوں کی مفارقت برداشت کر کے اماکن مقدسہ کو جاتے ہیں۔ وہ حاجی کہلاتے ہیں۔ مگر خادم میں وہ تمام نیکیاں مجتمع ہوتی ہیں۔ وہ مال واملاک کو مستقل طور پر چھوڑ جاتا ہے اور ہمیشہ کے لئے بیوی بچوں سے مُنہ موڑ جاتا ہے۔ مخیر میں ریا ممکن ہے۔ محبِ وطن میں شخصی اغراض کا شائبہ ہو سکتا ہے۔ حاجی کا مکار ہونا بعید از قیاس نہیں لیکن خادم ان تمام شبہات سے بالا ہے۔ اس سے بڑھ کر خدا کی مخلوق میں صابر و شاکر کون ہے؟

اے آقا! کیا بنی نوع انسان کی خدمت کرتے کرتے موت کو قبول کرنے پر آپ نے کبھی دِل کو آمادہ پایا؟ اور اس طرح خدا کی کسوٹی پر پُورا اُترنے کی کوشش کی؟ اُس نے جواب کے لئے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور اس انتظار میں خاموش ہو گئی۔ اس وقت میری حالت اس متعلّم کی سی تھی جس سے زبانی سوال کا صحیح جواب بن نہ آئے۔ میں مُنہ سے تو نہ بولا۔ ہاں ندامت سے دانت نکال دیئے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد یہ عذر تراشا کہ شہادت کی راہیں اس زمانہ میں مسدود ہیں۔ وہ میرے اس عذرِ لنگ پر ہنس دی۔ اور کہا۔ اے آقا! جنت کے دروازے تو ہر وقت کھلے ہیں۔ شہادت کے موقعے ہزار بار پیدا ہوتے ہیں۔ طوفان کے وقت جب سمندر بلاخیز موجوں سے تیوری چڑھا لیتا ہے اور جہاز بھنور میں پھنس جاتا ہے تو جو شخص محض اپنی لائف بلٹ (Life belt)

دوسروں کے سپرد کر کے خود حوالۂ تقدیر ہو جاتا ہے۔ وہ ڈوب جائے تو شہید کہلاتا ہے۔ جب ڈاکوؤں کے شر ربار اسلحہ بستی کے خرمنِ امن کو آگ اُگل کر جلاتے ہیں تو معصوم آبادی کو بچانے کے لئے جو اپنی جانِ عزیز دے دے شہید ہے۔ جب کسی غریب کے مکان کو آگ لگ جائے اور شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اس وقت جو بیکس ماں کے گریہ وفغاں سے متاثر ہو کر بچوں کی جان بچاتے ہوئے نذرِ آتش ہو جائے شہید ہے۔ اے میرے آقا شہید کا رُتبہ آخرت میں بہت بلند ہے۔ اے سرتاج میں تیرے سر پر شہادت کا تاج دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسی سے دُنیا کے گناہ دُھل سکتے ہیں اور آخرت کا عذاب ٹل سکتا ہے۔

مُوت کے تصور سے جو کیفیت بُزدل اور منافق پر طاری ہوتی ہے وہی اس وقت مجھ پر طاری ہو گئی۔ میرے چہرہ کا رنگ اُڑ گیا آنکھوں میں خوف و خطر کے علامات پیدا ہو گئے۔ جس کو دیکھ کر وہ خود کسی سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے بالآخر پوچھا کہ قطعی نجات کی کوئی اور صُورت ممکن نہیں۔ اس نے سر اُٹھایا اور کہا کہ قطعاً نہیں۔ سچا دین وہی ہے قربانی جس کا آئین ہو۔ انسانوں میں افضل وُہ ہے شہادت کی تڑپ جس کے دل میں ہو۔ میں نے کہا تو کیا شہید کے سوا جنت کی راہ سب پر مسدود ہے۔ کہا مسدود تو نہیں مگر نجات یقینی نہیں۔ اب ذرا مطمئن ہو کر پوچھا۔ اے محبوب شہید کے علاوہ ناجی کون شخص ہے۔ وہ شاہدِ گلشنِ محبوبی بولی۔ صالح، متقی اور مومن۔

میں نے کہا "محبوب! مومن کی کیا تعریف ہے؟" اس نے جواب دیا کہ مومن وہ ہے جس نے گناہ کبیرہ نہ کیا ہو۔ میں نے پوچھا کہ صالح؟ وہ بولی

صالح وہ شخص کہلائے گا جو قوموں میں ذہنی اور مادی انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس تعریف میں بڑے بڑے ریفارمر شامل ہیں۔ جن کی ذات سوسائٹی کی ترقی کا باعث ہوئی اور جن کے شخصی عیوب قومی خدمات کے مقابلہ میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو کاہ کو کوہ کے مقابل ہے۔ اس میں وہ فاتحین بھی شامل ہیں جنہوں نے مصطفےٰ کمال کی طرح قوم کو تنزل کے خارزار سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ متقی کی کیا تعریف ہے؟ وہ بولی۔ اے سرتاج! متقی وہ ہے جس پر موت کا خوف اور خدا کا ڈر اتنا مستولی ہو کہ وہ ہر وقت گناہ پر نظر رکھے اور نیکیاں کرتا رہے، وہ ہر انسان سے حسن سلوک کرتا ہے اور حق العباد کی نگہداشت سے غافل نہیں ہوتا۔ وہ لواحقین اور ہمسایوں کے لیے سراپا رحمت ہوتا ہے۔ اس میں شوقِ شہادت تو نہیں ہوتا۔ مگر غازیوں کی امداد میں دریغ نہیں کرتا۔ ہر نیک تحریک میں حصہ لیتا ہے۔ صالح انسانوں کی امداد میں مصروف رہتا ہے۔ جب کبھی اس سے کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوتا ہے، تو برسوں شرمسار رہتا ہے۔ بیماروں کی خدمت کر کے کفارہ ادا کرتا ہے اور قومی اور ملی تحریکات میں بقدرِ امکان اعانت کر کے روٹھے ہوئے خدا کو خوش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اے آقا! متقی اور صالح لوگ باوجود گنہگار ہونے کے اپنے نیک اعمال کی کثرت کی وجہ سے دوزخ کی آنچ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اگر تم شہید نہیں ہو سکتے تو وہ کام کرو جس سے مخلوقِ خدا کو نفعِ کثیر ہو۔ زندگی ایک نظام کے ماتحت بسر کرو۔ قوم کی عزت کے محافظ ہو۔ آزادی کو اپنا حق سمجھو۔

رفیقۂ حیات کی ان تصریحات کے بعد میں نے پاک زندگی بسر کرنے

کی ٹھانی، جو وقت پیٹ کے دھندے سے بچتا میں مخلوقِ خدا کی خدمت میں بسر کرنے لگا۔ جس سے میری طبیعت میں سکون اور اطمینان پیدا ہوتا گیا۔ میں قولی عبادت مختصر سی کرتا تھا۔ مگر عملی عبادت یعنی خدمتِ خلق میں رات دن لگا رہتا۔ ہمیشہ یہی خیال دامنگیر تھا کہ اس تھوڑی سی زندگی میں کوئی بڑا کام سرانجام پا جائے۔

ایک دن صبح سویرے نُور کے تڑکے میں روزانہ عبادت سے فارغ ہو کر یہ دُعا مانگ رہا تھا کہ الٰہی خدمتِ خلق کا بہترین موقع دے کہ کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دیکھا تو خان دوران سبز عمامہ پہنے ہاتھ میں تسبیح لئے کھڑا ہے۔ چاہا کہ دھکّے دے کر باہر نکال دوں مگر غصّہ پر تحمل نے فتح پائی۔ غصّہ ضبط کیا۔ مردانہ مکان میں اسے لے جا کر بٹھایا۔ چونکہ اس کی آشنائی پہلے مضر ثابت ہو چکی تھی اس لئے ملاقات کو مختصر کرنے کے لئے بے وقت آمد کی وجہ پوچھی۔ اس نے آنکھیں اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا کہ عشرت نے پیغامِ محبّت دے کر بھیجا ہے۔

عشرت کا نام سُن کر مارے غصّے کے میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ خان نے میری کیفیتِ قلب کو چہرہ سے ہی بھانپ لیا اور بات بدل کر کہا کہ میں تمہیں یہ نصیحت کرنے آیا ہوں کہ اب گوشہ نشین ہو کر یادِ خدا میں مشغول ہو جاؤ۔ عبادت سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی چیز نہیں۔ میں نے کہا کہ عزلت گزینی کا میں قائل نہیں۔ بس ملّت کی خدمت مخلوقِ خدا کی بھلائی میری عبادت ہے۔ خان دوران نے کچھ پریشان ہو کر کہا کہ آپ عبادت کی ضرورت کے قائل نہیں؟ میں نے کہا کہ عبادت

عملِ حسنہ کی ابتدائی تیاری ہے۔ اس لئے عبادت مقصد نہیں ہے بلکہ خدا کی مخلوق کی خدمت ہی انسان کے لئے دُنیا اور آخرت میں بھلائی کا باعث ہے۔ جو شخص خدا کی حمد کے ساتھ مخلوق کی خدمت کرتا ہے اسی کو نجاتِ ابدی کی بشارت دی جاتی ہے۔

خانِ دَوراں کے سینہ سے اِک آہ نکلی اور بے اختیار ہو کر بولا کہ تو میرے قبضے سے نکل گیا۔ یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اُٹھا میں نے اس کی عبا کے کنارے کو پکڑ کر پوچھا میں تیرے قبضہ سے کیونکر نکل گیا۔ مگر وہ نہ رُکا۔ اس نے کنارے کو جھٹکا دیا۔ مگر میں نے دامن تھامے رکھا۔ اس کی ناک سے سگرٹ کے دھوئیں کی طرح ایک غبار سا اُٹھا اور بتدریج پھیلنا شروع ہُوا۔ اس دھوئیں سے ایک نہایت کریہہ شکل نمودار ہوئی جس کی آنکھیں اندر دھسی ہوئی تھیں۔ دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ ناک لمبی اور خمیدہ۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے تیروں کی طرح کھڑے تھے۔ جوں جوں دُھواں پھیلتا گیا۔ یہ شکل قد میں بڑھتی گئی مگر اس کے نقوش مدھم پڑتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ غائب ہو گئی۔ اس دہشت ناک شکل کو دیکھ کر میری گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ وہ عبا چھڑا کر باہر نکل گیا۔ میں نے بڑھ کر راستہ روکنا چاہا۔ وہ بولا کہ اے انسان میں تیری دسترس سے باہر ہوں۔ اس وقت تو میں عالمِ ناسُوت کے مثالستان میں ہوں مگر اب عالمِ لاہوت کے خیالستان کو جاتا ہوں۔ یہ کہا اور میری نظر سے غائب ہو گیا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔

باب دوم

عالمِ مثال

(دارُ المعائنہ)

آغازِ بہار کی ایک صبح کو جب کہ فرشتے اہلِ زمین پر برکتوں کی بارش کر رہے تھے۔ اور اس راحتِ جاں کا لگایا ہوا باغیچہ نئے پھولوں اور پتوں سے سبز پوش محبوب معلوم ہوتا تھا ایک طائرِ خوش رنگ و خوش الحان زمزمہ سرائی کرتا ہوا آیا اور ایک شاخِ گل پر بیٹھ کر پھولوں کے حُسن کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی بے فکر مشغولیتوں کو دیکھ کر میں نے دل میں کہا کہ اے مرغِ رنگیں پر۔ تیری زندگی قابلِ رشک ہے کہ نہ اس جگ میں کچھ غم نہ اُس جہاں میں جزا و سزا کا اندیشہ۔ اتنے میں رفیقۂ حیات نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ کس فکر میں پڑے ہو؟ میں نے کہا کہ فکرِ فردا میں۔ وہ بولی کہ فکرِ فردا بے سُود ہے۔ آج ہمت سے کام لو۔ کل کا اندیشہ نہ کرو۔ جو دُنیا میں ہمت نہیں ہارتے ہر کٹھن منزل کو ہمت سے طے کرتے ہیں۔ وہ آخرت میں مستحقِ انعام ہوتے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ کبھی کبھی تو مجھے حیات بعد الموت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ بولی کہ ایسے موقع پر استغفار پڑھو۔ میں سجدے میں گر پڑا اور دیر تک تضرع و زاری کے ساتھ استغفار پڑھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد سجدے سے سر اُٹھایا۔ وہ میرے

پاس آ بیٹھی اور مصلّے پر ہی لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر محبت سے میری طرف دیکھا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اس عالم میں مَیں نے ایک عجیب خواب دیکھا:۔

عذابِ قبر

کیا دیکھتا ہوں کہ میں مرگیا ہوں اور احباب میرے جنازہ کو کندھوں پر اُٹھائے قبرستان لئے جا رہے ہیں۔ مَیں نے گھبرا کر اُٹھنا چاہا۔ سکت نہ پائی۔ بولنا چاہا زبان بند ہو گئی۔ میں نے ہزار دفعہ ہلنے اور بولنے کی بے سُود کوشش کی حتیٰ کہ جنازہ قبرستان پہنچا۔ تابوت ایک درخت کے نیچے رکھ دیا گیا۔ مجھے دیکھ کر تعجب ہُوا کہ میری نگاہ جہت کی قید سے آزاد ہو گئی ہے میں جدھر چاہوں بغیر آنکھیں پھیرے اور سر ہلائے دیکھ سکتا ہوں۔ مذہبی پیشوا آخری رسوم پوری کرنے کو آیا اور سرہانے کھڑے ہو کر کہا کہ دُنیا فانی ہے۔ سب کے چہروں پر فنا کے ذکر سے مُردنی سی چھا گئی۔ اب اُس نے جلد جلد آیتیں پڑھنی شروع کیں۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ سورج لحدِ مغرب میں اُتر چکا تھا۔ قبرستان کے درختوں کی جھُکی ہوئی ٹہنیاں اور طیور کی چیخ پکار دلوں پر افسردگی طاری کر رہی تھی۔ جوں جوں اندھیرا زیادہ ہو رہا تھا۔ لوگوں میں بے چینی کے آثار زیادہ بڑھ رہے تھے۔ گورکن شمع کی مدد سے لحد تیار کر رہا تھا۔ میرے احباب جو جنازہ کے ہمراہ آئے تھے، لحد کی تیاری کا نہایت اضطراب سے انتظار کر رہے تھے۔ اب گہری تاریکی چھا گئی۔ گورستان پر خاموشی طاری تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد گورکن نے آواز دی۔ لحد تیار ہو چکی ہے جنازہ اُتارو۔ لحد کی تنگی اور قبر کی تاریکی کے تصور سے میں نے چیخنا چاہا۔ مگر آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ احباب نے اُٹھا کر مجھے لحد میں لٹایا۔ قبر کو مٹی سے بھر دیا۔ اور مجھے اس ہولناک مقام پر چھوڑ کر چلے گئے۔ باوجود اس خاک کی چادر اوڑھنے کے میں سب کو دیکھ رہا تھا۔ تنہائی کے ڈر سے میں سخت گھبرایا اور زور سے چلّایا کہ دوستو کچھ دیر ٹھہر دیوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ اُنہوں نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ میں نے سر دُھن کر کہا کہ اہلِ دنیا کی دوستی کا کچھ اعتبار نہیں۔

جنگل میں یہ پہلی رات تھی۔ اندھیرا تہ بہ تہ اور موج در موج تھا۔ گرد و پیش سیاہی کا بے پایاں سمندر تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اب آنکھوں میں بصارت باقی نہیں رہی۔ تاریک رات میں پتھریلی زمین پر جس طرح غازیوں کے گھوڑوں کے سموں سے شرارے نکلتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے روشن نقطے آنکھوں کے سامنے اُڑتے دکھائی دیتے تھے۔ پھر تاریکی چھا جاتی تھی۔ موسم سرما کی کالی رات میں سیاہ بادلوں کی ہلکی رگڑ سے جس طرح مدھم سی بجلی چمک اُٹھتی ہے۔ اسی طرح قبر کی تاریکی میں روشنی کی ہلکی سی لکیر کبھی کبھی آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد پھر اندھیرا پرے باندھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ آخر میں اُٹھا۔ گرتے پڑتے اور ٹٹولتے ایک طرف کو بڑھا کبھی دائیں گیا کبھی بائیں۔ معلوم نہیں کتنا عرصہ یونہی بھٹکتا رہا۔ قبر کی وسعت نے خدا جانے کتنے جہانوں کو گھیر لیا تھا کہ چلتے جاتے کہیں دیوار نہ ملی۔ معلوم ہوا کہ میں ایسی دُنیا میں آ گیا ہوں جہاں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔

خدا جانے کتنے منٹ، گھنٹے، مہینے، سال اور قرن یونہی گزر گئے پھر دُور سے روشنی نمودار ہوئی۔ میں آنکھوں کو مَل مَل کر دیکھنے لگا۔ یہ روشن شعاعیں دو بلند و بالا ہستیوں کی آنکھوں میں سے نکل رہی تھیں جو سیاہ غل پہنے گُرزِ گراں ہاتھوں میں لئے میری طرف آ رہے تھے۔ جب میرے پاس آ پہنچے تو وہ ایک روزنامچے کے اوراق آنکھوں کے سامنے رکھ کر پڑھنے لگے۔ ایک صاحب نہایت سرکہ جبیں تھے۔ دوسرے کبوتر کی طرح بھولے بھالے اور بچّے کی طرح معصوم صورت۔

اوّل الذکر تیوری چڑھا کر اپنی ڈائری کے اقتباسات پڑھنے لگا۔ اس کے بعد موخرالذکر نے کشادہ پیشانی سے اپنا روزنامچہ پڑھا۔ میں اس نظارے کو نہایت خوف سے دیکھ رہا تھا۔ یک بیک اس تُرش رُو شخص کی بھنویں اور تن گئیں اور وہ کچھ بڑبڑایا۔ عشرت جہاں اور ناحق پھانسی پانے والے لڑکے کا نام ہی میری سمجھ میں آیا۔ اب وہ اپنا گرزِ گراں تان کر میری طرف بڑھا۔ میں چیخ مار کر پیچھے کو ہٹا۔ وہ ابھی اپنا جانستاں ہتھیار مجھ پر رسید کرنے کو تول ہی رہا تھا کہ اُس کا ساتھی مضطرب ہو کر درمیان میں حائل ہو گیا۔ اور اُسے اپنی زبان میں کچھ سمجھایا۔ اس کی گفتگو میں عسرت جہاں اور مغلانی کے نام ضرور آئے۔ پھر اُس نے اپنے ساتھی کو ڈائری دکھائی جس کو وہ بھی پڑھتا رہا۔ اس کی پیشانی کے بل غائب ہونے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ مصیبت کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ چنانچہ اظہارِ تشکّر و امتنان کے لئے اس فرشتۂ رحمت کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دینے کے لئے جُھکا۔ مگر پاؤں دکھائی نہ دیئے میں نے گھبرا کے

ہو کر دیکھا تو دونوں نظر سے غائب تھے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے ہر طرف اُجالا نظر آنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ دُنیا کی بستی اس مقام سے کچھ دُور نہیں۔ سامنے والے اونچے پہاڑ کے عقب میں وہ جہان بستا ہے جسے لوگ دُنیا کہتے ہیں جہاں محبّت کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ اور جہاں اب بھی نیاز و ناز کا کارزار گرم ہوگا جہاں کی رنگینیاں اور دلفریبیاں دیکھ کر فرشتے بھی آسمان سے اُترنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ دوڑ کر ہمالیہ سے سر بلند پہاڑ کو پھاند کر جاؤں اور اہلِ دنیا کے ہاو ہُو میں شامل ہو جاؤں۔ میں بھاگا۔ دامنِ کوہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ پہاڑ جو میرے اور دنیا کے درمیان حائل ہے۔ کشتوں کے پشتوں کا بنا ہے۔ اور دامنِ کوہ میں آنسوؤں کے ہزاروں دریا خون کی لاکھوں ندیاں بہ رہی ہیں۔ ان دشوار گزار مراحل کو طے کر کے جانا ناممکن ہے۔ اب پھر آنکھوں کے سامنے ایک تاریکی کا پردہ سا پڑ گیا۔ اور میں چپ و راست اندھے کی طرح ٹٹولنے لگا۔ خوف سے ہزار بار مرا۔ اُمید سے ہزار بار جیا۔

ایک مدّت کے بعد تاریکی کا بادل جو مجھ پر محیط تھا۔ چھٹنے لگا۔ صرف ایک غبار سا باقی رہ گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان بے تحاشا میری طرف بھاگا چلا آتا ہے۔ میں نے پہچانا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس نے میرے حکم سے پھانسی کی سزا پائی تھی۔ وہ میرے دیکھتے دیکھتے بڑھنے لگا اور اس کا قد چوگنا ہو گیا۔ غور سے دیکھا تو اُس کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ایک ہار پڑا دکھائی دیا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن ہو گئیں

وُہ میرے قریب پہنچ کر اُچھلنے کودنے لگا۔ اور میرے گرد گھوما۔ میں مارے خوف و دہشت کے کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں تین لمبی لمبی آہنی سلاخیں تھیں۔ جو اس نے زمین میں گاڑ دیں اور ایک موٹا رسا ان سے لٹکا دیا۔ میں خوف سے بھاگا۔ وہ میری طرف لپکا۔ میں ایک مدت آگے آگے بھاگتا رہا۔ ہر لحظہ یہی گمان ہوتا تھا کہ اس نے مجھے آلیا۔ میں اور تیز ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے پاؤں کی چاپ اور اس کے پھولے ہوئے سانس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ میں موت کے منہ سے نکلنے کے لئے اور زیادہ سعی کرتا تھا۔

آخر مجھے اس کا ہاتھ اپنی گردن پر پڑتا محسوس ہوا۔ بے اختیار چیخ نکل گئی۔ دُنیا تاریک ہو گئی۔ اب میں نے راضی بقضا ہو کر اس دیو قامت نوجوان کی طرف دیکھا، اس کے چہرہ سے خونخواری ٹپک رہی تھی۔ فریاد و فغاں سے میں نے قیامت برپا کر دی۔ وہ مجھے اُٹھا کر پھانسی کے قریب لایا۔ میں نے عاجزی کے سارے طریقے، خوشامد کے تمام الفاظ ختم کر دیئے۔ میری منت و زاری کا جواب اس دیو ہیکل نے طنزیہ مسکراہٹ سے دیا۔ میں نے پھر زاری کی اور زور کیا۔ مگر رہائی کی صورت نہ پائی۔ اس نے اب مجھے گردن سے پکڑ کر اونچا اُٹھایا۔ میری گردن میں حلقہ پہنایا۔ میں نے مایوسی کے عالم میں کہا کہ بے گناہ کو زبردستی پھانسی دینا کیا انسانیت ہے۔ اس نے آنکھ ملا کر کہا، رشوت لے کر پھانسی دینے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔ موت نہ بھی آتی تو میں مُنہ سے مانگ لیتا۔ چنانچہ جوش میں آ کر کہا۔ بس لٹکا دو۔ اب مجھے مرنے دو۔ اسے میری موت سے بڑھ کر میری اذیّت میں مزہ آتا تھا۔ حلقہ

رسی کو گردن سے نکالا اور کہا وہ وقت یاد کر جب میری آہ و زاری سے تجھ پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوا تھا اور چند سکوں کے لئے تو ضمیر فروشی اور انسان کشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر کہا خدارا رحم کرو۔ مگر اس نے کوئی توجہ نہ کی جب اُسے معلوم ہوا کہ ندامت کی جگہ خوشامد نے لے لی ہے تو پھر حلقہ گردن میں ڈالا۔ ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور نہایت آہستگی سے مجھے لٹکا دیا۔ گلا گھٹتا گیا اور میری آنکھیں باہر نکلتی آئیں۔ خلاصی کے لئے ہاتھ پاؤں مارے، رسہ اور گلو گیر ہوا۔ دم لینے کے لئے مُنہ کھولا، سانس سینے میں رُک گیا۔ جان کنی کی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ میں نے چیخنا چاہا، مگر آواز نہ نکلی، زبان سُوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھانسی سے موت بہت جلد واقع ہوتی ہے، مگر مجھ پر مہینوں یہی عذاب رہا۔

ایک مدت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کی خلاصی ہو رہی ہے۔ اور میرے ہاتھ کھولے جا رہے ہیں۔ اگرچہ نقاہت سے حرکت اعضا اور جنبش لب ممکن نہ تھی۔ اور آنکھیں اب تک روشنی سے محروم تھیں تاہم معلوم ہو رہا تھا کہ اب میں آرام دہ بستر پر لٹایا جا رہا ہوں۔ جان نے مدت کے بعد آرام پایا اور آنکھوں میں بتدریج روشنی آنے لگی۔ میں نے انگڑائی لی۔ کروٹیں بدلیں۔ یک بیک دماغ کو پریشان کرنے والی عفونت اُٹھی۔ گویا لاکھوں گلی سڑی لاشوں کے پاس لیٹا ہوا ہوں۔ ناک بند کر کے کچھ دیر سانس روکی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب سب چیزیں صاف نظر آتی تھیں۔ میں اُٹھ بیٹھا اور اُٹھنے کے ساتھ ہی کسی کے پازیب کی جھنکار سُنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا کہ عشرت جہاں سولہ

سنگار بارہ ابھرن سے آراستہ میری طرف آرہی ہے۔ جب آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے آغوش کھول دی۔ میں اس کی طرف اس طرح چلا جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف مگر میں نے محسوس کیا کہ بدبو بیش از بیش ہے۔ میں وہیں رک گیا۔ جوں جوں وہ قریب آئی بدبو میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر عفونت کی تاب نہ لا کر پلٹا۔ اس نے بازو پھیلائے اور کہا للہ میرے پاس آؤ۔ یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ وہ بڑھی اور بڑھ کر ہاتھ گردن میں حمائل کر دیئے۔ اس کے قرب نے مجھ پر قیامت ڈھا دی۔ دماغ پھٹنے لگا۔ میں پاؤں سر پر رکھ کر بھاگا۔ وہ تیزی سے تعاقب میں لپکی۔ میں نے بھاگتے ہوئے کہا۔ ذرا دُور رہ کر بات کر۔ وہ بولی "دنیا میں میری حضوری کے لئے وہ بے صبری۔ یہاں دُوری کے لئے یہ بیقراری" میری آنکھیں شرم سے زمین میں گڑ گئیں۔

پھر پیچھے مُڑ کر دیکھا تو عشرت جہاں کا حلیہ عجیب نظر آیا۔ نہ اس کے مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، وہ سو سال کی ڈھڈو کی طرح بدرُو اور بدنُما نظر آئی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے آبلہ ہائے فرنگ سے داغدار ہو رہا تھا۔ اور زخم رِس رِس کر بہہ رہے تھے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا او شعبدہ باز بڑھیا۔ سچ بتا تو کون ہے؟ وہ بولی باللہ میں عشرت جہاں ہوں، تو نے جوشِ جوانی میں میری حقیقت کو نہ پہچانا۔ تیرے شباب کی مستی نے تجھے میری اصلیت کا اندازہ نہ کرنے دیا۔ یہ کہہ کر اس نے بازو پھیلائے اور بولی کہ اے محبوب آ۔ میں وہی ہوں کہ جس کے حسن کی بلائیں تم انتہائی وارفتگی سے لیا کرتے تھے۔ تجھے آج مجھ سے اتنی گِھن کیوں آتی ہے۔ تو میرے وصال سے کیوں گھبراتا ہے۔ یہ کہا اور تیزی سے

جھپٹی۔ میں نے ہزار بچنا چاہا مگر اُس کے بازو میرے گرد مضبوط ہو گئے۔ مجھے ایسا
محسوس ہوا گویا میں گندگی کے گہرے تالاب میں پھینک دیا گیا ہوں۔ ہزار زاری
ور اضطرار کے باوجود اُس نے گرفت ڈھیلی نہ کی۔ مجھے عجیب عذاب نے آ گھیرا۔
ہر ایک سانس کے ہمراہ لاکھوں عفونتیں جسم میں داخل ہوتی تھیں۔ میں نے
بے سُود ہاتھ پاؤں مارے۔ ناک بند کر دی تو مُنہ کھل گیا۔ مُنہ پر ہاتھ دیا تو ناک کے
راستے بدبُو داخل ہوئی۔ ناک اور مُنہ دونوں بند کئے تو دم گھُٹا۔ اسی طرح
یک مدت مبتلائے عذاب رہا۔ آخر سر چکرایا اور میں گر پڑا۔ کچھ دیر بیہوش
پڑا رہا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہی اُستانی میرے پلنگ کے پاس کھڑی دل کُشا
صبح کی طرح مسکرا رہی ہے۔ ہجومِ آلام کے بعد اس خوشگوار ملاقات پر
ں بے اختیار رو دیا۔

اس عصمت مآب بی بی نے بڑی شفقت دکھائی اور تسلی دے کر کہا کہ
ری خدمت کو وہ دو نوکر لائی ہوں جن پر تُو نے دُنیا میں احسان کیا تھا۔ یہ کہہ
ر وہ ان کے نام لے کر پکاری کہ اے بچو! اپنے محسن کے پاس بیٹھو میٹھی باتوں
سے اس کا دل بہلاؤ جو حکم دے اُسے بجا لاؤ۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ
ایک لڑکی اور ایک لڑکا جن کی عمر دس بارہ بارہ سال ہے خوش خوش
یری طرف آئے اور پائنتی بیٹھ کر تلوے سہلانے لگے۔ حسن میں ایک آفتاب دوسرا
ہتاب تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جنت کی ٹھنڈی ہوائیں پنکھا جھل رہی ہیں۔ مکان
ہایت صاف بستر بہت نرم تھا۔ دل کی تمام کوفتیں اور کدورتیں دُور ہو گئیں۔
تھوڑی دیر کے بعد میں اُٹھا۔ کمرے سے باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک طویل و

عریض عمارت میں ہزاروں لوگ مختلف کمروں میں پڑے سو رہے ہیں۔ اُن میں سے بعض اشخاص کے چہروں پر تو اطمینان کے آثار نمایاں ہیں اور بعض درد و کرب میں مبتلا ہیں۔ وہ کروٹیں بدلتے ہیں۔ ٹانگیں سکیڑتے ہیں۔ ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ سر کچلے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ ماتھے کی شکنیں اور اعضا کا تشنج بتا رہا تھا کہ بے انتہا درد و کرب میں مبتلا ہیں۔ ان کے مرغوبِ خاطر مگر معیوب مشاغل میری طرح انہیں ہیبت ناک خواب دکھا رہے تھے۔ میں پریشان ہو کر جھٹ وہاں سے نکلا۔

باہر نکل کر دیکھا کہ ایک نہایت پاکیزہ صورت فرشتہ کھڑا کہہ رہا ہے کہ اے گنہگارو! مضطرب نہ ہو۔ یہ تمہارے خیال کی دُنیا ہے۔ تم نے زندگی بھی تو انہیں مشاغل میں بسر کی تھی۔ پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔ اے عزیز! یہ لوگ اسی مصیبت میں مبتلا ہیں جس سے تم رہائی پا چکے ہو۔ جو دُنیا میں اپنے اعمال کا جائزہ نہیں لیتے وہ آخرت میں خمیازہ اُٹھاتے ہیں۔

ہم اس طرح باتیں کرتے ایک گنجان جنگل میں داخل ہوئے۔ جہاں جنبیلی خودرَو پودوں سے بغلگیر تھی۔ سدا بہار گلاب کے نازک پتوں پر شبنم موتیوں کی طرح ٹکی ہوئی تھی۔ تمام اشجار کو سبز پتوں سے لدا دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ جنگل خزاں سے ناآشنا ہے۔ بلند درختوں کی لمبی شاخیں بعض جگہ دُور تک آپس میں لمبی محراب بناتی چلی گئیں۔ اس میں سُورج کہیں کہیں جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ پانی کی افراط اور زمین کے نشیب و فراز سے جگہ جگہ آبشاریں بنی ہوئی تھیں۔ خوشبُو سے لدی ہوا دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ ہزاروں انسان اس جنگل میں

آلتی پالتی مارے آنکھیں جلدی جلدی جھپک رہے تھے۔ پہلے حیرت ہوئی، پھر ہنسی آئی۔ چاہا کہ پوچھوں کہ یہ کیا کیفیت ہے۔ ہمراہی نے بازو تھاما اور اشارے سے باز رکھ کر کہا کہ یہ سعی بے سُود ہے۔ دُنیا میں یہ انسانوں سے نفور بستیوں سے دُور رہے۔ آج بھی کسی مداخلت کے متحمل نہیں۔ یہ جوگی، سادھو، مست قلندر قلّۂ کوہ اور گنجان جنگلوں میں بیٹھ کر بزعمِ خود یادِ خدا کیا کرتے تھے۔ انہیں عمل کی دُنیا میں بھیج گیا تھا۔ یہ خیال کی دُنیا میں رہے۔ خیال تو آبِ جُو کی طرح آنی جانی چیز ہے۔ خوشگوار تصوّر جو وہ اب باندھنا چاہتے ہیں، استقلال نہیں پکڑتا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے تو نیا خوبصورت تصوّر باندھنا چاہتے ہیں۔ اسی کوشش میں آنکھیں کھولتے اور بند کرتے ہیں۔

آگے بڑھ کر میں نے ایک اور گروہ دیکھا کہ آنکھ، ناک، مُنہ موند کر چت لیٹے ہوئے چُپ چاپ اپنے خیال کی دُنیا میں پڑے ہیں اور جس طرح دُنیا میں اپنے خیال میں مست، دُنیا و مافیہا سے بےخبر پڑے رہتے تھے، اب بھی مگن ہیں۔ ان کے کمالِ تصوّر نے ان کے حسبِ منشا ایک نئی دنیا بنا رکھی ہے۔ آگے جا کر دیکھا تو لاکھوں انسان تسبیح اور مالا لئے خدا کا نام جپ رہے ہیں۔

ذرا اور بڑھا تو دیکھا کچھ لوگ ساز بجا رہے ہیں، کچھ نوجوانوں کو دیکھا کہ تانیں اُڑا رہے ہیں۔ اور کچھ سبز پوش فقیر ہیں کہ وجد میں آ کر تھرّا رہے ہیں۔ اُف اُف اور ہائے ہائے کے درد انگیز نعرے لبوں پہ رواں ہیں۔ کبھی ہاتھوں کو اُٹھاتے ہیں، کبھی کولھوں کو مٹکاتے ہیں۔ کچھ جسم پر بھبوت لگائے

اور دھُونی رمائے بیٹھے ہیں۔ میرے ہمراہی نے کہا کہ یہ حال مست لوگ دُنیا میں عیب و ثواب دونوں سے ناواقف رہے ہیں، نہ اہلِ دُنیا کو دُکھ دیا اور نہ سُکھ پہنچایا خدا کی یہ مخلوق جنگل کے پھُولوں کی طرح ہے کہ نہ تو کسی کو ان کا کانٹا چبھا نہ رنگ و بُو سے کوئی بہرہ اندوز ہُوا۔ بدی اور نیکی سے ناآشنا رہ کر خدا کے غصّے کی آگ سے بچ نکلے مگر اس کی خوشنودی کے بہشت سے محروم ہوگئے۔ دیدارِ کردگار تو بیشک انہیں میسّر ہوگا مگر اس کا حُسنِ بے پروا انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھے گا۔ درآنحالیکہ نیکوکار لوگ لذّتہائے پیہم سے شادکام ہوں گے۔ محبت اور پیار کی وہ اصطلاحات جو دُنیائے عمل میں مروّج ہیں، وہ آئندہ دنیا کی کیفیتِ سُرور کو بیان کرنے میں استعمال کی جائیں تو مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ دُنیا میں فراق کو وصال پر بعض حالتوں میں فوقیت حاصل ہے۔ مگر وہاں وصال خوشی کی انتہا ہے۔ دیدار وصال کے برابر نہیں۔ جو دیدار سے محروم ہے وہ وہاں بدنصیب ہے۔

میرے ہمراہی نے یک بیک گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا کہ میری سرحد ختم ہوگئی ہے۔ یہ دوسرا درجہ تھا۔ اب تیسرا درجہ شروع ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے ایک اور وسیع عمارت موجود ہے۔ میں دروازے کے راستہ اُس میں داخل ہُوا۔ ایک نہایت پاک نورانی فرشتے نے میرا خیر مقدم کیا اور کہا، خدا کا شکر ہے کہ تُم ایک ارذل مقام سے نکل آئے، جو بدترین گنہگاروں کے لئے مخصوص ہے۔ تاکہ وہ اپنے فاسد خیالات کی دُنیا ہی کا مزا چکھیں۔ اب تمہارے لئے مزید ترقی کا موقع ہے۔ موقع کو پہچانو گے تو پھل پاؤ گے ورنہ

پچھتاؤ گے۔

اُس ہولناک خواب کا تصور میرے دل میں قائم تھا جس سے میں نے ابھی ابھی نجات حاصل کی تھی۔ میں نے کہا، نہیں صاحب، اب کھائی تو کھائی پھر کھاؤں تو رام دُہائی۔ اب مجھے بُرائی پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات سُن کر اس نے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا لو آؤ۔ اب ذرا اپنا جسمانی اور رُوحانی معائنہ کراؤ۔ چنانچہ ہم ایک ربڑ کی صاف ستھری اور کُشادہ سڑک پر چل پڑے جس پر دو رویہ سپیدے کے درخت لگے تھے۔ اس سڑک کے ساتھ ساتھ ایک سبز گھاس سے ڈھکی ہوئی روش تھی جس میں اس افراط سے پھول کھِلے ہوئے تھے کہ بجائے سبزہ کے پھُولوں کی لمبی لمبی چادریں بچھی معلوم ہوتی تھیں۔

تھوڑی دُور جا کر سنگِ مرمر کی ایک وسیع عمارت دکھائی دی جس کا ہر کونا خوبصورتی میں تاج محل سے سوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس عمارت کو بیسیوں راستے ہیں اور سینکڑوں انسانوں کی آمد و رفت ہے۔ میں ہمراہی کے ساتھ ساتھ ڈرتے ڈرتے داخل ہوا۔ دروازہ پر دربان نے میرے ہاتھ میں ایک لمبا کاغذ دیا جس پر جسمانی اور روحانی عوارض کی مفصل فہرست تھی۔ اور سامنے کیفیت کے اندراج کے خانے خالی تھے۔ ہم غلام گردش سے ہوتے ہوئے متعدد کمروں کے سامنے سے گزرے جن میں عجیب عجیب قسم کے آلاتِ آہنی دھرے تھے۔ ہماری طرح اور بھی لوگ مصروفِ سیر تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں اسی طرح کے کاغذ تھے۔ آخر جب سب کمروں کی سیر ہو چکی تو ایک ڈیوڑھی پر پہنچے اور متحرک تختہ کے ذریعے اوپر کی منزل میں گئے۔ بالائی حصّہ میں بھی کئی کمرے اور ہر

کمرے میں شیشہ کے آلات رکھے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ پھرتے پھرتے پھر اسی متحرک تختہ کے قریب پہنچے۔ اور اسی کے ذریعے نیچے اُترے۔ اور اُترتے ہی عمارت کے باہر آ گئے۔ ہمراہی نے کہا اب اپنا کاغذ دیکھو۔ میں نے دیکھا کہ جسمانی بیماریوں کے سامنے اور قریباً تمام روحانی امراض کے سامنے کے خانہ میں لفظ ہاں ہاں درج تھا اور سب کے نیچے نوٹ درج تھا کہ جسم جلدی اصلاح پذیر ہو سکتا ہے اور روح بہت محنت کی محتاج ہے۔ طہارت اور صفائی کی طرف سے طبیعت میں لاپروائی ہے۔

میرے ہمراہی نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا کیفیت دیکھی ہے۔ میں نے پرچہ اس کے سامنے کیا۔ اُس نے کہا کہ عمل کا کاغذ غیر نہیں پڑھ سکتا۔ تم پڑھو ہم سنیں۔ میں نے پوچھا کہ پہلے یہ تو بتاؤ کہ اس کاغذ پر اندراجات کی صحت کس نے کی ہے کہا کہ اس عمارت میں جو مختلف آلات رکھے ہیں ان کے سامنے سے گزرتے جاتے وقت کاغذ پر تمہارے جسم کا عکس پڑ گیا۔ عیب و ثواب خود بخود ہو گئے۔ یہ کاغذ نامۂ اعمال ہے۔ اس پر تمہارے درجہ کا تعین ہو گا۔

میں نے گھبرا کے کہا کہ میرا کیا حشر ہو گا۔ میں تو معائنہ میں پورا چھوڑ ادھورا بھی نہیں اُترا۔ میں ہر مضمون میں پھسڈی ہوں۔ اُس نے کہا تم پر سلامتی ہو گھبرانے سے عمل میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ رونے سے رستگاری نہیں مل سکتی۔ تم نے ایک آسان اور عظیم موقع کھو دیا۔ اب تمہیں کٹھن منزل درپیش ہے۔ اگر کلیجہ پتھر کا اور ارادہ چٹان کا سا مضبوط کر لو۔ تو دُنیا کی منزلوں میں خریدی ہوئی مصیبت برسوں کے بعد آسان ہو گی۔ گناہ کا وہ داغ جو روح کے دامن پر دُنیا میں

پل بھر کے عرصہ میں لگ جاتا ہے۔ اس جہان میں عمریں گزرنے تک بھی دھویا نہیں جا سکتا۔ تاہم توبہ اور عمل کا دروازہ قطعی بند نہیں۔

میں نے بیتاب ہو کر پوچھا کہ میری نجات کیونکر ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا تم پر خدا کا رحم ہو۔ تمہارے ہر سوال کا جواب تمہارے اعمالنامہ کی پُشت پر لکھا موجود ہوگا۔ یہاں کسی چیز کا تجسّس درکار نہیں صرف اپنے اپنے اعمال نامہ کی پشت دیکھنا ہی کافی ہے۔ میں نے جو کاغذ اُلٹ کر دیکھا تو اس پر یہ ثبت پایا:۔

"پانچ ہزار برس تک ہر روز چھ گھنٹہ اہلِ دُنیا کے لئے امن اور سلامتی کی دُعا مانگنی چاہئے۔ اتنا ہی عرصہ روزانہ ایک گھنٹہ ورزش، دو گھنٹہ گھر کی صفائی اور جسم اور لباس کی طہارت پر خرچ کرنے ہونگے۔ اس میں ایک دن کا ناغہ نہ ہو۔ یاد رکھو صرف کوہِ ثبات ہی اس عزم میں پُورے اُترتے ہیں۔

پانچ ہزار برس کا بلا ناغہ روزانہ پروگرام دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سر میں چکّر سا آ گیا اور دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ سوچا کہ میں آسان پسند، لااُبالی، عاشق مزاج آدمی زندگی بھر ایک پروگرام کے مطابق کبھی کام نہ کیا۔ یہ کوہ کنی مجھ سے کب ممکن ہے۔ برس چھ مہینے کی بات ہوتی تو بھی کمر ہمّت باندھ لیتا۔ ایک دو سال چھوڑ پانچ ہزار برس کا معاملہ ہے۔ صبر آزما مدت ایک پروگرام کے مطابق کیسے بسر کروں گا۔ میرا ساتھی میرے پاس بیٹھ گیا اور کہا کہ اے عزیز! دُنیا گناہ میں کھوئی۔ یہ جہان اگر افسوس میں گیا تو عاقبت کا دبجز نارِ جہنّم کے کچھ قسمت میں نہ ہوگا۔ جس کا ایک منٹ مصیبت میں لاکھ برس کے برابر ہے۔ تم نے دُنیا کی زندگی کو آسان سمجھا۔ اس مصیبت میں پڑے۔ اب یہاں تن آسانی کروگے تو عاقبت میں بیش از بیش

مصیبت میں پھنسو گے۔ دُنیا نے عمل کے چند روزہ عیش اور گناہ کی زندگی کی یہ پاداش بے شک سخت ہے مگر تم اپنی گذشتہ مختصر زندگی کا اس پانچ ہزار برس کے عرصہ سے مقابلہ نہ کرو۔ اگر تم عاقبت کی تکالیف کا اس سے موازنہ کرو تو اس پروگرام کو آسان سمجھنے لگو گے۔ یقین جانو کہ دار الجزاء کا عذاب شدت میں اس عذاب سے ہزار گنا زیادہ اور دردناک ہے۔

اب وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور مجھ سے کہا آؤ۔ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ابتدا میں انسانوں کو توبہ کا یہ موقعہ میسر نہ تھا۔ روحیں حالتِ اُمید و بیم میں رہتی تھیں۔ پھر پیغمبروں اور شہیدوں کی نیک روحوں نے خدا کے حضور میں عجز و الحاح کے ساتھ عرض کی کہ گنہگاروں کو ایک لاکھ برس کی مزید مہلت دی جائے تاکہ جو کوتاہیاں دُنیا میں ہوئیں ان کی اس عرصہ میں تلافی کر سکیں۔ اور دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔ بارگاہِ خداوندی سے حکم ہوا کہ میرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ تمہاری محدود عقل میرے لامحدود علم کو نہیں پا سکتی۔ خدا کے یہ پاک بندے لاڈلے بچے کی طرح مچل گئے۔ آخر اُن کی عرض قبول ہوئی۔ دُنیا اور برزخ کا یہ نظام صرف دس ہزار برس اور قائم رہتا۔ مگر اب لاکھ برس جاری رہے گا۔ دس ہزار برس تک عالمِ ارواح کی وہ رُوحیں جو زمین کی زندگی کے لئے مختص ہیں ختم ہو چکیں گی۔ پھر نوّے ہزار برس تک یہ عالمِ ارواح قائم رہے گا۔ کچھ فکر نہ کرو۔ تمہیں بیسیوں موقعے حاصل ہیں کہ نارسے نجات پاؤ۔ ہمت نہ ہارو۔ اپنے عزمِ صمیم سے مشکل کو آسان بناؤ۔

میں نے اپنے ہمراہی کے قول کے مطابق درجہ اوّل میں ہلکے سے عذاب

ز اچکا تھا۔ اب اس سے لاکھ گنا شدید عذاب عاقبت کا دُھندلا سا تصور میرے
ن میں آیا۔ میں اس عزم شکن عرصہ کی مہلت کو غنیمت جان کر اُٹھ کھڑا ہوا۔
ر گرد دیکھا، دارالمعائنہ سے لوگ نکل رہے تھے۔ ان میں سے بعض کے چہروں
ہشت برس رہی تھی۔ بعض کے بشرے خوشی سے گلاب کی طرح کھل رہے
۔ ایک صاحب جو خوشی سے شادی مرگ ہوئے جاتے تھے، میرے قریب
گزرے۔ میں نے کہا۔ او بھائی جانے والے۔ کہو کاغذ پر کیا لکھا پایا۔ کہا کہ
کے رحم کو اپنی اُمید سے زیادہ پایا۔ میں تھا تو فاسق و فاجر مگر ایک عمل خدا
حضور میں پسند آیا۔ جس سے میرے گوناگوں گناہوں کو معاف کر دیا اور
ہوا کہ مجھے درجہ دوم میں رکھا جائے۔ فرشتے مجھ پر ہزار سال رحمت بھیجیں اور
غم میرے پاس نہ آنے پائیں۔

میرا ہمراہی یک بیک اس کی طرف لپکا اور شہید شہید حضرت شہید پکار اُٹھا
کی پیشانی پر بوسہ دیا اور آغوش میں لے لیا۔ ان کی طفلانہ خوشی اور گرمجوشی
دیکھ کر میں اپنی پریشانی کو بھول گیا۔ ان کے پاس دریافتِ حال کو جا کھڑا ہوا۔
ے ہمراہی نے میرا مطلب پا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور پاس ہی
خوبصورت درخت کے خوشگوار سایہ میں لے گیا۔ جہاں بیٹھنے کے لئے
لی تخت بچھے ہوئے تھے۔ اس نے بیٹھتے ہی پوچھا کہ تم پر سلامتی ہو۔ یہ
لسیم تم نے کیسے پایا۔ پل بھر تو ہم بڑے اطمینان سے وہاں بیٹھ گئے۔
چند دوست سیر کے لئے آئے ہیں اور لطفِ محبت اُٹھا رہے ہیں۔ ہوا اٹکھیلیاں
تھی۔ پتے گویا خوشی میں آ کر تالیاں بجاتے تھے سرخ زریں پرندے درختوں

پر بیٹھے نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ لیکن راحت و آرام کی اس فضا کو دیکھ کر میرے دل میں پھر اک ہوک سی اُٹھی۔ اپنی سیاہ کاری اور اس کے انجام کی اطمینان سوز یاد نے مجھے ماہیِ بے آب کر دیا۔ اور انگاروں پر لوٹا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر صحرا کی طرف نکل جاؤں۔ مگر اس نووارد نے اپنا قصہ آغاز کیا۔

عالمِ مثال میں پاک رُوحوں کی دلچسپ گفتگو

ایک خادمِ خلق کی کہانی

میں نے ابھی عمر کی ۲۵ بہاریں دیکھی تھیں۔ مستِ شباب تو تھا ہی شغلِ شراب نے انجام فراموش کر رکھا تھا۔ بزرگوں سے وراثت اس قدر پائی تھی کہ عشرت کے سارے سامان خرید کر بھی قلاش ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔ فکرِ معاش سے آزادی کیا کم دولت ہے۔ جہاں سرمایہ کی فراوانی ہو۔ وہاں دماغ کیسے ٹھکانے رہے۔ قمار خانوں میں میرا شہرہ اور حسینانِ خود فروش کے بالاخانوں پر میرا چرچا تھا۔ ساز و سرود رات دن کا شغل تھا۔

والدِ مرحوم نے دریا کے کنارے ایک خوشنما اعلےٰ مکان تیار کرایا تھا۔ یہ جگہ دل پسند تھی۔ برسات کا موسم تھا۔ ایک دن ٹھنڈی ہوائیں چلیں۔ گھٹائیں جھوم کے اُٹھیں۔ بادل دل کھول کر تھوڑی دیر تک برسا۔ پھر مطلع صاف ہو گیا۔ میں اس مکان کے بالائی حصے میں مست سرود بیٹھا تھا۔ ساز اور آواز آپس میں مل مل جاتے تھے۔ یونہی دوپہر ڈھل گئی۔ ابر کا ایک ہلکا سا آوارہ ٹکڑا آفتاب کے

چہرہ پر چھا گیا۔ افقِ مشرق پر خوشنما قوس وقزح نمودار ہوئی۔ گویا کوئی نیلی پوش حسین ساڑھی میں گوٹا کناری ٹانکے کھڑا ہے۔

میں نے شغلِ طرب چھوڑا اور چھت پر چڑھ کر آسمان کا نکھار دیکھنے لگا۔ دریا بہاؤ پر تھا۔ پانی کناروں سے اچھل اچھل پڑتا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں ایسی طغیانی اور اتنا پاٹ نہ دیکھا تھا۔ ابھی پانی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں، ایک ملاح ہلکی کشتی پر بہت سی سواریاں لئے آرہا ہے۔ دریا کی موجیں ایک دوسری سے ٹکرائیں اور بھنور بنا۔ کشتی گرداب میں پھنسی۔ ملاح نے بہتیرا سنبھالا۔ مگر کچھ پیش نہ گئی۔ ادھر میں بھی ہمہ تن متوجہ تھا۔ کھڑا کھڑا فرطِ اضطراب سے دوہرا ہو گیا۔ اور پکارا سنبھل سنبھل۔ مگر کشتی نہ سنبھلی۔

الٰہی! میلوں کا پاٹ بانسوں کی گہرائی۔ ڈوبنے والے ہاتھ پاؤں مارتے تھے اور امداد کے لئے پکارتے تھے۔ وہ بیکسی کا منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ رحم، رحم، خدایا رحم کہتا ہوا میں حوصلہ کرکے پانی میں کودا۔ اور شیر کی طرح دریا کے جگر کو چیرتا ہوا کشتی تک پہنچا۔ سواریوں میں بعض تیراک تھے۔ وہ جان بچا کر ساحلِ سلامتی پر پہنچنا چاہتے تھے۔ میں زور سے پکارا کہ نامردو عورتوں اور بچوں کو منجدھار میں چھوڑے جاتے ہو۔ کچھ غیرت مند پلٹے۔ باقیوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اس وقت ایک ایک کا سنبھالنا مشکل تھا۔ میں نے دو بچوں اور ایک عورت کو سنبھالا، اور لے چلا۔ کچھ دور جا کر معلوم ہوا، بوجھ قوتِ برداشت سے بہت زیادہ ہے۔ کنارہ ابھی دور تھا۔ دل نے ہمت تو نہ ہاری مگر مصلحت نہ مانی۔ مجبوراً ایک لڑکے کو خدا کے حوالے کرنا پڑا۔ وہ ڈوبنے لگا۔ ایک دفعہ عاجزی

اور حسرت سے میری طرف دیکھ کر پکارا۔ کہ آپ مجھے نہ بچائیں گے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرطِ رحم نے دو اور جانوں کی ذمہ داری سے غافل کر دیا۔ میں نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کو بھی اُٹھا لوں۔ پھر خیال آ گیا کہ اس بارِ عزیز کو تو جان بوجھ کر پھینکا ہے۔ اِک جگر پاش آہ نکلی۔ اُس نے مجھے حسرت سے، میں نے اُسے رحم سے دیکھا۔ اس نے غوطہ کھایا اور لاکھوں من پانی اس کے اُوپر سے گزر گیا۔

اتنے میں مَیں نے اپنے وفادار ملازم کی آواز قریب پانی میں سُنی کہ اے آقا میں آ گیا ہوں۔ میں نے کہا گل نواز اس لڑکے کو جلدی لینا۔ لڑکا اُبھرا۔ ہاتھ پاؤں مارے، چیخا، دوسرا غوطہ کھانا چاہتا تھا کہ گل نواز تیر کی طرح پہنچا پھُول کی طرح لڑکے کو اُٹھا لیا۔ اور ہم سہمی ہوئی جانوں کو لے چلے۔ گل نواز بولا۔ آقا۔ تم بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیر کر کنارے آؤ۔ میرا بوجھ کم ہے۔ میں دریا چیرتا چلتا ہوں۔ میں نے کہا جلدی کنارے پہنچو۔ تاکہ جلدی واپس آئیں۔ شاید کوئی اور جان بچ سکے۔ ہم دونوں جلدی جلدی دریا چیرتے پار ہوئے۔ بچے ڈرے ہوئے دریا سے دُور جا کھڑے ہوئے۔ عورت نے سو دعائیں دیں۔ میں نے جو دریا کی طرف نظر اُٹھائی دوسروں کو جو پہلے تیرتے تھے ڈوبتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ تیرنے میں پورے مشاق نہ تھے۔ میں دیکھتے ہی پانی میں کُودا اور کہا گل نواز! آؤ ان کو بھی بچاؤ۔ اس نے کہا۔ آقا۔ میں آیا۔ وہ جواں ہمت بوڑھا ایسا شہ زور تھا کہ شیر کی طرح سیدھا بڑھتا آیا۔ گو میرے پیچھے پانی میں قدم ڈالا تھا لیکن مجھ سے پہلے پہنچا اور ایک ڈوبنے والے کو سہارا دیا۔ میں بھی زور لگا کر پہنچا۔ دوسرے

میں نے بچایا۔ اب ہم سوئے ساحل چلے ۔ راحت اور آرام کے حصول میں میں
ریا دل تھا۔ روپیہ پیسہ کو اس کے لئے پانی کی طرح بہاتا تھا ۔ لیکن اس وقت
جھے وہ اطمینانِ قلب نصیب تھا۔ اور ایسی سچی خوشی حاصل تھی جو دولتِ دُنیا دے
ر میسر نہ آسکتی تھی ۔ میں وفورِ مسرت میں کہنے لگا ۔ گل نواز ساحل پر پہنچ لیں
تجھ کو اتنی دولت دوں گا کہ تیری اولاد بیٹھی کھائے گی ۔ یہ سُن کر وہ رو دیا۔ اُسے
یکھ کر میں بھی آبدیدہ ہو گیا ۔ دونوں کو پریشانی تھی ۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں
تھا جو انعام کی خاطر جان خطرے میں ڈال دیتے ہیں ۔ بہادر اور شریف
کے لئے کوئی انعام کافی بھی کیونکر ہو سکتا ہے ۔ اسے افسوس ہوا کہ میں نے
سے ایسا سمجھا ۔ مجھے شرم آئی میں نے کیا کہہ دیا۔ اسے کلام کا یارا نہ رہا۔ مجھے
س کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ گو بظاہر تیرتے جا رہے تھے
یکن دراصل دریائے حیرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے ۔

اب کچھ دُور چل کر معلوم ہوا کہ سانس پھُول رہے ہیں ۔ میں نے ہمت
کر کے رفتار تیز کر دی ۔ پانچ دس قدم گیا تھا کہ بوجھ پہاڑ معلوم ہوا۔ خود غرضی نے
کہا جان ہے تو جہان ہے ۔ ایک تو دوسرے کی جان بھی نہ بچائی اور اپنی بھی ساتھ
گنوائی ۔ یہ کہاں کی دانائی ہے ؟ غیرت بولی جس کو سہارا دیا اس کو پار نہ اُتارا۔
یہ کیسی بھلائی ہے ۔ تہور مصلحت پر غالب آیا۔ خود غرضی نے غیرت سے شکست کھائی۔
نتیجہ سے آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا آخری زور لگایا۔ کنارہ قریب رہ گیا
میرا دم ٹوٹ گیا۔ اور جسے بچا رہا تھا ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھُوٹ گیا۔ اس میں کسی
قدر سکت باقی تھی ۔ وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا ۔ میں غوطے کھانے لگا۔ قسمت کے

کھیل ہاتھ پاؤں مارتے اس کے پاؤں زمین پر جا لگے ہیں کنارے سے اور الگ ہوتا گیا۔ جو ڈوب رہا تھا۔ وہ بچ نکلا اور جو بچانے آیا تھا وہ ڈوب چلا۔ آخری غوطہ کے قبل میں نے دیکھا کہ تماشائیوں کی اس مختصر جماعت میں جن کو ابھی بچایا تھا۔ اضطراب عظیم پیدا کیا ہے۔ بچے بلک بلک کر میری سلامتی کے لئے "یا خدا رحم" "یا خدا رحم" پکار رہے ہیں۔ عورتیں دامن پھیلائے دعا مانگ رہی تھیں۔ مرد سربسجود تھے۔ گل نواز نے میرا حال دیکھا۔ چیختا ہوا پانی میں کودا۔ یہ آخری نظارہ تھا جو میں نے روئے زمین پر دیکھا۔ لوگ مضطرب تھے۔ میں مطمئن۔ کہاں مجھ سے فاسق و فاجر، کہاں یہ شاندار موت۔ مجھے اس کا کبھی وہم نہ گزرا تھا۔

میں سطح آب کے نیچے اور قعر دریا کے درمیان بہ رہا تھا۔ کروڑوں من پانی میرے سر سے بہ گزرا۔ چلتے پانی کی آواز میرے کان میں ایسی معلوم ہوتی جیسے دور سے آبشار کا شور۔ میں شاید کچھ سیکنڈ بیہوش رہا ہوں گا جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک کشتی میں سوار پایا۔ یہ کشتی زیر آب تیر رہی تھی۔ ناخدا سفید رنگ سبز پوش بزرگ تھا جس کے پاس نہ چپو نہ پتوار۔ نہ یہ آبدوز معلوم ہوتی تھی نہ اس میں انجن تھا نہ مشین، مگر یہ دور تک پانی میں خود بخود بہتی جا رہی تھی۔ میں نے متعجب ہو کر ناخدا سے پوچھا۔ میاں ملاح یہ تیری ناؤ نادرِ روزگار ہے کہ زیر آب بہہ رہی ہے مگر دامن تر نہیں ہوتا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ صاحب دنیا کے نیکوکاروں سے غریب تر نہیں کہ معصیت کے سمندر میں برسوں بسر کرتے ہیں مگر دامن آلودہ نہیں ہوتا۔

وہ گفتگو سے بڑا عالی مرتبت معلوم ہوا۔ اب میں نے ادب سے پوچھا۔

اے مردِ عالی مقام آپ کا نام۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا گمنام۔ میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کشتی کو تھپکی دی۔ وہ بلند ہو کر سطحِ آب پر آئی۔ میں نے کنارے کے قریب سفید پوش زریں کمر لوگوں کا ہجوم پایا۔ جنہوں نے مجھے دیکھتے ہی خوشی کے نعرے بلند کیئے۔ میں تھوڑی دُور پایاب پانی میں چل کر خشکی پر آیا۔ اب اس ناؤ کی طرف نظر اُٹھائی تو وہ ویل مچھلی تھی۔ جو مع سوار کے فوراً تڑپ کر گہرے پانیوں میں جا رہی۔ میں نے خیر مقدم کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور ایک شخص نے مجھے ہمراہ لیا۔ ہم دونوں ساحل سے دارالمعائنہ کو سدھارے۔ میری مجال نہیں کہ خدا کے انعامات کی ناشکری کروں۔ مگر میرے لئے تو اس موت کی مسرتِ بے پایاں میں ہی انعام موجود ہے۔ معلوم نہیں کہ بہشت میں اس سے زیادہ اور کیا مل سکتا ہے۔"

وہ کہانی ختم کر چکا تو خدا جانے میں کتنی دیر اس کی نیک انجام زندگی کے تصور میں محو رہا۔ کاش ایسی مَوت مجھے بھی نصیب ہوتی۔ اس خیال کے آتے ہی ایک آہ نکلی۔ آنکھیں حسرت کے آنسوؤں سے ڈُبڈبا گئیں۔ میں یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ دوزخ کے ایندھن کا بہشت والوں کے پاس بیٹھنا اپنی مصیبت کو بڑھانا ہے۔ کسی اور سمت جاؤں، شاید اپنی طرح کوئی مصیبت زدہ پاؤں۔ اُس کے دُکھڑے سُنوں۔ آپ بیتی سناؤں۔ ان ہمراہیوں کی ہم جلیسی کو بیگانوں کی صحبت سمجھ کر بیگانوں کی تلاش میں چل دیا۔ حیاتِ مستعار میں اپنے عصیاں کی چند روزہ طغیانیاں یاد آئیں۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ میں چلتا چلتا ٹھہر گیا۔ کسی کے پاؤں کی کچھ آہٹ سی پا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو وہی پہلا

ساتھی سایہ کی طرح ساتھ آتے پایا۔ کہا مردِ خدا کب تک پیچھا نہ چھوڑو گے۔ بولا کہ تم پر سلامتی ہو۔ بحکمِ خدا مامور ہوں۔ غروبِ آفتاب تک ساتھ ہوں۔ ابھی اپنے مکان میں جاؤ تو میں آزاد ہوں۔ اگر ساتھ ناگوار ہے تو بیشک یہ جگہ دیکھو بھالو۔ شام سے پہلے مجھے آکر یہیں ملنا۔ نگرانی مقصود نہیں۔ تمہارا آرام منظور ہے۔ تاکہ تم سلامت منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ۔ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو بتاؤ اب کیا ارادے ہیں؛ میں نے کہا یہی کہ کوئی اپنا سا پاؤں۔ اس کی سنوں اپنی سناؤں۔ اُس نے کہا اپنے جیسے لوگوں میں ہزار سال رہنا ہوگا۔ ان کی زبونِ حالی رات دن دیکھنی سُننی ہوگی۔ چند گھنٹوں کی فرصت کو غنیمت جانو۔ عالمِ بالا کے ساکنوں سے ملو۔ اِن کی نیک زندگی کے حالات سُنو۔ تاکہ توبہ پر طبیعت قائم رکھ سکو۔ گو من نہ مانتا تھا مگر مصلحت اندیش عقل کو یہ بات پسند آئی۔ دل کو کڑا کر کے ایک بشاش مجمع کے قریب جا کھڑا ہوا جو اپنے اعمال اور انعام کو بیان کر کے خوش ہو رہے تھے۔ جب میں پہنچا تو ایک بوڑھے شخص نے اپنا ماجرا یوں کہا۔

معلّم کی کہانی

"صاحبو! میں ہندوستان جنّت نشان میں متمدّن آبادی سے دُور ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ جہاں دھڑے بندی لوگوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ لوگ جاہل تھے اور کینہ توز۔ میرے والدین کسی فتنہ و فساد میں شامل تو نہ ہوتے تھے ہاں انہیں کفو اور کُنبہ کی فوقیت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ان کا پیشہ زراعت تھا۔ لیکن آمدنی محدود تھی۔ میری تعلیم میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ تاکہ میں قرآن د

مائل ہیں ممتاز ثابت ہوں۔ ماں اور باپ میں محبت کے ساتھ ساتھ تفوق کا یہ جذبہ بھی تھا جس کی وجہ سے وہ خود تنگی ترشی میں بسر اوقات کر کے بھی میری ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ ان کی پندرہ برس کی محنت بر آئی۔ میں ایم۔اے میں اوّل آیا۔ ملک میں تعلیم کم تھی۔ جگہ جگہ سے ملازمت کے لئے میری طلبی ہونے لگی۔ سورت کے ایک تاجر نے دو ہزار روپیہ ماہوار کی پیشکش کی۔ والدین باغ باغ تھے۔ لیکن خدا کی مرضی کہ اسی سال طاعون ملک میں پھوٹا۔ ماں باپ نے انتقال کیا۔ اور میں ان کی شفقت اور خدمت سے محروم ہو گیا۔

اس صدمہ نے طبیعت کو دنیا سے اچاٹ کر دیا۔ چاہا کہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی حمد و ثنا میں عمر بسر کر دوں اور اس دنیا سے کچھ مطلب نہ رکھوں۔ زمانے نے دھیرے دھیرے اس زخم کو مندمل کیا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ خدا تو حاجات سے بالا، صفت و ثنا سے ماورا ہے پھر جس ذات بے ہمتا کے لئے جن و ملک، زمین آسمان، سورج اور چاند، ستارے اور سیارے سجدہ ریز ہیں۔ اگر میں اس کے سامنے تا قیامت بھی سر بسجود رہوں۔ اس کی شان میں کیا اضافہ ہوگا۔ کیا میرے لئے مناسب نہ ہوگا کہ میں حاجت مند مخلوق کے کام آؤں اور مشکل میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ خدا اس طرح خوش نہیں ہوتا کہ دنیا میں اس کا نام ورد زبان رہے۔ بلکہ اسے خوش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے بندوں کی مدد کی جائے۔ مخلوق کے کام آنا خالق کی خدمت کے مترادف ہے۔ میں نے یہ سوچ کر فیصلہ کیا کہ آؤ زندگی کی ایک حقیر سی ابتداء کریں۔ علم کی جو دولت مجھ کو ملی ہے اس سے دنیا کو بھر دیں۔ اور فرقہ پسندی کا مرض جو ملک میں موجود ہے اس کا قلع قمع

کردیں۔ چنانچہ میں نے گاؤں کے باہر ایک مسجد میں ابتدائی مکتب کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں پاس کے علاقہ کے ایک زاہدِ شب زندہ دار نے مجھے فرزندی میں قبول کرنے پر اصرار کیا۔ اللہ جانے سسرال والوں نے کیا مصلحت سمجھی۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کی ٹھہرائی۔ میں نے یہ سوچ کر قبول کر لیا کہ زندگی کی کٹھن منزل میں ایک اکیلا دو گیارہ ہیں مشترکہ کوشش سے بڑی مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے بیوی کو خوشی خوشی گھر لایا۔ لیکن جلد معلوم ہو گیا کہ بیوی کیا ہے مصیبت ہے۔

اس نے مکتب کے اجراء کی خبر سنی، اپنے بال نوچے، میری داڑھی پکڑی کہ بھلے ہو تو ٹھنڈے ٹھنڈے صورت سدھارو۔ ورنہ کچھ چاٹ مرونگی یا کسی طرف نکل بھاگوں گی۔ میں شماتتِ ہمسایہ کے خوف سے آہستہ آہستہ بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ آسمان سر پر اٹھاتی اور ہمسایوں کو بلاتی تھی۔ شور و شغب سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ بڑی تشہیر ہوئی۔ میں پیچھا چھڑا کر اندر جا لیٹا اور دروازہ کو قفل لگا دیا باہر درد طوفان تھا۔ وہ تھک کر واویلا سے رکی۔ لوگ کام کاج کو گئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جونہی سر نکالا وہ تاک میں بیٹھی تھی۔ کمبخت کہہ کر بولی اچھا میں پھر دیکھ لونگی۔ جب وہ سو گئی تو میں رات کے اندھیرے میں باہر نکلا۔ مسجد میں جا کر قضا نمازیں ادا کیں۔

عقل نے کہا عورت کی مان لو۔ ایمان بولا، کارِ خیر میں عجلت کرو۔ خدا کی امداد خواہ دیر سے آئے۔ آتی ضرور ہے۔ میں نے بھی ہارے نہ ہمت ہارے نہ رام ؑ کے مقولہ پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ صاحبو! میں اپنی داستان درد مختصر کہتا ہوں طولِ بیان سے کچھ فائدہ نہیں۔ غرض ہزار خواری اور لاکھ

زاری کے بعد اُس نیک بخت نے اس شرط پر میرے عزم میں حائل نہ ہونا قبول کیا کہ وہ پاؤں پسار کر سوئے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے۔ کام کاج کوئی باندی کر دیا کرے ماننے کو تو مان گیا۔ مگر بلا معاوضہ باندی کہاں سے لاتا۔ والدِ مرحوم کی ساری عمر کی محنت کی کمائی ایک ہزار روپیہ نقد اور کچھ زمین تھی۔ ایک ہزار کی زندگی بھر میں قیمت کیا۔ کھیتی خصم سیتی۔ زمین کی کاشت غیروں سے کرائی، آدھی رہ گئی۔ جس سے نان و نفقہ مشکل سے چلتا تھا، باندی رکھنے کی استطاعت کہاں۔ لاچار میں نے سوچا کہ اپنے پاؤں دھوتی رانی باندی نہیں کہلاتی۔ گھر کا کام کرتے مجھے کیا عار ہے۔ چنانچہ شام کو پانی لانے، رات کو چکی پیسنے لگا۔ صبح اندر باہر صفائی کرتا۔ آگ جلاتا۔ کھانا پکاتا۔ خود کھاتا اور اس کو کھلاتا۔ پھر بچوں کو سبق دینے چلا جاتا۔ مگر اس بی بی کو مجھ پر اور میرے حال پر رحم نہ آتا۔ میں نے یہ کہہ کر دل کو تسلّی دی کہ نوکر، عورت، اولاد قسمت سے ہی اچھے ملتے ہیں۔ میرے لئے یہی مقدّر تھا جو مل گیا۔

ایک دن بھادوں کی شام کو میں پانی بھرنے گیا تو مطلع صاف تھا۔ گھڑا بھرتے بھرتے ایک بادل سا اُٹھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے چھاجوں پانی برسنے لگا۔ میرے کپڑے بھیگ کر شرابور ہو گئے۔ کپڑے بدل رہا تھا کہ ہوا لگ گئی۔ تپ چڑھ آئی۔ حدّتِ بخار سے بیہوش سا ہو کر پڑ گیا۔ اس نیک بخت گھر والی نے نہ کھانا پوچھا نہ پانی۔ شاید میں کچھ بولا بڑبڑایا ہوں گا کہ رات کے بارہ بجے اس نے پوچھا کیوں کیا ہے؛ میں نے جواب دیا۔ بخار۔ وہ یہ کہہ کر کہ میرے سر میں بھی درد ہے۔ خرّاٹے لینے لگی۔ قریب تین بجے شدّتِ عطش سے زبان تالو میں

لگ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مصلّیٰ پر کھڑی نمازِ تہجّد ادا کر رہی ہے۔ اس نے سلام پھیرا تو میں پکارا۔ اے بی بی، ذرا پانی دینا۔ وہ اُٹھی ہاتھ اُٹھائے اور یہ کہہ کر نیّتِ نماز باندھ لی کہ میں نماز پڑھ رہی ہوں۔ اُٹھ کے لے لو۔ میں لڑکھڑاتے اُٹھا۔ پانی پیا اور صبر شکر کیا۔ چار بجے میرا کندھا ہلا کر بولی کہ صبح کے لئے آٹا تو ہوگا شام کے لئے نہیں ہوگا۔ غرض یہ تھی کہ سوتے کیوں ہو۔ پیستے کیوں نہیں۔ میں حیران کہ الٰہی کس بے رحم سے پالا پڑا ہے۔ صبح ہوئی، بخار ہلکا ہوا۔ تیمم کیا۔ نماز پڑھی۔ کچھ کسل سی تھی، ذرا لیٹ گیا۔ اس نے جو آ جھنجھوڑا کہ تمہیں بخار ہوگا مجھ کو تو کوئی مرض نہیں پیٹ کا دوزخ کسی نہ کسی طرح بھرنا ہے۔ اُٹھو آگ جلاؤ۔ کھانا پکاؤ۔ یہ کام کئے سے ہوگا۔ آج جی میں آیا کہ خوب صلواتیں سناؤں۔ اس پر ہاتھ اُٹھاؤں گھر سے نکال دوں۔ مگر اس چنڈال سے ڈر آیا کہ چیخے گی چلّائے گی محلّہ بھر کو سر پر اُٹھائے گی۔ جو سُنے گا ہنسے گا۔ جگ ہنسائی کے خیال سے پھر خاموش ہو رہا۔ جوں توں کر کے کھانا پکایا۔ اس نے کھایا۔ میں نے خدا کا شکر کیا۔ اور مکتب کا راستہ لیا۔

آج مکتب سے جلدی فارغ ہو کر چلا آیا۔ پہلے پانی لایا۔ پھر دروازے کا قفل لگایا۔ پھر چُپ رہا۔ شام کو کہا کہ اب کوئی ملازمہ رکھ لینی چاہئے۔ وہ بولی کہ گھر کا کام ہو ہی رہا ہے۔ جو روپیہ اس کو دوگے وہ کسی اور کام آئے گا۔ اب اس کے سامنے بولے کون۔ جو بولے سو بُرا۔ صبر کیا۔ چُپ رہا۔ تین برس کے بعد خدا نے فرزند عطا کیا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ مگر بیوی کا مزاج اور بگڑنے لگا۔ کہنے لگی۔ چند سال کی تیری خوشامد ہے۔ پھر میرا لال جوان ہو جائے گا۔ بہتیرا کما

ے گا۔

میرے ایک شاگرد کی والدہ جو باوجود عسرت زدہ ہونے کے محلہ بھر کی ممدوح
در مخدوم تھی۔ ہر ایک سے میٹھا بولنے والی اور بُرے وقت میں ہر کس و ناکس
کے کام آنے والی تھی۔ ایک دن اس کے کان میں میری گھر والی کے اعمال کی
بھنک جو پڑی تو بچاری ناصح مشفق بن کر آئی اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بولی
ی بی رحیمن، خدا اس گاؤں کے لوگوں سے بچائے۔ کل ایک ڈومنی آئی، بولی،
ی بی کچھ سنا۔ میں نے پوچھا کیا؟ کہا کہ آپ کے لڑکے کے اُستاد کے گھر آئے دن
وہ کم چخ مچتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ میں نے کہا زباں دراز، وہ نیک باپ کی
بیٹی۔ اچھے خاوند کی بیوی بھلا لڑائی جھگڑا کیونکر گوارا کر سکتی ہے، کیا اس کو
اتنا بھی علم نہیں کہ خاوند کی خدمت سے خدا خوش ہوتا ہے۔ مخلوق سے محبت خالق
کے رحم کا باعث بنتی ہے، یہ نماز روزے بدوں خدمتِ خلق کس کام کے، یہ
عبادت گزاریاں حسنِ سلوک کے دوش بدوش رہیں تو کچھ معنی رکھتی ہیں۔ ورنہ پتھر
دلوں کے سجدے بے سُود اور سر زمین پر مارنے کے برابر ہیں۔

پہلے تو وہ چُپکے سُنا کی۔ پھر غصے سے تھرّائی اور اس طرح پنجے جھاڑ کر اس
کے پیچھے پڑ گئی کہ بچاری کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ کچھ نہ پوچھو کیا کیا کچھ کہا۔ یہ بس
سوچ میں تھی کہ ٹھہرے یا بھاگے۔ اسے بڑی مصیبت کا سامنا تھا جس منحوس وقت
میں نصیحت کرنے کا خیال آیا تھا اُسے کوستی ہو گی۔ خوشی کے گھوڑے پر سوار آئی
تھی شرمندہ و نادم آہستہ آہستہ لوٹنے لگی۔ وہ بھی بولتی بکتی گھر کے دروازے تک
پہنچا کے واپس آئی۔ میں اندر ہی تھا۔ سب کچھ دیکھا سُنا۔ دم نہ مارا۔ تاہم

اس نے مجھے سنانے کو کہا کہ کیسے گنہگاروں کا گاؤں ہے کہ کم بخت روزہ و نماز کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ اور خلقت کی خوشامد کو بڑا گُن جانتے ہیں۔

صاحبو! یہ کتھا میں نے اس لئے سنائی ہے کہ آپ کو میرے کام کی مشکلات کا تھوڑا سا اندازہ ہو جائے۔ جس خاوند کی زوجہ رفاقت نہ کرے وہ کوئی معرکے کا کام خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتا۔ جس مرد کی عورت ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچے اس سے بامِ ترقی پر پہنچنے کی کوئی کیا اُمید کرے۔ عورت کا خمیر مایہ مٹی سے گو مرد کی طرح ہی اُٹھایا گیا مگر عناصر کی ترکیب میں وہ مرد سے جُدا معلوم ہوتی ہے۔ وہ نار اور نُور دونوں کی طرفہ معجون ہے۔ اس میں خاکستر کر دینے کی خاصیت بھی ہے اور تاریکیوں کو دُور کرنے کی صلاحیت بھی۔ اس کی نال پھوٹی یا تو شیطان سے ہے یا فرشتوں سے۔ جب تک یہ دو متضاد وصف جھجک اور شرم کے پردوں میں مستور رہیں وہ عارضی طور پر انسان ہے ورنہ دونوں میں سے ایک۔ اگر علوی سرشت بیدار ہے تو زہے قسمت۔ دونوں مستقل خصلتیں خوابیدہ ہوں تو بھی خیر ہے۔ انسان کا انسان سے نباہ آسان ہے۔ میاں بیوی کی نبھ جائے گی۔ اگر سرشت میں سفلی عناصر کا غلبہ ہے۔ تو خدا کا دامن بندہ نواز ہو۔ بیچارے مرد کو کہاں پناہ ہے۔ شیطان صرف لاحول سُن کر بھاگ جاتا ہے مگر یہ بلا تو دُعائے سریانی سے بھی نہیں ٹلتی۔ عورت کی فطرت کی بوقلمونیوں سے ناواقف لوگ اس لئے مجھے کاٹھ کا اُلّو اور مٹی کا مادھو کہتے تھے کہ میں زبان ہلا کر سمجھاتا نہ تھا اور ہاتھ اُٹھا کر ڈراتا نہ تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ بدخُو عورت سے جھگڑا کرنے کی نسبت سانپوں سے کھیلنا کم خطرناک ہے خیر یہ تو

چار دیواری کی سرگزشت تھی۔ اب باہر کی کیفیت سنئے:۔
میرے اعزہ و اقارب جُوں جُوں اعلےٰ عہدوں کے لئے مجھے دعوتیں آنے کا حال سنتے تھے حسد سے جلتے تھے۔ جب میں نے ملازمت کا ارادہ ترک کر کے خدمتِ خلق کا فیصلہ کیا۔ اُنہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب گھر کی فضیحت سُنی تو سمجھے کہ اس میں حقیقی فضیلت کچھ نہیں۔ صرف گدھے پر کتابیں لدی ہیں لیکن صرف اس ڈر سے میری حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ مبادا میں ارادہ بدل لوں اور ملازمت یا تجارت کا سلسلہ اختیار کر کے ممتاز زندگی بسر کرنے لگوں۔ اب جو میری کوششوں کو بار آور ہوتے دیکھا تو رخنہ اندازیاں شروع کیں۔ گاؤں کے باہر سنگِ سُرخ کی ایک وسیع ویران مسجد تھی جس کے اِردگرد کوڑا کرکٹ کے ڈھیر بہانے والوں کے حسنِ مذاق کا نوحہ کر رہے تھے۔ مسجد کی بیرونی دیوار امتدادِ زمانہ سے گر چکی تھی۔ اور کنواں کوڑے کرکٹ سے پٹ گیا تھا۔ یہاں میں نے مکتب کھولا۔ تو پہلے شب و روز کی محنتِ شاقہ سے کوڑا کرکٹ اُٹھا اُٹھا کے متصل کے کھیتوں میں ڈالا۔ اُدھر کھیتیاں زر اُگلنے لگیں۔ اِدھر مسجد پر نُور برسنے لگا۔ جو مسافر تھکن سے چُور چُور آتا۔ ذرا مسجد میں نماز کے لئے ستاتا تو مسرور ہو جاتا۔ ایک دن ایک سوار شدّتِ گرما سے بے تاب آیا۔ ایک طالب علم نے گھوڑا تھاما۔ میں نے محبت سے پاس بٹھایا۔ ایک دوسرے لڑکے کو گاؤں بھیجا کہ ٹھنڈا پانی لائے۔ گاؤں ذرا دُور تھا۔ قدرتی طور پر کچھ دیر لگی۔ مسافر کی زبان پیاس سے تالو کو لگ رہی تھی۔ جو گرم پانی موجود تھا اس نے اسی کو غنیمت سمجھ کر پی لیا۔ پھر کہا اس پتھر کی عمارت کو تم نے شیشہ بنا دیا۔ مگر پانی کا کچھ انتظام نہ کیا۔ میں

نے کہا۔ اتنی مقدرت نہیں کہ کنواں کھدواؤں۔ اُس نے کہا میں ایک غریب پٹواری ہوں اور بال بچے سے محروم ہوں۔ یہ تین ہزار روپیہ میری عمر کی کمائی ہے۔ یہ نذر ہے تاکہ کنواں کھدواؤ اور اس مسجد کے آس پاس گھماؤں اراضی وقف ہے۔ اس میں جس قدر ہوسکے باغ اور سایہ دار درخت لگاؤ، تاکہ جو آئے آرام پائے۔

میں نے محنت کی، لڑکوں نے ہاتھ بٹایا۔ صرف دوسو روپیہ کے خرچ سے پٹا ہؤا کنواں صاف ہوگیا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کی دھار بہنے لگی۔ سایہ دار درخت تیار ہونا کافی وقت کی بات تھی۔ اب مجھے خیال آیا کہ خیرات کا روپیہ اور وقف کی زمین بیکار کیوں رہیں۔ میں نے ایک بیل خریدا اور ایک ملازم رکھ کر رہٹ بنایا۔ ہل چلایا۔ زمین کا جگر چیر کر ایک طرف پھلواڑی لگائی۔ دُوسری طرف سبزی ترکاری لگائی۔ آہستہ آہستہ پانچ برس کے اندر وہ جگہ جہاں خاک اڑتی تھی رشکِ ارم بن گئی۔ سبز درختوں میں سُرخ نارنگیاں بہار دِکھانے اور ہوا میں گلاب اور چنبیلی کی کیاریاں عنبر بکھیرنے لگیں۔ زنگا رنگ کے طیور میٹھی بولیاں بولنے لگے۔ یہ باغ نہ تنہا نظر افروز تھا۔ بلکہ دولت خیز بھی تھا۔ برسوں کی خالی زمین میں بیج جو پڑا، ایک دانہ کے ہزار ہوئے۔ باوجود ابتدائی خرچ اور مشکلات کے پانچ برس کے بعد میرے پاس دو ہزار روپیہ جمع ہوگیا۔ ابھی اراضی کے تیسرے حصّے میں زراعت ہوئی تھی۔ پانی کم تھا۔ دو اور کنویں ہوتے تو ساری زمین سیراب ہوجاتی۔ روپے کی جھولیاں بھری جاتیں۔ چنانچہ میں نے دو اور کنویں بنانے کا ارادہ کیا۔

ایک روز بچوں کو سبق دے رہا تھا۔ وہی مردِ مخیرّ آیا۔ اُسے مجھے دیکھ کر
اور مجھے اُسے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے باغ کے تمام میوے اُس کے
سامنے رکھے۔ وہ بولا یہ کیا؟ میں نے کہا آپ کی نیت کا پھل۔ وہ ساری کہانی
سُن کر مسرور ہُوا اور بولا، میں بھی دو برس کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ جی چاہتا ہے
تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ میں نے اس کی رفاقت کو غنیمت جانا اور شکریہ ادا کیا۔ پانچ
ہزار روپے جو میرے پاس تھے اس کے حوالے کئے۔ اُس نے اس جانفشانی سے
کنویں بنائے اور کھیتوں کو درست کیا کہ پہلی فصل پر وارے نیارے ہو گئے۔

میں نے بچوں کی تعلیم کا جو میرا مقصدِ وحید تھا ذکر نہیں کیا۔ ماں کے لئے
ایک برس تک بچے کی پرورش مشکل۔ اُستاد کے لئے اوّل سال کی تعلیم کٹھن۔ ان
دونوں میں صبر سلیقہ اور محبّت ہے تو بیل منڈھے چڑھتی ہے۔ ورنہ ایک ہاتھ
سے بچے کی موت اور دوسرے ہاتھ سے بچے کی بربادی یقینی ہے۔ جس مقام پر ماں
کی مصیبت ختم ہوتی ہے وہاں سے استاد کی مصیبت کا آغاز ہوتا ہے۔ جہالت
کے زمانہ میں دہقان کے گھر اور جاہل ماں کی گود سے بچے کو حاصل کرنا سمندر
کی گہرائیوں سے موتی نکال لانے سے بھی مشکل ہے۔ ابتدائی مکاتب کے جن مدرسوں
کو بچوں کی تعلیم سے عشق ہے اُن سے پوچھو کہ دیہات میں بچوں کے والدین کو
کیا کیا سبز باغ دکھانے پڑتے ہیں، تب کہیں مطلب حاصل ہوتا ہے۔

میں نے ستائیس بچوں پر محنت کی۔ انہیں پڑھانے کا کم اور کھلانے کا
زیادہ خیال رکھتا تھا، اوّل تو ناک صاف کرنے اور اُن کا ازار بند کھولنے باندھنے
میں بڑا وقت لگتا تھا۔ کیونکہ میں ان سے اتنا پیار کرتا تھا کہ کبھی کبھی وہ محبت میں

مجھے گھوڑا بننے کو کہتے، اور میری پیٹھ پر چڑھ کر میرے مُنہ میں رسّی کی لگام دیتے، یا دونوں کان پکڑ کے ایڑیاں مار مار مُنہ سے ٹخ ٹخ اور چل چل کہتے۔ میں بھی مجبوراً دو چار قدم چوپاؤں کی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا تو سب ہنستے اور خوش ہوتے۔ حتیٰ کہ مدرسہ انہیں تفریح گاہ معلوم ہونے لگا۔ چھٹی ملنے پر بھی دیر سے جاتے، صبح سویرے خود بخود چلے آتے۔ تختی یا کاغذ پر پڑھنا شروع نہیں کرایا۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے خوش رنگ پتھر لے کر ان کے بڑے بڑے حروف ابجد بنائے تاکہ نظر افروز اور خوش منظر حروف دماغ پر بوجھ ہونے کے بجائے تفریح کا باعث ہوں۔ بچوں میں سبق کی رغبت بڑھی اور میرے اندازے سے بھی زیادہ بڑھی۔ ایک سال کے بعد لکھنا شروع کرایا۔ کنکریاں بچوں کو دیتا تاکہ وہ ابجد کے ہم شکل حروف بنائیں۔

اب مجھے ایک معاون کی ضرورت محسوس ہوئی چاروں طرف نظر دوڑا کر باپ کے اندوختہ کو اس کام میں لگانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ کل رقم میں سے پانچ سو شادی پر خرچ ہوئے تھے۔ دو سو اُس دوست کے تھے۔ ان کے ساتھ بیوی کا صدقہ اُتارا۔ میں نے کہا، اوّل تو سب خدا کی راہ میں خرچ کرنا چاہیئے تھا لیکن اب جو نصف اپنی خوشی اور بیوی کی امیری میں صرف ہو چکا ہے تو نصف خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ چنانچہ بیس روپیہ ماہوار پر ایک مدرس رکھا۔ دونوں نے مل کر محنت کی۔ میں درجہ اوّل اور وہ درجہ دوم کو پڑھاتا رہا۔ تین درجے تک بھی مل جُل کر کام کیا۔ چار درجے ہوئے تو دو استاد رکھے۔ بیس والے کو پچیس دیئے اور بیس پر ایک اور نوجوان رکھا۔ غرض ہم تین اُستاد پانچوں

درجوں کو پڑھاتے رہے۔ اس مردِ مخیّر کی تین ہزار کی بروقت امداد نے بڑا کام کیا۔ میرا حوصلہ دوگنا ہوا۔ ہم سب معلم اور متعلم فرصت کے وقت زمین صاف کرتے اور باغبان کی امداد کرتے تھے۔ دو اور کنوئیں جب بن چکے تو جنگل میں منگل ہو گیا۔ اس وقت زمین کی دولتِ خداداد کا میں نے باقاعدہ بہی کھاتہ کھولا۔ پائی پائی کا حساب رکھنے لگا۔ مدرسہ مڈل کے درجہ کو پہنچا۔ میں نے اور اُستاد ملازم رکھے۔

اب جو گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں نے میری محنت کو بارآور پایا۔ تو رخنہ اندازیاں شروع کیں۔ اُمرا نے غربا کو بھڑکایا کہ وقف کا مال بغیر ڈکار کے ہضم کر رہا ہے۔ غربا ہمیشہ اپنے مقاصد کے خلاف امراء کے آلۂ کار بنے رہے ہیں۔ وہ بھڑک اُٹھے۔ جہاں سے میں گزرتا اُنگلیاں اُٹھاتے۔ زبانِ طعن دراز کرتے۔ جن لوگوں نے کبھی عید کی نماز نہ پڑھی تھی۔ وہ ہر روز فساد کی نیت سے وقت بے وقت آتے اور نماز کی نیت باندھ کر توڑ دیتے کہ یہاں یکسوئی نہیں مکتب کا شور ہے۔ آخر گاؤں میں پنچائت ہوئی۔ مجھے طلب کیا۔ میرا حساب پاک تھا۔ مجھے محاسبہ سے کیا باک تھا۔ چلا گیا۔ حساب طلبی ہوئی۔ میں نے بہی کھاتہ پیش کر دیا۔ اُنھوں نے دیکھ دکھا کر کہا یہ مال وقف کسی اور شخص کے انتظام میں رہے۔ تو اچھا ہے۔ میں نے صاد کیا۔ حساب کی کتابیں اور زرِ بقایا پنچوں کے حوالے کیا۔ پبلک کاموں کو خوش قسمت قومیں کامیابی سے انجام دیتی ہیں۔ خود غرض افراد سے یہ کام کب ہوا۔ انصاف اور ایثار جو شرطِ اوّل ہے وہ یہاں مفقود تھا ترکاری کچھ پنچوں سے کے پہنچی۔ کچھ اُن کے احباب میں بٹی۔ گاؤں میں کوئی بڑا باہمت ہوتا ہے جو اپنی کھیتی کی بھی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا ہے۔ وقف مال میں دلچسپی

کون لے۔ دو سال ہیں باغ سوکھا۔ برداشت آدھی رہ گئی۔ مدرسوں کی تنخواہیں سر پر پڑیں۔ میں پنچوں کے پیچھے جوتیاں چٹخاتا پھرنے لگا۔

صاحبو! عوام جذبات کی مخلوق ہوتے ہیں۔ جب انہوں نے وقف کا وہ اور میرا یہ حال دیکھا۔ پنچوں کے پیچھے پڑ گئے کہ غریبوں کا مال تو مارتے تھے اب خدا کے مال پر بھی ہاتھ صاف کر رہے ہو۔ جیسے دو سال پہلے مجھے عزت بچانی مشکل تھی۔ اب انہیں پگڑی سنبھالنی محال ہو گئی۔ پھر پنچایت ہوئی مگر پنچ نہ پہنچے۔ حساب کے کاغذ پرزوں کی صورت میں تھے۔ انہوں نے معذرت کی، کہ استروں کی مالا ہم گلے میں نہیں ڈال سکتے۔ سب نے پھر مجھے کہا کہ تمہیں سنبھالو۔ میں نے تجویز کی کہ میرے چند فارغ التحصیل طلباء کی کمیٹی بن جائے جو اس پنچایت کے روبرو ہر سال آمد و خرچ پیش کر دے اور سال نو کے اخراجات کا تخمینہ بنا کر لوگوں سے منظوری لے۔ ایک تو ہر ایک کی حس انانیت کو یہ بات بھائی۔ دوسرے ارتباطِ باہمی کا ایک موقعہ پیدا ہو گیا۔ میں بھی خوش ہوا وہ بھی راضی اُٹھے۔ سال گزرا۔ پنچایت کا سوال آیا۔ مدرسے میں جلسہ کیا۔ چھوٹے بچوں نے نظمیں پڑھیں۔ بڑے لڑکوں نے کرتب دکھائے۔ میں نے امداد باہمی پر تقریر کی جو پسند کی گئی۔ یہ سارا انتظام لوگوں کو تماشا سا معلوم ہوا۔ اگلے برس گاؤں والوں نے خود انتظام جلسہ میں حصہ لیا۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو دعوت دی۔ جلسہ کی رونق دوبالا ہوئی۔ عورتوں کے لئے پردہ کا انتظام تھا۔ میری تقریر تھی۔ سب سننے کو آئیں۔ تقریر کا ملخص انجمن انتظامیہ نے یوں شائع کیا:

"خدا نفاست کو پسند کرتا ہے، وہ بدبو سے نفور اور خوشبو سے مسرور

ہوتا ہے۔ وہ کبھی ایسی بستی یا شہر میں نہیں آتا جہاں غلاظت کے ڈھیر اور کوڑے کے انبار رہوں۔ خدا کی رحمت کے پاک فرشتے کوثر کے پانی سے مُنہ دھو کر گھر میں امن اور سلامتی کا پیغام لے کر داخل ہوتے ہیں جہاں والدین اُجلے کپڑے پہنتے ہیں اور بچوں کا مُنہ صاف پانی سے دھوتے ہیں۔ خدا اُمراء کے بڑے بڑے باغوں میں جا کر خوش وقت نہیں ہوتا۔ وہ اِن غریب لوگوں کی پھلواڑی دیکھنے کا اشتیاق رکھتا ہے۔ جہاں باعصمت عورتیں اپنے ہاتھوں سے خوش نُما پھُول کے پودے لگاتی ہیں اور ننھی بچیاں چھوٹے چھوٹے مٹکوں میں پانی لا کر اس کو سینچتی ہیں۔ وہ بادشاہ کے محل کے مکلّف کمروں میں آ کر کبھی نہیں بیٹھتا پھُوس کے جھونپڑے میں دھوئے دھائے اور سلیقہ سے سجائے برتنوں کو دیکھنے کے لئے وہ صاف فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔

میں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ اہلِ جنّت کی ظاہری نشانی کیا ہے۔
وہ بولا ظاہری صفائی جس بے ہمت نے آنگن صاف نہ کیا وہ رُوح کو کیا پاک کرے گا۔ جس کا ظاہر درست نہیں اس کا باطن کیا ہوگا۔ جو قومیں دُنیا کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے بہشت بے تاب ہے غلیظ انسانوں کے لئے دوزخ مُنہ کھولے بیٹھا ہے۔ جنّت پاک بندوں کی آبادی ہے۔ گندے لوگ جہنّم کا ایندھن ہیں۔ خدا خود پاک ہے۔ پاکیزگی پسند کرتا ہے اگر اُس کی خوشنودی مطلوب ہے تو صاف سُتھرے رہو۔ حسنِ سلوک اور حُسنِ معاملہ ہی اصل عبادت ہے۔ فریب اور فساد سے پاک خدمتِ خلق پر آمادہ لوگ آخرت میں فلاح پائیں گے۔ جو رات دن خالق کا نام لیتا ہے

مخلوق پر رحم نہیں کرتا۔ اُس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

اے جواں ہمت جواں سال کیا کسی بوڑھے کو عمر کے بوجھ تلے لڑکھڑاتے اور خمیدہ خمیدہ جاتے دیکھ کر بغیر التجا کے تو اس کا عصائے پیری بنا۔ اے تندرست و توانا کیا بے یارومددگار مریض کے بستر علالت کے پاس بیٹھ کر تو نے میٹھی باتوں سے اسے تسلی دی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے تلووں کو سہلایا۔ اگر ایسا نہیں کیا تو جوانی و صحت تو نے اکارت گنوائی۔ بیمار کا جب بند بند دکھتا ہو۔ ہمسایہ اگر آہستہ آہستہ آکر مٹھی چاپی کرے تو جوں جوں بیمار کو آرام ملتا ہے خدا کو راحت ہوتی ہے۔ خدا کے جھوٹے متلاشی خدا کو جنگلوں میں اور کنوؤں میں ڈھونڈتے ہیں۔ سچے جویا کو اللہ آبادی میں ملتا ہے۔ جوگی پہاڑوں میں سر ٹکراتا ہے۔ بھوگی گلیوں میں موہن پاتا ہے۔ اللہ اللہ کی تسبیح کرنے سے وہ نہیں ملتا۔ اوم اوم کی مالا جپنے سے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ زبان سے شکر شکر کہنے سے وہ مشکور نہیں ہوتا۔ زبانی جمع خرچ سے جب انسان تسلی نہیں پاتا تو عبادت لفظی سے خدا کیونکر مطمئن ہو سکتا ہے۔ انسان کے رنج و کلفت میں شرکت مصیبت کے وقت اس کی امداد و اعانت جملہ عبادات کا مغز ہے۔ کسی کا حق دبانے، کمزور پر ظلم ڈھانے سے زمین کانپتی ہے۔ عرش ہلتا ہے۔ خدا کا غضب جوش مارتا ہے۔ حتےٰ کہ فرشتوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ بعض خدا ناشناس رات دن نمازیں پڑھتے ہیں۔ زبان سے رب رحیم پکارتے ہیں۔ مگر اپنی ناانصافیوں پر دھیان نہیں دیتے۔ کمزوروں پر رحم نہیں کھاتے من میں مست ہیں کہ خدا کی خوشنودی یعنی جنت اُن کے پاس بیع ہو گئی۔

دراںحالیکہ وہ قہار کے غضب یعنی دوزخ میں رہیں گے۔

"ایک دو برس کے یتیم بچّے کو دیکھو جسے اجل نے باپ کی شفقت اور ماں کی محبّت سے محروم کر دیا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ جنّت سے زیادہ خوشگوار آغوشِ مادر سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو چکا ہے۔ وہ ماں کی محبّت بھری نگاہوں کو ڈھونڈتا ہے۔ انہیں نہیں پاتا تو بے اختیار روتا ہے۔ خدا کی رحمت کے انمول موتی یتیم بچے کے آنسو بنکر خاک میں گُم ہو رہے ہیں۔ کوئی ہے جو اُس دُرِ رحمت کے خزانے اُٹھا کر اپنے گھر میں لے جائے۔ بچوں کی طرح پرورش کرے زیورِ علم سے مزیّن کرے۔ جس گھر میں یتیم اس گھر کے اپنے بچوں کی طرح پرورش پاتا ہے خدا کی بخشش اس پر شبنم صبح کی طرح گرتی ہے۔ زاہد تیرے ایک لاکھ برس کے ریائی سجدے اور رحمت خیز چلّے ایسے رحمت خیز نہیں جتنی کہ یتیم پر ایک پیار کی نظر یا اس پر ایک پائی کا خرچ جس کا دِل اہلِ شہر اہلِ ملک بلکہ اہلِ دُنیا کے مصائب پر نہیں پسیجتا وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا جو لوگ بنی نوعِ انسان کی علمی اور عملی امداد میں کوشاں رہتے ہیں۔ اُن کے دُکھ درد کو دُور کرتے ہیں۔ خدا کا جوشِ کرم ان پر اُلفت کی دُنیا یعنی جنّت کے دروازے کھول دے گا۔ ان کے عملِ صالح کبوتر کی طرح دلآویز اور بھولے بچوں کی طرح معصوم صُورت اختیار کرکے ان کی خوشیوں میں اضافہ کریں گے۔ یا الٰہی مجھے ایسی نماز اور سجدوں کی توفیق دے جس سے خدمتِ خلق کا جوش بڑھے۔ لوگوں میں عدل اور انصاف کرنے کی صلاحیت پاؤں۔ اور میری زندگی اہلِ دُنیا کے لئے مفید ثابت ہو۔ آمین"

میرا لڑکا جوان ہوا۔ تعلیم پائی۔ ہونہار نکلا۔ اور ایک تجارتی ادارے میں کارکن حصہ دار بن گیا۔ محنت اور احتیاط سے کام لیا۔ دولت کمانے لگا۔ شادی کی، گھر آباد ہوا۔ اس بی بی کی جو شامت آئی اپنے بیٹے کی محبت سے بیتاب ہوئی۔ کس ماں کی خواہش نہیں کہ اولاد کو آباد اور دلِ شاد دیکھے۔ میں نے بھی باوجود کئی احتمالات کے جانے سے نہ روکا لیکن مہمان تو وہی اچھا ثابت ہوتا ہے جو میزبان اچھا ہو۔ جسے اپنے گھر میں رہنے کا ڈھنگ نہ ہو وہ دوسری جگہ رہنے کا سلیقہ کیا جانے۔ بیٹے نے ماں کی بہت آؤ بھگت کی مگر بہو سے ساس کا بگاڑ ہو گیا۔ ایک دن دونوں میں تیز کلامی ہوئی۔ دوسرے دن سخت تلخ تلخ باتیں ہوئیں۔ تیسرے دن ساس نے بہو پر جوتا اچھالا۔ بہو نے ساس کے بال نوچے۔ دُنیا نے تماشہ دیکھا۔ لڑکا دن بھر کا تھکا ہارا آیا۔ گھر کا یہ رنگ دیکھا۔ دنگ رہ گیا۔ عزّت خاک میں مِلی۔ صدمہ سے صاحبِ فراش ہوا۔ بڑھاپے میں ماں باپ جوان اولاد کے پاس بیٹھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ جوان اولاد کو تنہائی پسند ہوتی ہے۔ بہو کو خاوند کے پاس تنہا بیٹھنے کی خواہش تھی اور خاوند کو علالت میں اس کی ضرورت تھی۔ مگر ساس سایہ کی طرح بیٹے کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ اس سے بہو کا مزاج اور بگڑا۔ بیٹے کا دل مکدّر ہوا۔ علالت نے مستقل صورت اختیار کی۔ مجھے تار دیا گیا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر پہنچا۔ حالات دیکھے۔ بغیر بات کئے بھانپ گیا۔ بی بی کو سمجھا بجھا کر لے آیا۔ بہو نے شکریہ اور سلام کیا۔ لڑکے کی طبیعت بہت دنوں کے بعد جا کر بحال ہوئی۔ بعض سادہ لوح عورتیں شادی کے بعد خاوند کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ ماں باپ پر مغرور رہتی ہیں۔ اولاد ہوئی تو اُمید اس پر لگائی۔

ہیں۔ جب ان سے دل مکدر ہؤا تو بڑھاپے میں میاں کے پاؤں دھوتی ہیں ماں باپ کو بچوں سے جو پیار رہتا ہے وہ اولاد کو والدین سے نہیں ہوتا۔ یہ قدرت کا قانون ہے اور بہت صحیح۔ ورنہ انتظامِ عالم میں نقص پیدا ہو بعض والدین خدمت اور عزت کی بجائے متاہل اولاد سے محبت اور پیار چاہتے ہیں۔ نہیں پاتے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ میری بیوی کا ایسی بیویوں میں شمار تھا۔

اس واقعہ کے بعد بیوی جو جان کا روگ ہو رہی تھی۔ میرے صبر اور اپنے جبر کا موازنہ کر کے نادم ہوئی۔ سر پاؤں پر رکھ دیا۔ اور معافی چاہی۔ میری مسلسل مہربانیوں نے اس میں علوی فضیلتیں پیدا کر دیں۔ گھر میں رحمت کے فرشتے امن کا پیغام لے کر داخل ہو گئے۔ نیک عورت گھر کو بہشت بنا دیتی ہے۔ وہاں دُنیا جہان کا آرام حاصل ہوتا ہے۔ نیکیوں کی توفیق ملتی ہے۔ عورت کی طبیعت کے اس انقلاب سے میری ہمت میں ایسا اضافہ ہؤا کہ مجھے گمان گزرا کہ میں دُنیا کو بہشت بنا کر رہوں گا۔ شداد نے تو غریبوں کے خون سے اپنے لئے بہشت بنائی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنے خون سے غریبوں کے لئے دُنیا میں جنت تعمیر کروں۔ میرا گھر ایک غریب گھر تھا۔ عورت کی محنت اور میری توجہ سے وہ رشکِ گلزار بنا پھولوں کی بیلیں دیواروں پر چڑھی تھیں۔ صفائی میں صحن آئینہ کو مات کرتا تھا۔ اگرچہ ہمارا لباس سادہ مگر ایسا پاکیزہ رہتا تھا کہ ڈھونڈنے سے کوئی داغ نہ ملے۔ گھر میں عزت پائی۔ باہر بھی توقیر ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ خدا کے فضل کے دروازے کھلتے گئے۔

برس کے اندر اندر میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا اور ان کی نظروں میں

محبوب ٹھہرا۔ جب میرا حکم واجب التعمیل اور میری بات واجب التسلیم ہوئی تو میں نے خدامِ خلق کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی۔ عورت اور مرد اس کے ممبر بنے۔ ان کے یہ پانچ بنیادی اصول ٹھہرے :۔

۱۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آرام کی ضرورت صرف بیماروں کو ہے یا اوباشوں کو۔ خواہشِ محنت اور ادائے فرض کو ہم داخلِ حسنات سمجھیں گے۔

۲۔ علم سے عرفان اور احساس بڑھتا ہے اس لئے علم کو تا دمِ زیست حاصل کرتے رہیں گے اور یہ غیر فانی دولت اپنے بچوں میں چھوڑ جائیں گے۔ اور اس سے اہلِ دُنیا کو بھی بہرہ اندوز کریں گے۔

۳۔ ظاہری صفائی سے اندرونی طہارت حاصل ہوتی ہے۔ غلیظ رہنے والوں میں گندے خیالات پیدا ہوتے ہیں اس لئے جسم اور لباس کو ہمیشہ صاف رکھیں گے۔ اپنے اہل و عیال میں صاف سُتھرے رہنے کا جذبہ پیدا کریں گے گھر کی وسعت کے مطابق اس میں پھلواڑی لگائیں گے۔

۴۔ خالق مخلوق کی خوشی سے خوش ہوتا ہے۔ اس لئے خدمتِ خلق کو ہم دُنیا کا اوّل و آخر فرض سمجھکر اس میں رات دن کوشاں رہیں گے۔ موت سے پہلے کوئی ایسا کام چھوڑ جائیں گے۔ جس کا فائدہ جاری رہے اور ایسی موت کی خواہش کریں گے جس میں اہلِ دنیا کا نفع ہو۔ ملک کی خوشحالی بڑھے اور اس کے علم و اقتدار میں اضافہ ہو۔

۵۔ صحت خدا کی نعمت ہے۔ مضبوط قویٰ دُنیا کے مصائب کے مقابلہ کے قابل بناتے ہیں۔ اس لئے ایک خزانے کی طرح صحت کی حفاظت کرینگے اور جسم

بنائیں گے۔

کو انجمن سازی کی علت ہوتی ہے۔ وہ رات دن سکرٹری
کرتے ہیں۔ بعض کو عہدہ دار بننے کا ایسا ملکہ ہوتا ہے کہ کارکن
ہا اور وہ اُچک کر کرسی صدارت پر جا بیٹھتے ہیں۔ ایک سو
یگر سب کا دم واپسیں۔ بعض پبلک جماعتوں کے عہدوں کو باپ
مالیف ا۔ ہنے کی جد و جہد کرتے ہیں۔ مجھے نفس انسانی کی
پاس تھا۔ پچیس برس کے بعد گاؤں میں تعلیم کا چرچا ہو چکا تھا۔
مہ سنبھالنے اور کامیابی سے چلانے کے قابل ہو گئے تھے۔
نہوں نے سنبھال لیا۔ میں نے خدا کا شکر کیا۔ تن من سے
دارہ بنانے کے درپے ہوا۔ بیوی نے میرا ہاتھ بٹانا شروع
ئینے کی طرح صاف تھا۔ مگر محلے میں غلاظت کے ڈھیر لگے
ت کوڑا کرکٹ اپنے گھر سے اُٹھا کر دوسروں کے دروازے کے
تیں۔ گھروں کا پانی کوچے میں ادھر اُدھر بہتا تھا۔ کہیں رُک
افزائش نسل کے کام آتا تھا۔ ہم دونوں نے اللہ کا نام
جھاڑو لی۔ مُنہ پر کپڑا باندھا اور کوچے کو صا کرنے لگے۔
و دیکھ کر ہم پر تالیاں بجانے اور ہمارا مذاق اُڑانے لگے
ب گھروں سے نکل آئے۔ پاس ادب سے ہم کو روکا اور خود
ف ہوئے۔ سب نے وعدہ کیا کہ ہم اپنے مکان کے سامنے کا
یں گے۔ کبھی گھر کی غلاظت دروازے پر نہ پھینکیں گے

اس طرح ہم نے ایک ماہ ہر صبح مختلف محلّوں میں کام کیا۔ سب نے صفائی کے اہتمام کا وعدہ کیا۔ انجمن کے ممبروں نے عالم پیری میں ہم کو گلیوں میں تنکے چنتے دیکھا۔ تو ان کے کام کا جوش بڑھا اور لوگوں نے خوشی سے نالیاں اور فرش بنانے کے لئے ٹیکس لگوایا۔ ایک برس کی مسلسل نگرانی اور محنت کے بعد فرش بندی کا کام خیر و خوبی سے انجام پایا۔ اس کے بعد میں نے نہیں دیکھا کہ کبھی کسی بی بی نے بچے کو محلّے کے فرش پر پاخانہ بٹھایا ہو۔ یا گھر کے کوڑے کا ڈھیر باہر لگایا ہو۔

لباس، مکان، محلّے کی صفائی بھی ایک عادت ہے۔ ابتدا میں طبیعت اُکتاتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے۔ ہر عورت ممبر نے زنانے میں باغیچہ لگایا۔ ہر مرد ممبر نے مردانے کو پھولوں کے گملوں سے سجایا۔ انجمن کے کارکن ہفتے میں ایک دن اور وقت مقرر کر کے دوسرے دیہات کو جاتے اور لوگوں کو صاف رہنے سہنے کا ڈھنگ سکھاتے۔ اس مدرسہ کی وجہ سے دو دو تین تین میل تک کے دیہات میں تعلیم عام ہو گئی تھی اس لئے صفائی کے پیغام اور پروگرام کو جلدی قبول کر لیا گیا۔ زیادہ غریب طبقہ کے معاملہ میں البتہ دشواری ہوئی۔ وہ اپنے مویشی خانہ میں سونے کے عادی تھے۔ کیونکہ ان میں مویشیوں کے لئے علیحدہ مکان بنانے کی توفیق نہ تھی۔

دوسری بات جس کا مجھے احساس ہوا وہ یہ تھی کہ بعض نوجوان سرمایہ کی کمی کے باعث بیکار تھے۔ اب چونکہ ہر شخص کو کام کا شوق تھا۔ آوارہ گردوں کے لئے گاؤں کی دنیا تنگ ہو رہی تھی۔ ہر شخص کو سرگرم کار دیکھ وہ بھی جمائیاں

لیتے تھے۔ اور سوسائٹی کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنی زندگی کو بدلنے میں ہی خیر سمجھتے تھے۔ ان کو کام پر لگانے کے لئے انجمن خدام خلق کو فکر ہوئی۔ میرے شاگرد جوان ہو چکے تھے۔ کئی ممتاز ملکی عہدوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ کئی تجارت پیشہ تھے۔ اُنہوں نے سب کے نام ایک مختصر اپیل شائع کی:۔

"پیارے بھائیو اور بہنو! ساری مخلوق خدا کا کُنبہ ہے۔ اصل اخلاق یہ ہے کہ ہم جو کمائیں بانٹ کر کھائیں لیکن سوسائٹی کی موجودہ تشکیل مساوی تقسیم کی متحمل نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو روپیہ اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے بعد بچ رہے۔ اس کا کچھ حصہ دُنیا کے کام آئے۔ گاؤں میں کم از کم ایک سو پچاس نوجوان بیکار ہیں جو مالی و اخلاقی امداد کے محتاج ہیں اور پچاس دہقان ایسے ہیں جو مویشی خانوں میں سوتے ہیں۔ علیحدہ مکان بنانے کی ان میں وسعت نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ نوجوانوں کو کام پر لگائیں اور غریب دہقانوں کے لئے ایک مشترکہ مکان بنائیں۔ جسے امیر غریب جو چاہے سونے بیٹھنے کے کام میں لائے۔"

اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ بیس ہزار روپیہ کا سرمایہ دنوں میں فراہم ہوا اور ایک سو سے زیادہ لڑکوں کو باہر کام دلایا گیا۔ جو باقی رہ گئے اُنہوں نے تھوڑی تھوڑی امداد لے کر اپنا کام چلایا۔ دہقانوں نے مشترکہ مکان کی تجویز کو پسند کیا۔ مگر خودداری کی بنا پر وہاں جا کر سونے سے انکار کرنے لگے۔ چنانچہ سب کو دس برس کی آسان قسطوں پر قرض دیا گیا جس سے اُنہوں نے مویشیوں کے لئے چھوٹے چھوٹے مکان الگ بنائے۔ آپ اسے مبالغہ نہ

سمجھیں اگر میں کہوں کہ ہمارے گاؤں کے مویشی خانے دوسرے دیہات کے گھروں سے زیادہ صاف ستھرے تھے۔ سارے علاقہ نے آہستہ آہستہ ہر امر میں ہماری پیروی شروع کردی۔ قریب کے دیہات میں جابجا ہماری انجمن کی شاخیں قائم ہوگئیں۔ جہالت اور غلاظت کے خلاف ہم نے مل کر جو جہاد شروع کیا تھا وہ میری عمر کے سترویں برس میں ختم ہوگیا۔ ایک دن اتفاق سے تفریح طبیعت کے لئے اُمراء کا ایک گروہ شوقِ شکار کا مارا آوارہ اِدھر سے گزرا۔ وہ اس علاقہ کی حالت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ دُور سے چلچلاتی دھوپ میں چل کر آئے تھے یہاں سڑک پر دورویہ سبز درختوں کا گھنا ٹھنڈا سایہ پایا۔ کھیتیاں لہلہاتی دیکھیں۔ خوبصورت پرندے میٹھی بولیاں بولتے سُنے۔ کنوؤں پر کسان رہٹ چلا رہے تھے۔ میرے بھائی "بارالائیو لال رام منائیو لال" کی دلکش آوازیں جگہ جگہ سے بلند ہو رہی تھیں۔ قریب قریب ہر کنوئیں پر پانی پتھروں سے سر ٹپکتا، جھاگ اُڑاتا، مچلتا کیاریوں میں بل کھاتا جاتا تھا۔ اس فردوس نما نظارے کو دیکھ کر لوٹ ہوگئے۔ اور

اگر فردوس بر روئے زمین است　　ہمین است و ہمین است و ہمین است

کہہ کر فیصلہ کیا کہ ڈیرا یہیں ڈالا جائے۔

سپنے کی باتیں بیداری میں دیکھیں۔ ڈیرے والوں نے دم لیا اور ذرا سستائے تو شام کو گاؤں میں آئے۔ غلاظت کی بدبو کے بجائے چار طرف خوشبو سے لدی ہوئی ہوا نے استقبال کیا۔ جس طرف نظر اُٹھائی نظارہ نے نگاہ کا دامن کھینچا۔ پھولوں سے سجے ہوئے مکان۔ بیلوں سے ڈھکی ہوئی

بارین۔ ہر بچے بوڑھے۔عورت۔مرد کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب۔چہروں
بسم۔آنکھوں میں شرافت، زبان میں شیرینی۔جس سے جو سوال پوچھا جواب
سواب پایا۔جدھر گئے لوگوں کو زیورِ علم و حلم سے آراستہ پایا۔جس گاؤں
ا ہیں برس پہلے کسی شریف کی تعریف کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔وہاں ہر جگہ لوگ
ری تعریف سے خوش ہوتے تھے اور میری مذمت برداشت نہ کر سکتے۔وہ جدھر
ئے۔لوگوں نے میری تعریف کی اور کہا کہ تاج و تخت بھی ایسے آدمی کی خدمات
معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ان میں سے ایک بزرگ بولا کہ اے نیک مرد اس
ار خدمت میں ہم کیا امداد کر سکتے ہیں۔میں نے کہا۔ہندوستان کے
بی استطاعت لوگو! اس بدقسمت سرزمین میں جو آپ کا اور میرا مشترکہ وطن
ہے جہالت اور جرائم کا دَور دورہ ہے۔آبادیوں کے قریب غلاظت کے
بھیر اور کوڑے کرکٹ کے انبار پڑے ہیں۔وباؤں نے مستقل ڈیرہ جما رکھا ہے
تہیں تمہاری تفریح گاہیں مبارک۔اگر کبھی تفریح سے فرصت پاؤ تو ہندوستان
لو فی الحقیقت جنت نشان بنانے کے خیال کو نہ بھلاؤ۔متمدن ملکوں کے
مرا وطن کی مالی خدمت کرتے کرتے فقیر ہو جاتے ہیں۔مگر ان کا شوقِ خدمت
کم نہیں ہوتا۔جو کام مجھ سے تہی دست نے تیس برس میں کر دکھایا آپ تیرہ
برس میں کر سکتے ہیں۔صرف شوقِ بے پروا کی ضرورت ہے۔میری امداد اور میرے
کام میں امداد یہی ہے کہ آپ اپنے علاقوں میں جا کر لوگوں کو چاہِ جہالت سے
نکالیں، گھروں اور آبادیوں سے غلاظت دُور کریں۔انہیں صفائی صحت اور
خدمتِ خلق کے اصول سمجھائیں۔محنت اور ترقی کا خیال ان کے دل میں پیدا کریں۔

سب نے بقدرِ امکان اس پروگرام پر کاربند رہنے کا وعدہ کیا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد یکایک میری طبیعت خراب ہوئی۔ نبضیں چھوٹنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ دنیا کو الوداع کہنے کا وقت آگیا۔ میں اپنی عمر پر نظر کر کے مطمئن تھا۔ شکر کرتا تھا کہ زندگی اکارت نہ گئی۔ کسی کام آئی۔ لوگ کام کاج چھوڑ بھاگے۔ رونے لگے۔ میں مسکرا دیا۔ لڑکھڑاتی زبان سے کہا کہ روتے جب کہ عمر فساد اور فتنہ میں بسر کی ہوتی۔ خدمتِ خلق سے منہ موڑا ہوتا۔ یا محنت و مشقت سے جی چرایا ہوتا اور زندگی آوارہ گردی میں گنوائی ہوتی۔ ایک پیاری لڑکی نے میری بات کو سُنا۔ میرے دمِ واپسیں کی کیفیت دیکھی۔ آنسو بھر لائی اور کہا:۔

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو　　　همه خنداں بُدند و تو گریاں

آنچناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو　　　همه گریاں شوند و تو خنداں

میں نے بے چینی سے کروٹ لی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک دوسرا جہان موجود پایا۔ ہزاروں نفوس میرے استقبال کے لئے پھولوں کے ہار لئے کھڑے تھے۔ ہر طرف سے مبارک و خوش آمدید کی آوازیں اُٹھیں۔ معلوم ہوا کہ میں عالمِ عقبیٰ میں آپہنچا۔ صاحبو! یہ ہے میری دنیوی زندگی کی مختصر کہانی۔"

سب سامعین نے سُن کر مرحبا کہا۔ میرے مُنہ سے بھی بے ساختہ شاباش نکلی۔ فوراً اپنے عمل اور عاقبت کا خیال عود کر آیا۔ محویت جاتی رہی۔ بیگانی کہانی نے دل کو شاد کیا تھا۔ اپنی شیطانی سرگزشت کی یاد نے اُسے ناشاد کیا۔ میری آنکھوں میں رشک کے اشک بھر آئے۔ پھر غم کے آنسو بہنے لگے۔ اُف اُف کرتا اُٹھا

یوانگی سی سرپر سوار ہوئی۔ چاہا کہ خاک سر پر ڈالتا ہوا سوئے صحرا نکل جاؤں۔ رفیق سفر نے ہاتھ تھاما کہ یہ بیبیاں بیٹھی ہیں کچھ ان کا بھی ماجرا سنو۔

ایک ہندو لڑکی کی کہانی

میں نے نظر اٹھائی تو قریب ہی ایک درخت کے سایہ میں دو بیبیوں کو مصروفِ گفتگو پایا۔ میں ان بیبیوں کے پاس گیا۔ انہوں نے بڑی محبت سے پاس بٹھایا۔ ایک بی بی دوسری سے کہنے لگی "بہن میرا نام لاجونتی ہے۔ میں جودھیا کے پنڈت للتا پرشاد کی لڑکی ہوں۔ بچپن میں لکھنا پڑھنا سیکھا۔ بڑی ہوئی تو کاشی جی کے برہمنوں کے ہاں بیاہی گئی۔ میں ہندی پڑھی ہوئی تھی۔ میرے پتی کی سندر صورت ایسی کہ کوئی کہے وہ پرمیشر کا روپ تھے۔ ان کی باتیں بڑی میٹھی تھیں۔ مجھ سے بڑا اچھا سلوک تھا۔ سسر بوڑھا ساس جوان۔ وہ اس کے ہاتھ میں موم کی ناک تھے۔ اگرچہ گھر میں لکشمی دیوی کا باس تھا مگر پتی کا ہاتھ تنگ تھا۔ ساس کو ہماری خوشیاں نہ بھاتی تھیں۔ وہ باپ کو بیٹے کے خلاف بھڑکاتی تھی۔ وہ دونوں دیا دھرم کی باتوں میں بہت محو رہتے۔ سویرے اٹھ کر ایشور کے بھجن گاتے اور پکار پکار کر "جو رام بھجا سو جیتا۔ جو رام بھجا سو جیتا" کے سُر الاپتے۔ سسر کے ماتھے پر ہمیشہ سیندور کا تلک، ہاتھ میں ہر وقت تلسی کے موٹے دانوں کی مالا رہتی۔ وہ رام نام کا جپ کرتے رہتے۔ گرہستی ہو کر جوگیوں کی طرح سندھیا میں کرتے مگر دیا پرم دھرم ہے نام کو بھی ان میں نہ تھی۔

میرے پتی نے لاچار ہو کر دیس چھوڑ پردیس جانے کی ٹھانی کہ شاید

شوجی یوں راضی ہوجائیں۔ اور کچھ ہاتھ لگے۔ مَیں نے بھی سوچا کہ جوانی میں کمائینگے
تو بڑھاپے میں کھائیں گے۔ ان کے جانے پر راضی ہو گئی۔ راضی تو ہو گئی مگر
جب وہ چلے گئے تو دُنیا اندھیر ہو گئی۔ آنگن مکان تو وہی تھا مگر در و دیوار پر اُداسی
چھائی تھی۔ پہلے پنچھی بولتے بھاتے تھے۔ اب بول بول کے سر کھاتے
تھے۔ بال کنگھی بن اُلجھ گئے۔ سنگار کو پھر کبھی جی نہ چاہا۔ جب کبھی خط آتا، دل
کا کنول کھل جاتا تھا۔ ورنہ بے کلی رہتی تھی۔ وہ کبھی سپنے میں آتے تو تسلی ہوجاتی
کام میں ہاتھ ہوتا خیال میں ان کا تصور بندھ جاتا اور دیر تک کام میں ہاتھ ڈالے
بیٹھی رہتی۔ ساس دھمکاتی اور اس کی آواز سُن کر دل دھڑکتا اور کام دھندے
کو پھر لگ جاتی۔ غرض ان کی جدائی میں بھرن سی ہوئی۔ ان کا خط پہلے جلدی
جلدی آیا کرتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے آنا شروع ہوا۔ اور بعد کو رام جانے کیا
پھیر پڑی کہ خط سندیسہ بالکل بند ہو گیا۔ میں جیتے جی مر گئی۔ ساس مجھے خصم کھانی
ڈائن کہنے لگی۔ ایک دن صبح سویرے ایک فقیر سارنگی بجاتا بھیک مانگتا دروازہ
پر آ کھڑا ہوا۔ اُس نے سُر ٹھیک کرکے یہ دوہا کہا ؎

سونا لینے پی گئے سُونا کر گئے دیس

جب تک وہ گاتا رہا۔ میں سُنتی اور روتی رہی۔ جب جانے لگا تو دو مٹھیاں
بھر کر آٹا اُس کو دینے کے لئے گئی۔ ساس نے دیکھا، آگ بگولا ہو گئی۔ دُور
سے پکاری کہ ہاں لٹاؤ گھر، پہلے پتی کو بھڑکایا۔ پھر مجھے گھر سے نکل جانے
کہا۔ میں آگے ہی جلی ہوئی تھی۔ ان باتوں سے اور جل گئی۔ مگر ہاتھ باندھ
ساس کو کہا۔ ماتا رحم کرو۔ دکھی کو نہ دُکھاؤ۔ گر وہ لات مکے مارتی رہی۔ وہ

مارتے مارتے تھک کر پلنگ پر جا لیٹی میں روتے روتے زمین پر سو گئی۔ یوں ہی دوپہر ہو گئی۔ کھانا کسی نے نہ پکایا۔ سسر باہر سے آیا تو مجھے دھمکایا۔ اور بولا "جدھر میرا بیٹا گیا، اُدھر تو بھی جا۔" میں نے جلدی اُٹھ کر آگ جلائی۔ چوکا دیا۔ روٹی بنائی۔ اور ایک طرف بیٹھ کر روتی رہی۔ شام کے کام سے فارغ ہو کر چارپائی پر جا لیٹی۔ دل میں سوچا پتی کو گئے دس برس گزر رہے۔ ماتا پتا کو سورگ سدھارے پانچ برس ہوئے۔ کوئی بہن نہ بھائی۔ میں عورت ذات ٹھہری۔ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ آخر غیرت نے من کو منایا کہ اس بے عزتی کی زندگی سے موت اچھی۔ اس ٹکڑے سے بھیک بہتر۔ اگر برتن صاف کر کے گزر اوقات کرنی ہے تو یہ اور جگہ بھی ہو جائے گی۔ میں ہمت کر کے اُٹھی۔ رام کا نام لے کر سر کے بال چھوٹے کئے۔ خاوند کے پُرانے کپڑے پہنے۔ پگڑی سر پر باندھ کر رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلی اور شہر کے باہر جا کر ایک سڑک پر ہو لی۔

رات کالی ڈائن کی طرح بال کھولے کھڑی تھی۔ میں سہمی جا رہی تھی۔ پتوں کے ہلنے اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ سے میں ڈر ڈر کر بھاگتی تھی۔ درخت مجھے بھوت پریت نظر آتے تھے۔ کوئی مُنہ کھولے زبانیں نکالے نوالہ بنایا چاہتا تھا کوئی ہاتھ پسارے پکڑنے کے لئے جھپٹتا دکھائی دیتا تھا۔ میں سہمی جا رہی تھی۔ یک بیک گیدڑوں نے اکٹھے ہو کر بولنا شروع کیا۔ میں شہروں میں رہنے والی سمجھی کہ چڑیلیں میرے ڈرانے کو اکٹھی ہو کر روتی ہیں۔ ہرن چوکڑی بھرتے ہوئے سڑک کاٹ گئے۔ مجھے چھلاوے کا یقین ہوا جاتا تھا۔

اُلّو بولے میں ڈری۔ ایک اُلّو نے مجھے ٹکٹش مارے۔ میں سہم گئی۔ اسی طرح میں ڈری سہمی صبح ایک قصبے میں جاپہنچی۔ ایشور کا دھنیاد کیا۔

رات کی تھکی دن کو ایک دھرمسالہ میں جالیٹی۔ بند بند دُکھتا تھا۔ ہاتھ پاؤں ہلانا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں آنکھیں بند کرتی تھی۔ نیند نہ آتی تھی۔ اتنے میں ایک بھدر پرش آیا۔ مصر سے بولا۔ کہو مصر مہاراج ہمارے لئے کوئی رسوئیا ڈھونڈا۔ مصر نے جواب دیا۔ بھگوان سانجھ سویرے آپ کا کام کردوں گا۔ میں نے سُنا تو پکاری۔ مہاراج! میں رسوئی چوکے کا کام جانتا ہوں۔ اجودھیا کے برہمنوں کا بیٹا ہوں۔ ماتا پتا بیکنٹھ سدھار گئے ہیں۔ کسی اچھے گھر کی چاکری کے خیال سے یہاں آیا ہوں۔ اُس نے مجھے اچھی طرح جانچا اور کہا اچھا چلو مگر بیٹا کھیل کود کا خیال نہ رکھنا۔ کام پر دھیان دینا۔ میں نے اشیرباد دی اور ان کے ساتھ ہولی۔ گھر پہنچی۔ اس کی دھرم پتنی نے بڑی دیا کی۔ اپنے بالکوں کی طرح میرے لئے ان پروسا۔ میں دو روز کی بھوکی تھی۔ پیٹ بھر کر کھایا۔ تھکی ہوئی تھی۔ جی بھر کر سوئی۔ اُٹھی تو کام کاج میں لگ گئی۔ گھر بھر میرے کام سے خوش تھا۔ بچے مجھے بیر کہہ کر پکارتے تھے۔ پتی پتنی بیٹا کہتے تھے۔ ایک دن بچے غلط پڑھ لکھ رہے تھے۔ میں نے اصلاح کی۔ ان کے پتا ایک مشہور وید تھے۔ یہ جان کر کہ میں لکھی پڑھی ہوں اور پرسن ہوئے۔

میں نے بھیس بدلنے کو تو بدل لیا اور لڑکی سے لڑکا بن گئی مگر میری ہر ادا نرالی تھی۔ آواز میں باریکی، جوانی کا اُبھار، چال سبک، چہرہ پر زنانہ پن کیا چھپاؤں اور کس کس طرح۔ میں بولتی کم تھی اور ہر وقت شرمائی ہوئی رہتی تھی۔

یری رازداری کی کوششوں سے خواہ مخواہ ہر کسی کو شک ہوتا تھا۔ ایک دن پتا
ی باہر کھیتی دیکھنے گئے۔ بچے پاٹھ شالا کو گئے ہوئے تھے۔ میں اور ماتا گھر میں
کیلے تھے۔ وہ بولی بیٹا تم تو گنوں کی پوٹ ہو۔ میں تمہارے کام سے بہت
اضی ہوں۔ پر تم ہنستے بولتے کم ہو۔ تم چور چکار۔ کم ذات، بدکار تو معلوم نہیں
دتی، پھر مردوں کا روپ کیوں دھارا اور یہ کس کا سوگ ہے۔ میں افشائے راز پر
ری اور پاؤں پڑ گئی مگر اس نیک عورت نے سر سینہ سے لگایا اور کہا بیٹی ڈرو نہیں
ات کرو سچ سچ کہنا تمہیں کیا روگ ہے؟ میرا جی بھر آیا۔ میں نے آپ بیتی رو
رو کر کہہ سنائی۔ مجھے گلے سے لگا کر وہ بھی خوب روئی۔ رو دھو کر بولی۔ بیٹی پریم
تو پارس ہے جس کو چھو جائے سونا بنا دے۔ محبت میں بڑی شکتی ہے، اس نعمت
کو رو رو کر نہ بہاؤ۔ بلکہ رونا دھونا بند کرو اور پریم کی لہر دل کو سنسار کی سیوا کے
کام لاؤ۔ تم ودیا کا ساگر ہو۔ کچھ ویدک حکمت سیکھو۔ تمہارے پتا حکیم ہیں۔ گھر
میں گنگا بہتی ہے۔ پیاسی کیوں بیٹھی ہو۔ یہ من میں دھارن کرو کہ میں پتی کی محبت
کے مندر کی جگہ ایک ایسی دکھ نوارن جگہ بناؤں گی جہاں دکھی روگی رہ کر آرام
پائیں گے۔ اسیس دیں گے۔

مجھے یہ بات بڑی پسند آئی۔ پتا نے جب سنا کہ میں عورت ہوں۔ مجھے
بیٹی کہہ کر پیار کیا۔ اور کہا ہماری لڑکی کوئی نہیں، تم ہماری لڑکی ہو، ڈرو نہیں،
رام بھلی کرے گا۔ لڑکے بڑے خوش تھے۔ اچھلتے تھے کودتے تھے کہ آہا بھائی
بہن بن گیا۔ پتا جی مجھے بڑے پیار اور محبت سے وید ک پڑھاتے اور میں بڑے
شوق سے پڑھتی تھی۔ ماتا کا کہا بہت ٹھیک نکلا کہ محبت میں شکتی ہے۔ میں نے

رات دن ایک کر دیا۔ محنت سے دل نہ اکتایا۔ ایک برس کے بعد پتاجی عورتوں کے علاج میں میری مدد لینے لگے۔ میں مریضوں سے محبت کے ساتھ بات کرتی، توجہ سے دیکھتی تھی۔ چار سال کے اندر اندر مجھے تمام روگوں کی خبر ہو گئی۔ میرے علاج سے پتاجی کی دکان اور چمکی اور کاروبار بڑھا۔ وہ ماتا کی طرح بڑے دھرماتما تھے۔ ایک دن بولے، لڑکی میں تو سال ایک کا دنیا میں مہمان ہوں۔ دل مدت سے کمزور ہو رہا ہے۔ اب تو دم کا کھیل ہے آئے نہ آئے۔ جو روپیہ ساری عمر میں کمایا تیرے اور تیرے بھائیوں کے لئے کافی ہے۔ مگر میں نے تو عمر دھن کمانے میں گنوائی۔ تم دیا دھرم کا کام کرنا۔ ایشور نے کرپا کی آخری عمر میں اولاد دی۔ میری یہی پرارتھنا ہے کہ غریبوں کے مفت علاج کا کچھ سربندھ کرو۔ اپنے بھائیوں کو بھی ویدک پڑھاؤ۔ اپنی امداد میں لگاؤ۔

دنیا میں بڑے بڑے گیانی وید حکیم ہوئے مگر موت کی دوا کسی کو نہ معلوم ہو سکی۔ ایک سال میں پتاجی کا مرض بڑھتا گیا۔ ہر دوا زہر ہو گئی۔ ہر علاج الٹا پڑا۔ ایک دن دیکھتے دیکھتے نبضیں چھوٹ گئیں۔

کریا کرم سے فارغ ہو کر میں تن من دھن سے اسی دھن میں لگ گئی۔ بہت کمایا تھوڑا کھایا۔ میرا اور شہرہ ہوا۔ یہاں تک کہ راجہ رانیوں تک مجھ سے علاج کرانے لگے۔ میں نے پتاجی کے سورگباش ہونے کے بعد جو کمایا اُسے ایک ہسپتال بنانے میں لگایا۔ جوں جوں لوگوں نے عمارت کو دیکھا۔ دانیوں نے دان دیا۔ آج کچھ کل کچھ بیس برس کے اندر ایک بڑی عمارت تیار ہو گئی۔ عمارت کا کچھ حصہ تیار ہوا تو میں نے لڑکیوں کے لئے ویدک پاٹھ جاری کیا۔ دُور دُور سے

لڑکیاں وید ک پڑھنے کو آئیں ۔ میں سنتکوں پر سبق بھی پڑھاتی تھی اور انہیں روگی بھی دکھاتی تھی ۔ اس طرح ان کو سبق کے یاد رکھنے میں آسانی ہوتی تھی ۔ بھائی اب جوان ہو گئے ۔ میرا ہاتھ بٹانے لگے ۔ ماتا بہت بوڑھی ہو گئی تھی ۔ میرے اس گھر میں آنے کے ۲۷ برس بعد ہم سے آنکھیں پھیر کر چل دی ۔ مجھے بڑا دُکھ ہوا ۔ میری اپنی صحت ـــ لگی ۔ مگر سیوا بھاؤ میں کوئی فرق نہ آیا ۔

ایک رات میں دن کے کام سے تھک کر سو گئی ۔ سپنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ ماں باپ کا گھر ہے ۔ باجا بج رہا ہے ۔ برات کی آمد آمد ہے ۔ میں اور میری ہمجولیاں چھت پر چڑھ گئیں ۔ میں نے لڑکیوں سے پوچھا یہ کس کی برات ہے ؟ اُنہوں نے کہا تجھے بیاہنے تیرے کنت آئے ہیں ۔ میں جلدی جلدی نیچے اُتری ۔ اترتے ہی ماں کی گود میں لیٹ گئی ۔ ماں نے پیار کیا ۔ اتنے میں میرے سوامی اندر آئے ۔ میں نے پوچھا سوامی اتنی مدت نہ خط نہ سندیسہ اُنہوں نے حیران ہو کر پوچھا ۔ تم کون ہو ۔ پھر میں نے انہیں ہاتھ باندھ کر کہا سوامی مجھے بیاہ لے جاؤ ۔ تمہارے بغیر میرا جی نہ لگے گا ۔ سوامی رونے لگے ۔ میں اُٹھی اور ان کو دلاسا دیا ۔ اور کہا میں اب تو مر گئی ہوں ۔ اُداس نہ رہنا مگر جلدی ہی آ جاؤں گی ۔

میں چونک کر اُٹھی ۔ کیا خواب دیکھا ۔ انمل بے جوڑ ۔ خیر سپنے ایسے بھی ہوتے ہیں ۔ میں اُٹھی اور اُٹھ کر مریضوں کی دیکھ بھال کو لگ گئی ۔ بات آئی گئی ہو گئی ۔ میری عمر اس وقت ۸۰ سال کی تھی ۔ اس گھر آئے چالیس برس ہو چکے تھے اور مطب کرتے ۳۵ برس ۔ ہمارے ہسپتال میں ۵۰۰ مریضوں

کے بستر لگے تھے ۔ ایک سو عورتیں مستقل ملازمہ تھیں ۔ علاوہ ازیں مدرسہ میں ۵۰۰ لڑکیاں پڑھتی تھیں ۔ سارے ملک میں میری دھوم تھی ۔ شہر کے لوگ میری عزت کرتے تھے ۔ بچے پیار سے میری ٹانگوں کو لپٹ جاتے تھے ۔ چاروں بھائی بہن رات دن لوگوں کی خدمت میں لگے رہتے تھے ۔ ابتدا میں روپیہ کی تنگی ضرور ہوئی مگر ہم نے ہمت نہ ہاری ۔ اب یہ حال تھا کہ ہاتھ پسارتیں تو لوگ جھولیاں بھرنے کو تیار تھے ۔

ہم نے ایک عمدہ اوشدھالیہ کھول رکھا تھا جس کی آمدنی لاکھوں تک پہنچ چکی تھی ۔ وہ سب خیراتی کاموں میں خرچ ہوتی تھی ۔ اس ہسپتال کا نام اس پردیسی پیا کی یاد میں ان کے نام پر رکھا تھا ۔ ہمیں ہر طرح کا اطمینان نصیب تھا مگر بڑھاپے میں بھی ان کی یاد جوانی کے دنوں کی طرح تازہ تھی ۔ میری بہار اور برسات اسی خیال میں گزر گئی کہ اب پیا پردیس سے آئیں گے ۔ اس لیے مرتے دم تک سنگار نہ چھوڑا ۔ بعض عورتیں پختہ عمر میں مجھے پریم کی پیاسی دیکھ کر ہنستی تھیں مگر انہیں کیا خبر کہ حسن بے بنیاد ہے عشق بے بنیاد نہیں ۔ روپ اور جوانی بھادوں کی گھٹا کی طرح آتی ہیں ۔ تھوڑی دیر بہار دکھا کر چلی جاتی ہیں ۔ پر پریم کا پیالہ کم ہونے کی بجائے دن بدن گہرا ہوتا جاتا ہے ۔ بعض بے سمجھ جسم کو ہی پریم سمجھتے ہیں ۔ طوفانی جوانی میں جذبات کی طغیانی ایک موہی بات ہے ۔ ں کو حسن کی طرح ثبات نہیں ۔ محبت پر جوانی اور بڑھاپے زندگی اور موت ں رنگا رنگی کا صرف اتنا اثر پڑتا ہے کہ یہ جوانی میں پیدا ہوتی ہے ۔ ھاپے میں جوان ہوتی ہے ۔ موت کے بعد زندہ رہتی ہے جس شخص کے

ل میں محبت ہو وہ بوڑھا نہیں ہوتا۔ موت سے مرتا نہیں۔ محبت میں امرت ہے
س کا نام آبِ حیات ہے، یہ حیات افروز چیز جسم اور دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ
ہتی ہے۔ پریم نیکیوں کی انتہا ہے۔ یہ ایسا اعجاز ہے جو نار کو گلزار کرتا ہے۔
رائیوں کا ناش اور بھلائیوں کو پیدا کرتا ہے۔ محبت بھرے دل میں
دا بسیرا لیتا ہے۔

ایک سمے دُنیا پر ایشور کا قہر ٹوٹا۔ شہر میں ہیضہ پھوٹا۔ جوانا مرگوں کی
دیں بیسیوں مائیں جیتے جی مر گئیں۔ سینکڑوں سہاگنوں کا سُہاگ اُجڑا اور
سوگوار ہوئیں۔ باغِ زندگی کی بہت سی کلیاں وبا کی صرصر سے مُرجھا کر سپردِ خاک
وئیں۔ جس کا باہر ٹھکانا تھا وہ شہر چھوڑ بھاگا۔ غریب گھروں میں بیٹھ کر موت کا
نتظار کرنے لگے۔ ہم چاروں بہن بھائیوں نے رات دن ایک کر دیا۔ لوگوں
کے گھروں میں جا کر تیمارداروں کو حفظانِ صحت کے اصول سمجھائے۔ بیماروں کو
وائی دی۔ مکانوں کی صفائی میں امداد دیتے رہے۔ اسی دوران میں میرا منجھلا
جائی لوگوں کی خدمت کرتا وبا کا شکار ہوا۔ عمر بھر کا ساتھ چھوڑ گیا اور ہمیشہ
کے لئے ہم سے مُنہ موڑ گیا، دل کو بڑا صدمہ ہوا لیکن ہم وہاں سے آنسو پونچھتے
گوں کی خدمت میں مصروف رہے تا آنکہ موت نے مجھے آ گھیرا وبائی مرض
کی ساری علامتیں ظاہر ہوئیں اور ہاتھ پاؤں نے چلنے پھرنے سے جواب دے
یا۔ بے کلی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی حتّٰے کہ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ کچھ لوگ
دھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آئے۔ میں نے دیکھا سوامی ایک طرف اُداس کھڑے
یں، میں بھاگ کر پاس گئی اور دامن تھام لیا۔ انہوں نے دامن جھٹک دیا۔ میں

ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے پوچھا تم کون ہو؟ میں نے کہا، مہاراج تمہاری چیری۔ وہ چپ ہو گئے۔ پھر کہا کیا مجھے پہچانتی ہو؟ میں بولی، تم میرے مالک ہو۔ اس پر وہ مسکرانے اور خوشی سے میرے آنسو نکل آئے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ کچھ ہوش سا آگیا۔ گرم قطرے رخساروں پر ڈھلتے معلوم ہوئے۔ ایک لمبی سی آہ سینہ توڑتی ہوئی نکلی۔ نزع کا وقت آپہنچا۔ میرے بھائی رونے لگے۔ سانس چھوٹے ہوتے گئے۔ مگر اطمینان بڑھتا گیا کہ میں محبت میں سستی نہیں ہوئی۔ نہ رونے میں آنکھیں کھوئیں۔ بلکہ زندگی میں بہتوں کی زندگی اُجڑنے سے بچائی۔ بہتوں کے آنسو پونچھے۔ محبت کے صدمہ نے مجھے باہمت بنا دیا۔ بھگوان نے توفیق دی اور میں لوگوں کی خدمت کے قابل ہوئی۔

اس طرح ایشور دھنباد کرتے کرتے میری جان نکل گئی اور میں یہاں آپہنچی۔"

یہ قصہ سن کر سب نے صدآفرین کی۔ میں بھی صدرحمت پکار اُٹھا۔ لمحہ بھر اس فسانہ میں کھویا رہا۔ گویا میں ابھی دنیا میں ہوں۔ اور اُسی لیلیٰ کی طرح نیکیوں میں مصروف ہوں۔ بیماروں کی تیمارداری کرتا ہوں اور ان کے اقرباء کو تسلی دے رہا ہوں۔

اے کاش! یہ خوشگوار خود فراموشیاں کچھ دیر اور رہتیں مگر بدقسمت نظر اپنے نامۂ اعمال پر جا پڑی۔ میں اس طرح تڑپ اُٹھا جیسے بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔ چاہا کہ گریبان چاک کرکے خاک اُڑاؤں۔ انسانوں کی نظر سے اوجھل ہو جاؤں۔ میں چلا چاہتا تھا کہ دوسری عورت بولی:۔

مراکش کی ایک عورت کی کہانی

میں ملک مراکش کی رہنے والی ہوں جس کا کچھ حصّہ تپتا ہوا ریگستان ہے اور باقی خوشنما مرغزار ہے۔ جب تک ملک میں مائیں خود اولوالعزم تھیں۔ بہادر بچے پیدا ہوتے رہے۔ ملکوں کو فتح کیا۔ دُنیا میں بادشاہی کی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ماؤں نے ان مجاہدوں کی بجائے جو داڑھیاں دانتوں تلے دبا کر اور اللہ اکبر کہہ کر دشمن کی صفوں میں گھس جاتے تھے۔ ایسے عیش پرست نوجوان پیدا کیے جنہیں عورتوں کے بستر میدانِ محاربہ سے زیادہ دلکش معلوم ہونے لگے۔ ملکِ عزیز کی خاطر محبوب بچّوں کو گود سے الگ کرنے والی عورتیں جب نہ رہیں تو نہ صرف ہسپانیہ سے پاؤں اُکھڑے بلکہ مراکش بھی غلام آباد ہُوا۔

میری اپنی پیدائش ایک غریب گھر کی ہے۔ میں نے مکتب میں تعلیم پائی۔ مراکش کو غلام دیکھا، غیرت کو ٹھیس لگی۔ رات دن اُسی دُھن میں لگ گئی کہ ملک آزاد ہو۔ میرے نزدیک آزادی ایمان کی اوّلیں شرط ہے۔

میری شادی ہوئی۔ میرا خاوند ایک خوبرو جوان تھا۔ عسکری تربیت حاصل کرنے کے لئے وہ ایک اجنبی حکومت کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ فنِ نقشہ کشی اس کی فطرت میں ودیعت تھا۔ شوقِ مہارت نے اس کو بندوق کا بہترین نشانہ باز بنایا۔ میں نے خود بھی فسٹ ایڈ کے طریقے سیکھے۔ انگلستان اور جرمنی کی حریت پرور زمینوں کے قصّے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے متعلق کتابیں پڑھیں۔ میرے خاوند کے پاس اتنی جائداد نہ تھی کہ تسلّی سے بسر اوقات ہو سکے۔ ہمارے پانچ

نے بچے پیدا ہوئے، دو لڑکیاں اور تین لڑکے۔ جنہیں میں نے اسی طرح فوجی اور فسٹ ایڈ کی تعلیم دلائی۔ کچھ خاوند کی تنخواہ کا سہارا تھا۔ کچھ خود سینا پرونا کر کے گزر اوقات کرتی تھی۔ مگر مقصدِ حیات سے ایک لمحہ غافل نہ ہوئی۔ فرصت کا جو وقت ملتا وہ لوگوں کو آزادی کی برکات سمجھانے اور ان میں اس کے حصول کے لئے شعور و خواہش پیدا کرنے میں صرف کرتی تھی۔ مگر اُمراء مخالفت کرتے، علماء مذہبی حجتیں نکالتے صوفیا بات سنتے تو کان لپیٹ کر خانقاہوں میں چلے جاتے۔ صرف غریب لوگ ہی تھے جو میری آواز پر لبیک کہتے تھے۔

یہ کیفیتِ حال میرے لئے کچھ ایسی باعثِ تعجب نہ تھی جنہیں آرام و عزت حاصل ہو۔ وہ حالات میں تبدیلی کی خواہش کیوں کریں جن طبقوں کو عوام میں اعزاز حاصل ہوتا ہے، وہ حالات کا تغیر پسند نہیں کرتے۔ اُمراء نے آزادی کی آواز کو بدنظمی کا پیش خیمہ بتایا۔ علماء نے حکومتِ وقت کو ظل اللہ اور اولوالامر کہا۔ صوفیا نے کہا کہ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ ہم تو خدا کی مشیت میں دخل نہیں دے سکتے۔ خدا ملک کا والی ہے، جس کو چاہتا ہے ملک کی حکومت دیتا ہے۔

حالات پر شاکر رہنے کا اصول ترقی کے راستے میں سدِ سکندری اور قوموں کے لئے سکراتِ موت کا حکم رکھتا ہے۔ میں ان تینوں طبقوں کی مخالفت سے سخت خائف ہوئی۔ کچھ کرتے دھرتے نہ بنتی تھی۔ میں جو بات مہینوں میں بناتی تھی وہ منٹوں میں بگاڑ دیتے تھے۔ عوام جہاں حالات کی مجبوریوں سے انقلاب پسند ہوتے ہیں۔ وہاں اکثر انہیں مجبوریوں سے اُمراء کی خواہشوں کے غلام

اور اُن کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی بن جاتے ہیں۔ زندگی کا آرام دُنیا میں ناممکن پاکر وہ علماء کے ان وعظوں کے شیدائی بن جاتے ہیں۔ جن میں جنّت کی حسین نظاروں والی دُنیا کی بادشاہت کو یا رحیم یا کریم کی فقط ایک تسبیح سے حاصل ہو جانے کا یقین دلایا جاتا ہے۔ کون تن آسان انسان ایسے صوفی کی عزت نہ کرے جو رات کے ذکر کی قیمت ایسی عمر جاوداں بتاتا ہے جس میں ہر روز خدا کا دیدار ہوگا۔ ان لوگوں کے مقابلے میں تہی دست اور سرفروشوں کی طلب کہاں کامیاب ہو سکتی تھی۔ غریب لوگ میری بات کو پسند بھی کرتے۔ امداد کا وعدہ بھی کرتے مگر پھر جب ان حضرات کی باتوں کو سنتے تو نہ صرف ہمت ہار دیتے بلکہ بعض دفعہ میرے ہی درپئے آزار ہو جاتے اور مجھ پر اینٹ پتھر بھی پھینکتے۔

دس برس اسی مصیبت میں گزرے۔ میری بڑی لڑکی جوان ہوئی تو بڑی آتش بیان نکلی۔ جب وہ تقریر کو کھڑی ہوتی۔ وطن عزیز کی خدمت کا ذکر چھیڑتی آزادی کی خوبیاں بیان کرتی۔ تو اسکی شعلہ بار زبان قلوب میں آگ لگا دیتی۔ جب ملک کی مصیبت کی داستان کہتی تو دلوں میں ہوک اُٹھتی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلتا تھا۔ کیونکہ وہ تو ملک کے لئے اَن تھک مالی اور جانی قربانی کے بعد بہشت کا وعدہ کرتی تھی۔ اور ملّا اور پیر زبانی عبادت سے خلد کے ٹھنڈے سایوں کے نیچے حوروں کے آغوش میں پہنچا دیتے تھے۔ بہرحال اس سے اتنا تو ضرور ہوا کہ لوگوں میں نئی بات کا چرچا شروع ہو گیا اور کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہو گئے۔ میرا خاوند چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ میں نے اس سے ذکر کیا کہ ہم شب و روز کی محنت

سے ملک میں بہت تھوڑا احساس پیدا کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ مگر عوام پر تین طبقوں کا اثر بہت گہرا ہے۔ اور اس کو زائل کرنے کے لئے عمرِ نوح چاہیئے۔

اس نے کہا سچ ہے۔ لفظوں میں جاذبیت کم ہوتی ہے۔ عمل میں جادو زیادہ ہوتا ہے۔ بہادرانہ اقدامِ عمل قوموں کی قسمت پلٹ دیتا ہے۔ بہادری ہی وہ جوہر ہے جس کی دشمن قدر کرتا ہے۔ ملک تم ماں بیٹیوں کی خدمت کو بھلا نہیں سکتا۔ اس ملک کے مخالفوں پر ایک ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مراکش کے نوجوان کتنی ایسی ضربوں کے بعد وطنِ عزیز کو آزاد کرلیں گے۔ بہرحال ہمیں اپنی زندگی میں اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے باقی کام خدا کی مہربانی اور آئندہ نسل کی ہمت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ آج شام کو دو عزیز مہمان آئیں گے۔ کھانے پر اُن سے مزید باتیں ہوں گی۔

میں کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ میرا خاوند باہر چلا گیا۔ رات کو ایک مردِ معمر ایک نوجوان عرب کو لے کر آیا۔ ان کے ساتھ ان کے دو ملازم بھی تھے۔ ہم نے ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اندر بوڑھے نے حدیث المائدہ کے طور پر ادھر اُدھر کی پُرلطف باتیں کیں۔ کچھ سفرِ یورپ کے حالات بیان کئے جرمنی اور انگلستان کی مردم خیز سرزمینوں کا ذکر کیا۔ پھر وہ دونوں قریب ہو گئے اور ہم کو بھی قریب قریب سرک آنے کو کہا۔

اس جوان ہمت بوڑھے نے بتایا کہ ملک کی بے کسی کو دیکھ کر جو گہرا زخم سینے میں چھپا ہے۔ اُس نے مجھے ساری عمر بے چین رکھا میں نے حالات

سے اندازہ لگا لیا کہ بغیر سرمایہ کے کوئی کام ممکن نہیں۔ اس لئے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ جُز رسی اور محنت کو شعار بنایا۔ سینکڑوں سے ہزاروں ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں کمائے۔ پائی پائی کا حساب رکھا۔ خُون کو پسینہ کرکے بہایا۔ مگر پیسہ کبھی ضائع نہیں کیا۔ اس وقت میرے پاس سات کروڑ کا سامانِ حرب ہے اور اسی قدر زرِ نقد موجود ہے۔ مُلک کی جنوبی سرحد سے لے کر پہاڑی کے عقب تک جہاں میری تجارتی کوٹھی واقع ہے پختہ سڑکیں موجود ہیں۔ کوٹھی کے اندر وسیع تہ خانے ہیں۔ جہاں جُملہ سامان رکھا ہے۔ سامان سالوں سے فراہم ہو رہا تھا۔ مگر آبادی کی عام ہمدردی حاصل ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ میں ممنون ہوں کہ آپ کی سرگرمیوں نے یہ راستہ بھی کھول دیا ہے۔ اب آپ شعبان کی ۱۵ تاریخ کو تمام ارکان کو پہاڑی کے قریب کسی مقام پر جمع کریں۔ میرے لڑکے اور آپ کے خاوند کا خیال ہے کہ اب دیر درست نہیں۔ ان کی رائے میں ہم پہلی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن ایک بہادرانہ سعی خواہ وہ ناکام کیوں نہ ہو اہلِ مُلک کو بیدار کرنے میں بڑی ممد ہوتی ہے۔ موجودہ حالت میں ہم ہسپانیہ کو تو ناک چنے چبوا سکتے ہیں۔ اور آدھا مُلک آزاد کرا سکتے ہیں۔ مگر فرانس کے مُنہ نہیں آ سکتے۔ ان کا خیال ہے فرانس باوجود ہماری مصالحانہ روش کے ہمارا قلع قمع کر دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ دُنیا کی اس بہترین مسلح قوم سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے گو ہمیں شکست کا یقین ہے تاہم ابتدائی ایثار اور حوصلہ مندی کا وقت آ پہنچا ہے ہمیں شکست سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اور فتح و کامرانی کا کام آئندہ نسلوں پر چھوڑ

دینا چاہیئے۔

میں اور میرے بچے راضی ہو گئے۔ مگر میں نے فرانس کو خوش رکھنے کا ذمہ اُٹھایا اور کم از کم ایک کوشش کرنے کی اجازت چاہی۔ اس نوجوان نے جواب تک خاموش بیٹھا تھا کہا کہ اس سعیٔ لاحاصل سے ہم منع نہیں کرتے۔ مگر آپ کے لیئے بہتر ہے کہ جو وقت آپ کو اس بے نتیجہ کام پر صرف کرنا ہے اسے کسی دوسرے مفید کام میں لگائیں۔ مگر میں نہ مانی۔ مجھے یقین تھا کہ فرانس کے حریت پسند لوگ ہماری آزادی کی آرزوؤں کی حوصلہ افزائی کریں گے کیونکہ میں اور میری لڑکی نے اپنی تقریروں میں فرانس کی تعریف اور ہسپانیہ کی مذمت شروع کر دی تھی۔ اب ساتھ ساتھ ۱۵ شعبان کے اجتماع میں شامل ہونے کے لیئے لوگوں سے درخواست بھی شروع کر دی۔

۱۵ شعبان کی خوشگوار صبح کو طیور نے اپنی زبان بے زبانی میں وطن عزیز کی تعریف کا ترانہ سبز شاخوں پر بیٹھ کر گایا۔ میں اُٹھی دیکھا کہ راتوں رات فوجی خیمے نصب کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان پر مراکش کی آزادی کا جان سے پیارا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ رورو نزدیک سے حزب وطنی کے ممبر آنے شروع ہو گئے۔ دس بجے سب کو قطاروں میں کھڑا کر کے گنتی لی گئی۔ تین ہزار کی حاضری ہوئی۔ میرا دل بیٹھ گیا لیکن پہلی دفعہ مجھے نوجوان عبدالکریم کے چہرہ پر خوشی کے آثار نظر آئے۔ میں نے افسوس سے کہا کہ دس ہزار ممبروں میں سے تین ہزار کی حاضری۔ وہ تبسم کر کے بولا کہ بانی مراکش کے نوجوانوں میں لوح آزادی کی بین دلیل ہے۔ اگر ایک ہزار نوجوان بھی آتے تو میں ملک کی خوش قسمتی پر ناز کرتا۔ میں نے

کہا تعجب ہے، اس نے کہا ہاں تعجب ہے۔ وہ خوش خوش خیمہ میں چلا گیا۔ پچیس تیس منٹ کے بعد یہ بانکا جوان ایک خوشنما فوجی وردی پہن کر سوار ہو کر نکلا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نوجوان محبانِ وطن کے سامنے پہنچ کر بولا:۔

اے محبوب وطن کے عزیز فرزندو! جو قوم سیاسی آزادی کو کھو دیتی ہے وہ ان قوتوں سے محروم ہو جاتی ہے جو فطرت نے ہر انسان کو بخشی ہیں۔ بہادری اولوالعزمی جو روحِ حیات ہے۔ بتدریج ضائع ہو جاتی ہے۔ وہ ممیانے والی بھیڑ بکریوں کا گروہ بن کر رہ جاتی ہے۔ جو چوں وچرا کئے بغیر چروا ہے کے لٹھ سے ہانکی جاتی ہے۔ رفعتِ خیال اور غیرت کا احساس مُردہ ہو جاتا ہے۔ اہلِ ملک پر پژمردگی چھا جاتی ہے۔ اور ملک کی قدرتی پیداوار اور دولت دوسروں کے کام آتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ تم نے وطن کے نام پر ایک انجمن بنائی ہے۔ گویا تمہیں آزادی کی نعمتوں کا پورا احساس ہے۔ آؤ ہم تم ملک کو آزاد کرائیں۔ اس طرح ان شرافتوں اور قوتوں کو جو آزادی کے ساتھ ہی انسان میں باقی رہتی ہیں، محفوظ کر لیں۔ اور ملک کی دولتوں کو تنہا اہلِ ملک کے لئے مخصوص کر دیں۔ بہادرو آؤ ہم مر کر دوسروں کو زندہ کریں۔ اپنے لئے حیوان بھی زندہ رہتے ہیں۔ صرف شریف ہی اپنی ذات کو قربان کر کے دوسروں کی زندگی کا باعث ہوتا ہے۔ ایسے پاک جذبات رکھنے والا موت کے بعد ابدی زندگی پاتا ہے اور خدا کی بادشاہت میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں شیریں پھلوں سے لدے ہوئے سایہ دار درخت بہنے والے شفاف پانی پر جھک رہے ہیں۔ وہاں تمہارے ارادوں کی تعمیل اور خوشیوں کی تکمیل ہو گی۔ آؤ، یہاں ٹھیرو۔ اب گھر نہ جاؤ۔ وہ

خوبصورت دُنیا جس کو بہشت کہتے ہیں۔ بے تابی سے تمہاری منتظر ہے۔

کچھ لوگ واپس آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے ہیں انہیں روکنا چاہتی تھی مگر عبدالکریم نے منع کیا کہ جانے دو مصلحت ان کے نہ روکنے کی متقاضی ہے۔ میں چُپ ہو گئی۔ جو رہے ان کو خیموں میں جگہ دی گئی۔ شام کے وقت کوٹھی کے زیرِ زمین دروازے کھول دیئے گئے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہر طرف سیمنٹ کا فرش اور دیواریں ہیں۔ اندر بجلی کا کارخانہ، روشنی کا مکمل انتظام، اسلحہ خانہ بارود خانہ تین ہوائی جہاز، ایک سو توپیں، مسلح موٹریں اور دیگر انواع اقسام کا سامان موجود تھا۔ رات کی تاریکی میں توپیں پہاڑی پر لے جانے کا انتظام کیا جہاں پتھروں کے نیچے مورچے تیار تھے۔ اوپر کے پتھروں کو ہٹایا گیا۔ توپوں کو نصب کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ تجارتی کوٹھی کے کارندے بھی فوجی تربیت یافتہ ہیں۔ انہوں نے توپوں کا چارج لے لیا۔ عبدالکریم نے توپ داغنے کا حکم دیا۔ میں نے منع کیا۔ وہ مسکرا دیا۔ اور دُوربین سے ہسپانی شہر کے استحکامات کو دیکھنے لگا اور کہا کہ ہاں دغے۔ اڑادھم۔ اڑادھم۔ توپیں دغنی شروع ہوئیں۔ پانچ چھ چلی تھیں۔ اس نے کہا ۲۵ کے زاویہ پر آبادی کے قریب۔ پھر دو تین توپیں دغیں اور سناٹا چھا گیا۔

وہ پہرہ لگا کر سونے کو جانے لگا۔ میں نے کہا یہ کیا۔ کہا تم نے زبان سے اور میں نے توپ کے منہ سے لوگوں کو بلایا ہے۔ تم نے اپنے بلاوے کا آج نتیجہ دیکھا۔ میں کل دیکھوں گا۔ آج تمہاری انجمن کے ممبروں نے واپس جا کر ہماری عسکری تیاری اور فوجی بھرتی کا لوگوں میں ذکر کیا ہو گا۔ کچھ گولے آبادی

کے قریب گرائے گئے ہیں۔ اس لئے ان کے بیان کی تصدیق ہو گی۔ ملک کے بہادر نوجوان بھاگ بھاگ کر آئیں گے۔ میں نے کہا "مگر تم نے دشمن کو خبر کر دی۔ وہ اسی وقت حملہ کر دے تو؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "نہیں ہمسائے رات بھر سراسیمہ رہیں گے۔ دن کے وقت معمولی بات سمجھ کر دیکھ بھال کو فوج بھیجینگے توپوں کی زد میں آ گئے تو بچ کر نہ جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ گیا اور جا کر سو گیا۔

میں تمام رات بیقرار رہی۔ پہرے بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو واقعی ہزاروں نوجوان بندوقیں کندھوں پر اُٹھائے ہماری فوج میں شامل ہو گئے۔ وہ بوڑھا تاجر اور میرا خاوند صبح ہی سے دُوربین لے کر دشمن کے حملہ کا انتظار کرنے لگے۔ یک بیک میرے خاوند نے کہا "عبدالکریم کو بلاؤ"۔ عبدالکریم اُوپر آ گیا۔ اور بغیر کسی تشویش کے دُوربین لے کر دیکھنے لگا۔ پھر گھڑی دیکھی اور توپچیوں کو حکم دیا کہ ٹھیک گھنٹے کے بعد ۷۵ کے زاویہ پر گولے گرانا اور مجھے بلا کر پھر پہاڑی کے نیچے اُتر گیا۔ نئے والنٹیروں کی قطاریں بندھوا کر معائنہ کیا۔ پلاٹون بنائے اور پلاٹون کمانڈر نامزد کئے۔ قواعد سکھلانے کے لئے اپنے پُرانے تجارتی عملہ میں سے لوگ رکھے۔ ان رنگروٹوں کا خاطر خواہ انتظام کر کے پھر پہاڑی پر چلا گیا۔ توپیں چلنا شروع ہوئیں۔ دشمن کے گولے بھی دُور دُور گرنے لگے۔

تین گھنٹے کی گولہ باری کے بعد وہ نیچے آیا۔ اور دو ہزار مضبوط جوانوں کو تیاری کا حکم دیا۔ میرے خاوند کے ساتھ کھانا کھایا۔ مشین گن اور مسلح موٹریں

لے کر دشمن کے استحکامات کی طرف کوچ کر دیا۔ رات کے نو بجے ہمارے سپاہی لاکھوں روپے کا سامانِ حرب لے کر واپس لوٹے۔ معلوم ہوا کہ ہسپانیہ کی بیرونی چوکی پر جدید ساخت کی توپیں نہ تھیں۔ نہ اُن کے افسروں کو یہ وہم و گمان تھا کہ مراکشی محبِ وطن جدید اسلحہ سے مسلح ہیں۔ وہ پُرانی قسم کی توپیں لے کر بڑھے اور ہماری دُور رس توپوں کی زد میں آ گئے۔ سینکڑوں مر گئے اور جو زندہ بچے وہ لاکھوں کا سامان وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس ابتدائی فتح نے مُلک میں ہلچل ڈال دی۔

عبدالکریم نے واپس آن کر کہا کہ ایک ماہ کی مہلت مل گئی ہے اس عرصہ میں ہم نئے آدمیوں کو قواعد سکھا سکیں گے اور مشین گن کا استعمال بھی بتا سکیں گے۔ انشاءاللہ ۳۰ روز میں اچھی تربیت یافتہ فوج مہیا ہو جائے گی میں نے کہا کیا مہینے کے اندر ہسپانیہ والے حملہ نہ کر دیں گے۔ اس نے کہا نہیں۔ وہ جدید قسم کی توپیں لے کر آئیں گے۔ پچھلی چھاؤنی میں سامان کافی ہے۔ مگر اسی جگہ لڑنے کا۔ ہمارے اندر اتنی قوت نہیں کہ ہم یکبارگی چھاؤنی پر ہلّہ بول دیں۔ اور ان کے لئے یہ مصلحت نہیں کہ چھاؤنی کو خطرے میں ڈال کر چوکی کو مسلح کریں۔ اس لئے اس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے میڈرڈ سے سامان منگوانا پڑے گا جس میں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ لگ جائے گا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ ہسپانیہ کی چوکی ایک فوجی مرکز بن گئی۔ میرے خاوند نے ایک جاسوسی محکمہ بنایا۔ جو دشمن کی نقل و حرکت کا پتہ دیتا تھا۔

اُنہوں نے ہسپانوی چوکی کے قریب لاسلکی کا آلہ لگا رکھا تھا۔ جو ہمیں ہر طرح کی اطلاع بہم پہنچاتا تھا۔ ایک دن معلوم ہُوا کہ دشمن کی فوجوں کو آدھی رات حملہ آور ہونے کا حکم ہُوا ہے۔ اور ان میں سرگرمی سے تیاریاں جاری ہیں۔ ہماری خوش قسمتی سے ہسپانوی جرنیل کوتاہ اندیش تھا۔ اس نے تصوّر کر لیا کہ ہمارے پاس آلاتِ حرب نہیں۔ وہ بے غل وغش بڑھے۔ ہم نے ہر طرف سرچ لائٹ کا سامان درست کیا ہُوا تھا۔ جونہی ان کے بڑھنے کا علم ہُوا۔ سب توپچی تیار ہو بیٹھے، جب خوب بڑھ آئے تو سرچ لائٹ کی بدولت رات دن سے زیادہ روشن ہوگئی۔ توپیں اور مشین گنیں بلا کی طرح دشمن پر گولوں اور گولیوں کا مینہ برسانے لگیں۔ قبل اس کے کہ وہ توپوں کی خبر لیں، اُنہوں نے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ توپوں کی گولہ باری روک دی گئی۔ عبدالکریم دہزار مجاہدوں کو لے کر بڑھا۔ تھوڑی سی لڑائی کے بعد چوکی پر قبضہ کرلیا۔ کم از کم دو کروڑ کا سامانِ حرب اور ہزاروں اسیرِ جنگ ہاتھ آئے ہسپانیہ کا وقار خاک میں مل گیا۔ اُمراء تو قوت کے سامنے جُھکتے ہیں، ہماری مالی امداد کرنے لگے۔ علماء نے عبدالکریم کو غازی کا خطاب دیا۔ صوفیوں نے غائبانہ امداد کا وعدہ کیا۔ عوام میں جذباتِ قومی کا طوفان اُمنڈ آیا۔ اب ہسپانیہ کا مقابلہ کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر عبدالکریم ان آدمیوں میں سے نہ تھا، جو بے ضرورت ایک آدمی کا بھی نقصان گوارا کرسکیں۔ وہ اندھا دُھند چھاؤنی کی طرف نہیں بڑھا بلکہ چوکی پر اڑ گیا۔

میرے خاوند کی تجویز پر قرار پایا کہ اوّل دشمن کے بارود خانہ

کو آگ لگائی جائے اور پانچ سو نوجوان شہر کی طرف سے جا کر قبرستان پر قابض ہو جائیں اور وہاں سے حملہ کریں۔ جب بارود خانہ اُڑ جائے تو عبدالکریم اصلی فوج کو لے کر بڑھے۔ اس سکیم کے مطابق بارود خانہ اُڑانے کے ہلاکت انگیز کام کا قرعہ میرے منجھلے بیٹے کے نام پڑا جس کی عمر ۱۲ سال تھی "کہ کمسن بچے پر دشمن کو شبہ نہ ہو۔ اور بڑا لڑکا جس کی عمر ۲۵ برس تھی پانچ سو کی فوج کا کمانڈار مقرر ہوا۔ ماں کے جگر کا حال نہ پوچھئے۔ میرے دل کو دھکا سا لگا چکر سا آیا۔ کیونکہ بچ کر آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ماماً نے کہا خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ شرافت نے کہا صبر کرو۔ افراد کی موت قوموں کی حیات ہے۔ قوموں کی کھیتیاں نوجوانوں کے خون سے سینچی جاتی ہیں، جو پیدا ہوا مرے گا۔ وہ چاہے تو بسترِ علالت پر موت کو پسند کرے اور چاہے تو میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دے کر جامِ شہادت پیئے۔ اجل سے اگر ممکن ہو تو کوئی جان چھپائے۔ اس لئے چلو بستر پر مرنے کی بجائے میدانِ کارزار میں مرنا بہتر ہے۔ آخر الذکر موت دُنیا میں اہلِ دنیا کے لئے مفید اور آخرت میں خود اپنے لئے فائدہ رساں ہے۔ اس لئے کوئی دُور اندیش ماں قربانی سے بیٹے کو منع نہیں کر سکتی۔ یہ صرف عورتوں کی کوتاہ اندیشی ہے کہ رو رو کر جان کھوتی ہیں۔ بالآخر وہ معرکہ کی رات آ گئی۔ بڑا لڑکا ۵۰۰ جانباز سپاہیوں کو لے کر چلا اور منجھلا لڑکا گھسیارے کے بھیس میں ایک ہمراہی کے ساتھ نکلا۔ میرا دل خون بن کر آنکھوں سے بہ نکلا۔ تاہم میں نے دونوں بچوں کو پیار کیا۔ خدا حافظ و ناصر کہا۔

ور تاکید کی ۔ بیٹا پیٹھ نہ دکھانا ۔ یا تو کام کر کے آنا یا وہیں ڈھیر ہوجانا ۔

بڑے لڑکے نے حکمت سے کام لیا ۔ دو تابوت بنائے ۔ ان میں مشین گن رکھی ۔ اوپر اوپر سے کپڑا ڈال کر مردہ دفنانے کے بہانے کلمہ پڑھتے قبرستان چلے گئے ۔ ہسپانیہ کے کارندوں نے مردوں کے تابوتوں اور قبر کھودتے مردوں کو دیکھا ۔ "دنیا فانی ہے" کہتے اور افسوس کرتے چلے گئے ۔ زیادہ خطرناک اور اہم کام میرے منجھلے بیٹے کے سپرد تھا ۔ اسی پر قسمتوں کا فیصلہ تھا ۔ وہ سر پر گھاس کی گٹھڑی اٹھا کر دشمن کی فوج میں گیا ۔ دیر تک دام کے لئے جھگڑتا رہا ۔ شام کو گھاس بیچی ۔ پہرہ دار سے آنکھ بچا کر بارود خانہ کے پاس گیا ۔ دیوارشکن آلے کے ساتھ نہایت سرعت سے سوراخ کیا ۔ فتیلہ اس میں رکھ کر آگ لگا دی اور پکار کر کہا کہ میری ماں کو کہہ دو کہ میں کامیاب ہوگیا ۔ یہ سب کچھ اس کے ہمراہی جاسوس نے بتایا ، جو دور کھڑا حالات کا مطالعہ کر رہا تھا ۔ غرض قیامت کا دھماکا ہوا ۔ لڑکا بارود کے ساتھ اڑ گیا ۔ قبرستان سے مشین گنوں اور بندوقوں کے فائر ہوئے ۔ عبدالکریم متانت سے بولا کہ ہم کامیاب ہو گئے ۔

ہسپانوی پہلے تو سراسیمہ ہوئے ۔ پھر توپوں کا رخ قبرستان کی طرف پھیر دیا ۔ گولوں سے قبرستان کی زمین میں گڑھے پڑ گئے اور گڑے مردے اکھڑ آئے ۔ پانچ سو جوانوں میں سے ایک بھی نہ بچا ۔ عبدالکریم کے توپ خانہ نے دشمن پر آگ برسانی شروع کی ۔ دشمن سمجھے کہ غنیم دو

پہلوؤں سے بڑھ رہا ہے۔ توپوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ اپنی نصف طاقت اور سامانِ حرب یوں ضائع کیا۔ پھر مقابلہ کیا۔ تاب نہ لا کر بھاگے۔ چھاؤنی کی حد بندیاں بلند جگہ پر تھیں۔ اس لئے انہیں نشیب کی طرف ہٹنا پڑا۔ ہم زور کر کے چھاؤنی تک پہنچے۔ بلند جگہ سے پست ہمت دشمنوں کو نشانہ اجل بناتے رہے۔ وہ سامان چھوڑ جان لے کر بھاگے۔ میرے دو بیٹے کام آئے مگر کام کر گئے۔

ہسپانیہ نے فرانس سے امداد چاہی۔ میں نے باوجود عبدالکریم کے منع کرنے کے فرانسیسی جرنیل سے فرانس کی حریت نوازی کا واسطہ دے کر غیر جانبدار رہنے کی استدعا کی مگر وہ نہ مانا۔ اور کہا کہ باغیوں سے چشم پوشی نہیں ہوسکتی۔ میں ناکام واپس آئی۔ عبدالکریم کو دوسری جنگی تیاریوں میں مصروف پایا۔ وہ میرے چہرہ سے میرے مشن کی ناکامی کو بھانپ گیا اور خاموش رہا۔ رات کو میں، میرا خاوند اور عبدالکریم کھانے پر بیٹھے۔ تو عبدالکریم آہستہ سے بولا، بیگم صاحبہ! تم منع کرنے کے باوجود گئیں اور ناکام لوٹیں۔ تم نے قوموں کے اخلاق کا افراد کے اخلاق پر اندازہ کیا ہے۔ ایک آدمی انصاف کرسکتا ہے۔ قومیں اپنے مفاد کو چھوڑ کر رحم کی اپیلوں سے متأثر نہیں ہُوا کرتیں۔ کیا فرانس نہیں جانتا کہ آج ہسپانیہ کی تو کل ہماری باری ہے۔ فرانس کو ہماری تیاری جانبازی اور عسکری تربیت کا علم نہ تھا اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ہم ایک یورپی طاقت کے مقابلہ کی تاب لا سکیں گے۔ ورنہ وہ پہلے ہی جنگ میں آ کُودتا۔ خیر اچھا ہُوا

جو فرانسیسی جرنیل نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔

اس فاتحانہ جنگ کے بعد غیر ملکوں میں اہلِ مراکش کی قدر ہونے لگی۔ ملکی لوگوں کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے عبدالکریم کو مولائی کہہ کر پکارا۔ اُمراء نے روپے سے مدد کی۔ صوفیوں نے دُعا دی۔ عُلماء نے عبدالکریم کو غازی کہا۔ غازی موصوف نے فوج کو فوراً ہلہ بولنے کا حکم دیا۔ قبل اس کے کہ ہم شبخون ماریں۔ فرانسیسی، چھاؤنی کی لاکھوں پونڈ کی عمارتیں تباہ کر کے راتوں رات توپوں کی پناہ میں چلے گئے۔ ہم نے اس چھاؤنی پر قبضہ کر کے عمارتیں بنانی شروع کر دیں۔

ہم سب فرانس کی پسپائی سے خوش تھے لیکن میرا شوہر اور غازی بڑے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ پھر رات کے کھانے پر غازی نے گہری سانس لے کر کہا کہ فرانسیسی ہوشیار سپاہی ہیں۔ وہ ہمارے لئے ابتدائی فتح سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع بھی چھوڑ نہیں گئے۔ مبادا دُنیا کو یہ معلوم ہو کہ اہلِ مراکش کے ہاتھوں افواجِ فرانس نے شکست کھائی۔ اب عبدالکریم خندقوں کے بنانے میں مصروف ہو گیا۔ کیونکہ اس کی رائے تھی کہ کھلے میدان میں ہم فرانسیسیوں سے جنگ نہیں کر سکیں گے۔ پے در پے فرانسیسی فوج اور سامانِ جنگ میں اضافہ ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ ہم نے مدافعت کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ فرانس کی فوج میں جب حملہ کی ابتداء کا حکم ہُوا تو ہمیں علم ہو گیا۔ غازی کئی رات نہ سویا تھا۔ آج سرِ شام سو گیا۔ دس بجے تازہ دم ہو کر اُٹھا۔ ٹھیک سوا گیارہ

بجے فرانسیسی مرکز سے شعلہ بلند ہؤا ۔گولہ ہمارے استحکامات پر آن کر پھٹا۔ اس کے بعد توپ چلنے کی آواز آئی ۔کیونکہ گولہ آواز کے پہلے آکر گرتا تھا مطلع صاف تھا۔آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے ۔گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔دونوں طرف سے گولیوں کی روشن چادریں برسنی شروع ہوئیں زخمیوں کی زبان سے نعرۂ فغاں اُٹھا۔خون کے ندی نالے بہنے لگے۔ فرانسیسیوں کو ہماری قوت کا پھر بھی غلط اندازہ تھا۔توقع سے زیادہ مقابلہ اور اپنے کشتوں کے پشتے دیکھ کر وہ بھیگی بلی کی طرح پھر جہازوں کی پناہ میں چلے گئے۔صبح کو طرفین نے اپنے مردے اور زخمی اُٹھانے کی مہلت پائی ۔رات بھر میں تیرہ ہزار مجاہد شہید ہوئے اور بیس ہزار زخمی ہو گئے ۔فرانسیسی فوج کے زخمیوں اور مقتولوں کی تعداد کا اندازہ اس سے زیادہ تھا۔

میں سخت غمگین ہوئی مگر غازی عبدالکریم اور میرا خاوند بہت مسرور ہوئے ۔انھوں نے تمام دُنیا میں لاسلکی کے ذریعے پیغام بھیجے۔ فرانسیسی فوج کے اخباری نمائندوں نے ہماری بہادری اور علوِ ہمت کی تعریف کی۔انگلستان ،جرمنی اور امریکہ کے آزاد باشندوں نے بے تار برقی کے ذریعے تہنیت کے حوصلہ افزا جوابات بھیجے ۔تین دن طرفین خاموش رہے ۔فرانسیسی افواج بلند مقام پر تھیں۔اس لئے انہی کے حملہ کا انتظار کرنا تھا ۔فرانس کی کمان جنرل فوچ کے ہاتھ میں آگئی ۔ جس نے چوتھے روز ہمارے قلب پر دھاوا بول دیا۔انسانوں کے جسم

گولوں سے روئی کے گالوں کی طرح دُھنکے گئے۔ فرانس کا ہوائی بیڑا سر پر منڈلاتا نظر آیا۔ آسمان سے آگ برسنی شروع ہوئی۔ ہماری حالت مخدوش ہو گئی۔ غازی نے سب افسروں کو واپسی کا حکم دیا۔

ہم مُردے میدان میں چھوڑ کر پلٹے اور خندقوں میں پناہ لی۔ جنگ میں وہ تُندی نہ رہی۔ میں ہمہ تن زخمیوں کے معالجہ میں مصروف ہو گئی۔ فرانسیسی ہوائی بیڑے کے بل پر برابر بڑھ رہے تھے۔ اس عرصہ میں بم باری کی وجہ سے ہماری رسد رسانی کا سلسلہ بار بار خطرہ میں پڑ جاتا تھا۔ فرانسیسی تیاریوں اور بمباریوں کا ذکر سُن کر اور ہمیں خندقوں میں پڑے دیکھ کر اُمراء نے ہاتھ کھینچ لیا۔ علماء اور مشائخ ہمیں ملامت کرنے لگے۔ کہ ناحق ملک میں فتور کا باعث ہوئے۔ ان کے طرزِ عمل سے عوام کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ اور ہماری مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہمارے پاس مشکل سے ایک ماہ کی لڑائی کا سامان موجود تھا۔ غازی اپنی کمزوریوں کو کمال حکمت سے چھپاتا رہا۔

جب ہمارے پاس صرف ۱۵ روز کا سامان رہ گیا تو خندقوں سے نکل کر حملہ آور ہونے کا حکم دے دیا گیا۔ پہلے پستول پھر چھُری کٹاری چلی۔ آخر بہادر بہادروں سے لپٹ گئے۔ اگر جنگ انہی حربوں تک محدود ہوتی تو فرانس کے وقار کا جنازہ اُٹھ جاتا، مگر ہوائی طاقت کے مسلسل استعمال نے ہمیں خاک میں ملا دیا۔ لاکھوں ٹن بم تین دن میں گرے۔ ایک کے بعد ایک خندق ہم نے کھوئی۔ میرا خاوند لڑتا لڑتا شہید ہوا۔

میری لڑکی خندق سے زخمی اٹھاتی وہیں ڈھیر ہوئی، باوجود ہسپتال میں کام کرنے کے میں بھی زخمی ہوئی۔

مولائی کریم گرفتاری کے آدھ گھنٹہ پہلے ہسپتال میں آیا۔ میرے زخموں کو بوسہ دیا۔ اور کہا بیگم صاحبہ تم مراکش میں سب سے زیادہ خوش قسمت عورت ہو جس نے اپنے تین بچے ملک اور قوم کی حرمت پر نثار کئے۔ جس کا خاوند اہل ملک کی خدمت کرتا ہوا شہید ہوا۔ اگر جنگی اخلاق کی رو سے فوج کے اعلےٰ کمانڈر کا خطرہ میں کودنا بزدلی نہ ہوتا تو میری لاش تمہارے محبوب خاوند کے پہلو میں ہوتی۔ اکثر ہزیمت خوردہ جرنیلوں کا وہی حشر ہوا جس کی مجھے توقع ہے یعنی اسیری۔ جرنیل کے لئے اگر خودکشی بزدلی کے بدترین داغ کی مترادف نہ ہوتی تو میں اپنے پیارے دوست کے پاس جا پہنچتا۔ مگر میری قسمت میں اسیری لکھی ہے جو بہادر اور غیور سپاہیوں کے لئے بدترین اذیت ہے۔ میرے محبوب وطن اور اہل وطن کو پیغام دو کہ وہی ملک آزاد اور وہی قومیں با اقبال رہتی ہیں جس کے بچے ان تھک قربانی کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ پانی جب رُک جاتا ہے تو اس میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے۔ قربانی کا سُرخ خون جب روانی سے رُک جاتا ہے تو قوموں کی عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔ شکستوں کے بعد فتح ہوتی ہے۔ اس شکست سے فتح کی اُمید لے کر اُٹھو۔ حوصلہ نہ ہارو۔

جرنیل چلا گیا۔ میرے زخموں کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا۔ یہ خون بند نہیں ہو سکتا۔ میں زخموں سے نڈھال ہو گئی۔ میری ۱۴ برس کی لڑکی اور

چھ برس کا لڑکا کھیل میں مشغول تھے۔ انہیں نہ مرا کش کی بدقسمتی کا علم تھا۔ نہ خاندان کی معیبت کا خیال۔ لڑکا کھیلتے کھیلتے میرے پاس آگیا، اور کہا۔ ماں، آؤ، اُٹھو۔ میرے ساتھ کھیلو۔ میں نے کہا، اب تم دونوں آپس میں کھیلتے رہنا۔ مگر لڑکا نہیں۔ لڑکی نے تتلی زبان سے پوچھا۔ اتا کہاں؟ بھائی جان کہاں؟ میں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ وہ تمہارے لئے باغ میں میوے لینے گئے ہیں۔ پھر بولی، ابا جان بھی وہیں ہیں؟ لڑکے نے میرا ہاتھ کھینچ کر کہا۔ اچھی اماں چلو اُٹھو، اُن کے پاس چلیں۔ میں نے کہا، تم یہیں کھیلو، میں اکیلی اُن کے پاس جاتی ہوں اور بُلا لاتی ہوں۔ اُنہوں نے کہا، اچھا ہم کھیلتے ہیں اُنہیں جلدی بُلا کر لانا۔ اور باغ سے پھول بھی لانا میرے لئے بولنا دشوار تھا۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اس لئے بمشکل آہستہ سے اچھا کہہ سکی۔ ایک ہچکی آئی۔ جان جسم سے رخصت ہوئی۔ اور میں یہاں پہنچ گئی۔"

سب غش غش کر اُٹھے۔ میری زبان سے بے ساختہ صدائے صد آفریں نکلی۔ ایک گھڑی کے استغراق کے بعد خود کردہ را علاجے نیست کا مقولہ یاد آیا۔ اپنے اعمال پر نظر پڑی۔ اور میں مضطرب ہو گیا۔ اضطراب میں دلِ بیتاب سے استدعا کی کہ اے دل وہاں لے چل جہاں کوئی ملامت کرنے والا نہ ہو۔ یا اس دُنیا میں چل جہاں بالکل تنہائی ہو۔ اور کوئی تماشائی نہ ہو تا کہ میں وحشت سے بغلگیر ہو کر اپنی بداعمالیوں کا رونا روتا رہوں۔

ایک پنجابی زمیندار کی کہانی

میں دل ہلکا کرنے کے لئے باآوازِ بلند رونا چاہتا تھا کہ زریں کمر ساتھی نے ایک اور گروہ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ تیرے خوش قسمت ہم وطن بیٹھے ہیں۔ میری توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ ایک بوڑھا بانکے جوانوں کی طرح مونچھوں کو بل دیئے بیٹھا تھا۔ ارد گرد کچھ مدراسی اور بنگالی ہشّاش بشّاش لوگ مصروفِ تکلّم تھے۔ میں پاس جاکر کھڑا ہوا کہ پوچھوں کس شہر و دیار کے رہنے والے ہو۔ قبل اس کے کہ میں سوال کروں اس بانکے جوان نے یوں کہنا شروع کیا:۔

"میں پنجاب کا باشندہ ہوں جہاں پانچ دریا چپہ چپہ زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ جہاں عشق کا دیوتا محبّت کے سبق پڑھاتا ہے اور حُسن کی دیویاں بے نقاب پھرتی ہیں۔ میں اس گھرانے کا فرد ہوں، حکومت جن کی لونڈی اور اقبال جن کا غلام تھا۔ مگر اب بازو میں زور نہ رہا۔ دلوں میں حوصلے نہ رہے، باوجود نہر اور دریا کے پانی کی افراط کے میرے گاؤں کے لوگوں کی کھیتیاں سوکھی ہوئی ہیں۔ باوجود ہوا کی محبت افزا تاثیر کے دلوں میں کدورت ہے۔ باوجود صحت بخش فضا کے چہروں کی بے رونقی ان کا نشانِ امتیازی ہوگیا ہے۔ ہر چند میں ملک میں اجتماعی اقبال اور ادبار کو بے حد قابلِ توجہ سمجھتا ہوں۔ مگر افراد اور خاندانوں کے تنزل

اور ترقی سے قوموں اور ملکوں کی ترقی اور تنزل کا آغاز ہوتا ہے۔اس لئے میں نے اپنی برادری کی اصلاح سے ملک کی ترقی میں اضافہ کی سعی شروع کی:۔

قرض

پہلے میں فوج میں ملازم تھا۔دو سال کی رخصت لے کر گھر آیا۔ خدا نے میرے گھر لڑکا دیا۔برادری کی رسومات کے صدقے پانچ سو روپے کی قربانی کرنی پڑی۔چھوٹی ملازمت میں کیا بچتا ہے۔ایک ماہ پانچ بچائے دوسرے مہینے سات خرچ ہو گئے۔تیسرے مہینے پلّہ برابر ہو گیا۔خیر خدا نے چاند سا لڑکا دیا تھا۔دل خوش تھا۔قرضہ لیا اور دل کھول کر خرچ کیا۔ماں بوڑھی تھی۔باپ بیمار تھا۔ہاتھ تنگ ہو گیا۔مگر ان کی مصیبت بھی دیکھی نہ جاتی تھی۔چاہا کہ اور قرض لوں اور ان کی خدمت کروں مگر ہر روز اُدھار کون دیتا ہے۔ناچار کچھ زمین رہن رکھی اور اُن کا علاج کیا۔ ایک تو میری ناداری کی شہرت ہوئی۔دوسرے والد کی عمر نے وفا نہ کی۔ اب ایک اور خرچ آ پڑا۔خوشی کا وقت مقرّر ہو سکتا ہے۔غمی ہمیشہ ناگہانی ہوتی ہے۔جنازہ گھر میں تھا۔میں باہر قرض کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔

برادری کے لوگ ایک تو تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔دوسرے رسومات کے مارے میری طرح نادار تھے۔لاچار میں نے مہاجن کے پاؤں

پکڑے۔ پگڑی پاؤں پر رکھ دی۔ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے بڑی مہربانی کی۔ ہزار دے کر پندرہ سو لکھوائے۔ دو پیسے شرح سُود پر راضی ہوا۔ تم کہو گے بڑی رقم لی۔ مگر کیا کرتا۔ لڑکے کی پیدائش پر پانچ سو خرچ کئے باپ کی مُوت پر ہزار نہ خرچ کرتا تو ناک کہاں رہتی۔ لوگ نہ کہتے کہ جس باپ کی کمائی اتنی دیر کھائی اُس کی قدر بیٹے کے برابر نہ ہوئی۔ خیر ایک ہزار خرچ ہوا۔ بقول برادری کے باپ کی مُوت درُست ہوئی۔ میں نے شُکر کیا۔ مگر مصیبتیں کب اکیلی اور پوچھ کر آتی ہیں۔ والد فوت ہوئے۔ والدہ بیمار ہوئی۔ بہت گھبرایا۔ بیوی کا زیور بیچا۔ مشکل سے کچھ دِنوں گزارہ کیا۔ اب ماں کی مُوت پر پھر رسُومات کا خیال پیدا ہوا۔ اب کیا کروں کدھر اور کس کے پاس جاؤں۔ مہاجن کا دروازہ پھر کھٹکھٹایا۔ پہلے قرض سے اصل چھوڑ سُود کی پائی نہ پائی تھی۔ میری صُورت دیکھ کر بولا۔ آؤ میاں صاحب کیا رقم چکانے آئے ہو۔ میں نے لجاجت سے کہا۔ نہیں مہاراج ماں کا جنازہ گھر پر پڑا ہے کچھ لینے آیا ہوں۔ اُس نے کہا بھائی یہ روپیہ میرے پسینے کی کمائی۔ کل تیرا باپ مرا۔ آج ماں مری۔ موت نے تیرا گھر تاک لیا ہے کل تُو چل بسا تو میرا قرض کون دے گا۔ میں تو پہلی رقم دے کر پچھتاتا ہوں۔ اِن تلوں میں تیل نہیں۔ اب جاؤ کسی اور کو اپنا ساہوکار بناؤ۔ جس پر میری سی کیفیت گزرے، وہ میرے حال کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ گھر میں لاش پڑی ہے۔ پلّے پیسہ نہیں۔ میں بچّوں کی طرح رونے لگا ساہوکار کی عورت گھر سے نکل آئی۔ میرا حال سُن کر خود بھی آنسو بھر لائی اور

لالہ کو کہا اچھا میرے حساب میں سے جو مانگتا ہے دے دے۔ خالی نہ پھیر۔ اس نے ہزار دے دو ہزار لکھایا اور شرح سود میں بھی اضافہ کیا۔ میں خوشی خوشی گھر آیا۔ حاتم ثانی بن کر چار و ناچار ہزار کا ہزار خرچ کر ڈالا۔ کوئی کیا کہتا کہ بیٹے کی پیدائش پر پانچ سو خرچ کیا۔ باپ کی مرگ پر ایک ہزار اور پیاری ماں کی مرگ پر سود و سو۔ میں نے کہا، وقت نپٹاؤ۔ برادری سے عزت بچاؤ۔ دل کھول کر خرچ کرو۔ پھر اللہ مالک ہے۔

غرض پانچ چھ ہزار کا مقروض ہو کر ملازمت پر گیا۔ سپاہی کی تنخواہ میں بچت کیا؛ پانچ گھماؤں زمین، اُس میں کتنی پیداوار ہوتی؛ باوجود جُزرسی کے قرضہ بڑھتا گیا۔ مہاجن کے تقاضے شروع ہوئے۔ میں نے نوٹس تک کا جواب نہ دیا۔ آخر دعویٰ ہوا۔ مجھ پر ڈگری ہوئی۔ ایمان کا تقاضا تھا کہ قرض لیا ہے تو زمین رہن بیع کر کے دو۔ مگر میں نے قانون کی آڑ لی۔ زمین قانونِ وقت کے مطابق ناقابلِ قرقی تھی۔ باقی پاس ہی کیا تھا۔ ڈگری کے اجراء پر بھی کچھ وصول نہ ہوا تو اُس نے وارنٹ جاری کروا لئے۔ میں چار ماہ کی چھٹی پر آیا اور آتے ہی دھر لیا گیا۔ ادھر افسروں کو میرے دیوالیہ ہونے کی خبر ہوئی۔ مجھے نوکری سے برخاست کر دیا۔ بیوی کو جس پر زر نچھاور کر کے گھر لائے تھے سر میں تیل ڈالنا میسر نہ تھا۔ بچہ جس پر سینکڑوں روپے نثار کئے تھے ننگا گلیوں میں پھرنے لگا۔ بیرحم برادری اُس کی رسومات اور اپنی حماقت پر میں لعنت بھیجتا تھا۔ مگر موقع کھو کر پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ میں جیل سے آیا گھر کی بدحالی کا یہ نقشہ دیکھا۔

کہ آخری برتن بک چکا ہے۔ اب بیوی باوجود فاقہ کے چکی پیستی ہے۔ میرے آنے پر وہ رو پڑی۔ بچے بھی رو دیا۔ اگر رونے سے گزارہ ہوتا تو اور روتے رہتے سوچا کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ لاچار زمین رہن رکھنے کی ٹھانی۔ پھر خیال آیا۔ زمین دوسرے کے قبضے میں دیکھ کر لوگ مجھے اور ذلیل سمجھیں گے۔ اس لئے بہ تقاضائے غیرت زمین رہن بلا قبضہ رکھی۔ یعنی زمین تو میرے قبضے میں رہی اور اُس پر سُود چڑھتا رہا۔

جب آدمی ایک دفعہ قرض لے کر کھاتا ہے تو اُس کا دل غنی اور ہاتھ کشادہ ہو جاتا ہے۔ قرض کے روپے کو بیگانی دولت سمجھ کر مہینوں میں اُڑاتا ہے۔ بمشکل زمین کے روپے پر دو سال امیری کی ہوگی کہ وہ روپیہ بھی ختم ہو گیا۔ اب چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لینی شروع کیں حتیٰ کہ میرا اعتبار جاتا رہا۔ کوڑی مانگے نہ ملتی تھی۔ پھر فاقوں کی نوبت آئی۔ ایک صبح میں اپنے مزارعین کے ہاں گیا۔ اور اُن سے معاہدہ کیا کہ بیل تمہارے، زمین میری اور محنت مشترکہ۔ پیداوار نصف نصف۔ وہ مان گئے۔ اس سے پہلے وہ میری خدمت کیا کرتے تھے اور میری امداد پر نظر رکھتے تھے۔ اب اُنہوں نے مجھے چھ ماہ کے لئے غلّہ اُدھار دیا۔

غیر شرعی پردہ:۔

میں صبح کھیتوں کو چلا گیا۔ چاشت کے وقت تک ہل چلایا۔ کچھ بھوک معلوم ہوئی۔ ہماری اُونچی ذات تھی۔ اور ہماری برادری میں

پردہ کی رسم جاری تھی۔ میرا ساجھی کمین تھا۔ اور پردہ اس کے ہاں متروک تھا۔ اس لئے میرے ساجھی کی عورت سر پر چھاچھ کا گڈوا دھرے اس پر رومال میں روٹیاں رکھے آگئی۔ ساجھی نے شرکتِ طعام کی دعوت دی۔ میں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میرے لئے بھی کھانا آرہا ہوگا۔ میں نے ہل چھوڑ حقہ تازہ کیا اور منہ گاؤں کی طرف کرکے کش لگانے شروع کئے۔ میں نے خیال کیا کہ عورت سلیقے والی ہے۔ روٹی ضرور پکائی ہوگی۔ کسی ہمسائے کے ہاتھ بھیج دے گی۔ جو عورت سر پر روٹی رکھے گاؤں سے نکلتی۔ میں اُمید کرتا کہ وہ میری روٹی لارہی ہوگی۔ ایک چلم پی۔ پھر دوسری بھری مگر دھوئیں سے پیٹ کب بھرتا ہے۔ ساجھی روٹی کھا چھاچھ پی اور ڈاڑھی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کام کو لگ گیا۔ میری آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔

ساجھی نے کہا، چودھری تیری روٹی تو اب آنے سے رہی، کام بھی نہ گنوا۔ میں شرمندہ سا ہُوا۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اُٹھا، دل میں عورت کو ہزار گالیاں دیں اور ہاتھ ہل پر ڈالا۔ نہ بہت کھا کر محنت ہو سکتی ہے، نہ بھوکے رہ کر۔ ہل سیدھا رکھنا مشکل ہوگیا۔ پھر میں نے عورت کو گالیاں دینی شروع کیں۔ ۹ بجے کی بجائے ۱۱ بجے ایک ہمسائے کے لڑکے کے ہاتھ روٹی آئی۔ میں نے شکر کیا اور اس خیال سے روٹی تھوڑی کھائی کہ اب دوپہر کی روٹی کا وقت ہُوا چاہتا ہے۔ دوپہر کا وقت گزرنے لگا تو میں نے بچی ہوئی روٹی کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر پانی کے گھونٹ سے کھالیا۔ اور خدا کا شکر کیا۔ لیکن دن قیامت ہو کر گزرا۔ آگ بگولا ہو کر

شام کو گھر آیا۔ بیوی کو بہت سخت سُست کہا۔ پھر بھی غصہ کی آگ فرو نہ ہوئی۔ لاٹھی لے کر برس پڑا۔ اُس نے نہ زبان ہلائی نہ ہاتھ اُٹھایا۔ جو کہا سُنا، جہاں پڑی سہی۔ میری ہمسائی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ دیوار کی اوٹ سے بولی، بھائی۔ جو کیا اچھا کیا۔ عورت کی کوئی قدر نہ سہی۔ انصاف ہی کیا ہوتا۔ صبح اُٹھ بجے روٹی پکائی۔ ۱۱ بجے تک لئے بیٹھی رہی، کون آئے کہ تمہارا کھانا کھیت پر پہنچائے۔ میرا لڑکا باپ کی روٹی دے کر آیا۔ تو تمہاری روٹی لے کر گیا۔ دوپہر کو میں نے اس سے کہا تو اس نے جواب دیا کہ میں کسی کے باپ کا نوکر ہوں؟ تم نے اپنے بچے کو مدرسے میں داخل کر دیا۔ مدرسہ دُور ننھی جان۔ وہ صبح جاتا ہے شام کو آتا ہے۔ میں نے کہا، تو بی بی کیا میں اس کو علم کی دولت سے محروم کر دوں۔ وہ بولی، بھائی بھوکے غریب کو علم اور ایمان کی دولت کہاں ملتی ہے۔ اس کو تو زندگی کے دن پورے کرنے قیامت ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں تو فرصت اور اطمینان کی ہیں۔ جس کو پیٹ سے فرصت نہ ہو وہ ایمان اور علم کی دولت کیسے حاصل کرے۔

میں نے کہا، بیٹے کو حصولِ علم سے تو نہیں ہٹا سکتا۔ وہ بولی۔ بھائی کسی کا بیٹا بھی ہر روز کھانا نہیں پہنچا سکتا۔ غصہ فرو ہوا تو ٹھنڈے دل سے سوچا۔ سات برس کا بچہ دو روٹیاں جس مصیبت سے لے کر آتا مجھ سے وہ سماں نہ دیکھا نہ جاتا۔ مگر کیا کرتا وہی پانچ سو جو اس کی پیدائش پر خرچ کئے تھے پاس ہوتے تو اس کی تعلیم ہی جاری

رہتی اور ایک ہاتھ بٹانے والا لڑکا پانچ روپے ماہوار پر رکھ لیتا۔ کب تک کوئی روٹی کھیتوں میں لائے گا۔ ایک دن میں قدرِ عافیت معلوم ہوگئی۔ مجبور ہو کر لڑکے کو مدرسے سے اُٹھایا۔ وہ روٹی وقت پر لاتا تو میں کھاتا اب سننے میں تن تنہا کام کرتا اور ساجھی کی بیوی بھی اُس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ لامحالہ زمین کو نصف تقسیم کرکے بیج ڈالا گیا۔ وہ جب کھیت ایک طرف سے سینچتا اُس کی بیوی دوسری طرف فصل کا ناکا بند کرتی اور کھولتی۔ وہ کھاد سر پر لاد کر کھیتوں میں ڈالتی۔ ان کی کھیتیاں لہلہانے لگیں۔ میں رہٹ چلاتا تو ناکا ٹوٹ جاتا۔ ناکا روکنے جاتا تو بیل کھڑے ہو جاتے۔ فصل سے زیادہ گھاس اور جھاڑیاں کھیتوں میں کھڑی ہو گئیں۔ بعض کھیت بالکل خشک ہو گئے۔ کاشت کی تو یہ صورت ہوئی۔ اب برداشت کا موقعہ آیا۔ وہ میاں بیوی دونوں کاٹنے بیٹھے جو فصل کاٹتے اُٹھا کر گھر ڈال دیتے۔ میں نے ایک دوسرے شخص کو اُجرت دے کر فصل کاٹنے میں شامل کیا۔ ماشکی، خاکروب، نائی، اور میراثی فصلانہ لینے آئے۔ لے دے کر چھ ماہ کی کمائی پانچ من غلّہ بچا۔ کمر ٹوٹ گئی۔ ساجھی نے حساب لگایا۔ اتنی ہی زمین میں سے چھ ماہ کا غلّہ رکھ کر دو سَو روپیہ کا اناج فروخت کیا۔ میں رات کو گھر میں جا کر لیٹ رہا۔ مگر کسی کل نیند نہ آئی۔ یہی فکر تھی کہ زندگی اس طرح کیونکر کٹے گی۔ نماز پڑھنے کھڑا ہوا۔ مگر وہاں بھی "چہ خورد بامدادِ فرزندم" کا نقشہ پیشِ نظر تھا۔ خیال کیا، چلو شہر چلیں۔ کوئی مزدوری

رکے کھائیں ۔ مگر شہر کے حالات بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھے ۔ مزدوری
رس وناکس کو کہاں ملتی ہے ۔ ہزاروں میری طرح فاقوں مرتے ہیں ۔
رکیا کروں خودکشی ؛ اوّل اسلام اجازت کہاں دیتا ہے ۔ پھر بیوی
بوں کا کیا ہوگا ۔ تو کیا میں بھی رذیلوں کی طرح عورت کو کھیت میں
لے جاؤں ۔ اوّل برادری کب گوارا کرتی ہے ۔ پھر مذہب کب برداشت
رتا ہے ۔ سوچتے سوچتے سُوجھا کہ در در دھکّے کھا کے قرض اُٹھانا
رہاتھ پھیلا پھیلا کر اُدھار کھانا کہاں کی شرافت ہے ۔ فاقہ مست کی
ادری میں توقیر کیا ۔ غریب کا ساتھی کون ؛ البتہ مذہب ایک
ز ہے جس کی حرمت کو جان دے کر بچانا چاہیے ۔ میدانِ غزا میں
ش اسلامی کے اظہار کا اب موقعہ نہیں ۔ ہمسائے کی خدمت ، یتیموں
پرورش ، غریبوں کی امداد جیسے مذہب کے احکام بجالانا تو اب
ے ممکن بھی نہیں ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں خود غیروں کی امداد کا مستحق
ں ۔ نمازوں میں پریشانی کی وجہ سے دِل نہیں لگتا ۔ صرف پردہ
رت کی ایک ظاہری نشانی میرے گھر رہ گئی ہے ۔ اب بی بی کو گھر کی
ردیواری سے نکالوں تو غیرت بھی گنواؤں ۔ یہ تو جیتے جی مجھ سے
ن نہیں ۔

خیر پانچ من غلہ ابھی باقی تھا ۔ کچھ اتنی فوری تشویش نہ تھی ۔ عورت
ے کپڑے پھٹے دیکھے ۔ میں نے کہا خیر ہے ، گھر میں بیٹھی ہے نا ۔ بچّہ ننگا
یھا تو تسلّی دے لی کہ ابھی بچّہ ہے ۔ بچّے ننگے ہی رہتے ہیں ۔ سردی

کے دن آ رہے تھے۔ شام کو ٹھنڈی ہوا چلی۔ لڑکے نے سینے میں درد کی شکایت کی۔ دو گھنٹے کے اندر اندر سانس لینے میں تکلیف ہو گئی۔ غلہ بیچا۔ حکیم کو بُلایا۔ دوا دی اور کچھ گرم کپڑے خریدے۔ بچے کو تو افاقہ نہ ہُوا۔ مگر تیسرے روز ہمیں فاقہ شروع ہو گیا۔ ہم میاں بیوی تو بھاڑ میں گئے۔ بچے کے مُنہ میں ڈالنے کو ایک دانہ گھر میں نہ تھا۔ پھر اس موقعہ پر وہی پانچ سو روپیہ یاد آیا۔ اے کاش اس وقت وہ روپیہ ہوتا۔ لیکن بہایا ہُوا پانی لُٹایا ہُوا مال کب ملتا ہے۔ بچے کی حالت دیکھی نہ گئی۔ ماں سرہانے بیٹھ کر رونے لگی۔ مگر باہر بھی آرام کہاں۔ اِدھر اُدھر پھر کر اضطراب سے واپس آیا۔ دیکھا بی بی کے پاس ایک عورت بیٹھی ہے۔ میرے آنے پر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ بیوی نے بتایا کہ یہ عورت یہاں کے قانونگو کے ہاں ملازم ہے۔ ایک ماہ کی رخصت پر جانا چاہتی تھی پانچ روپے اس نے دیئے ہیں۔ اپنے عوض مجھے رہنے کو کہتی ہے۔ میں نے روپے لے لئے ہیں۔ فیصلہ آپ پر چھوڑا۔

بے ایمانی :-

یہ پانچ روپے بھی پانچ ہزار کے برابر تھے۔ قرض مانگنے سے بھی نہ ملتا تھا۔ مگر عورت کو کسی کے ہاں کام کاج کو بھیجنا بھی گوارا نہ تھا۔ میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لڑکے کی حالت اضطراب انگیز تھی۔ میری اور میری بیوی کی حالت اس کو دیکھ کر بُری ہو رہی تھی۔ بیوی کے دوبارہ دریافت کرنے پر میں نے کہا، اچھا فیصلہ بھی کر لوں گا۔ تم بچے کے

مُنہ میں ڈالنے کا کچھ تو سامان کرو ۔ وہ خوش ہو گئی ۔ مجھے روپے دیئے میں سامان خورد و نوش لایا۔

چوتھے روز آہستہ آہستہ خدا نے بچے کو صحت دی ۔ وہ عورت غریب چوتھے روز آئی ۔ مجھے پھر غیرت آئی ۔ برادری کے خیال اور مذہب کے تخیل نے ہل کر روکا ۔ کہ میں عورت کو گھر سے باہر نہ جانے دوں ۔ اس لئے میں نے صاف جواب دے دیا ۔ وہ روتی روتی پڑوس میں گئی ۔ تو ہمسائے کی بی بی جس نے بیوی کو پیٹنے پر مجھے ملامت کی تھی، اوٹ میں سے بولی ، بھائی یہ بھی بڑی غریب ہے ۔ گھر جانا چاہتی ہے ۔ اس پر رحم کرو ۔ یا عورت کو کام پر بھیجو ، یا دام واپس کر دو ۔ باوجود اس امر کے جاننے کے کہ میری ہمسائی کو ان پانچ روپوں کا پورا علم ہے میں ڈھیٹ ہو کر بولا کہ کیسے روپے ؛ اس نے یہ سفید جھوٹ سُنا تو آہستہ سے یہ کہہ کر چلی گئی کہ غریب کا کوئی ایمان نہیں ہوتا ۔ میرے دل پر چوٹ تو ضرور لگی ۔ مگر کیا کرتا چُپ ہو رہا ۔ رات کی تنہائیوں میں خیالات کا ہجوم ہُوا ۔ اس ہمسایہ عورت نے جس تلخ حقیقت کا اظہار کیا تھا ۔ اس نے مجھے زمین سے آسمان تک پہنچا دیا ۔ پست اور بلند سب خیال آئے غریب اگرچہ بے ایمان کا لقب منظور نہیں کرتا ۔ مگر مذہب کے قوانین کے مطابق اس لقب کا پورا مستحق ہوتا ہے ۔ وہ زندگی کی ضرورتوں کے باعث بے ایمانی کرنے پر مجبور ہوتا ہے ۔ اس عورت نے جو غریبوں کو سرٹیفکیٹ دیا ۔ اُس کا مستحق ضرور تھا ۔ تاہم وہ میرے لئے قابلِ قبول نہ تھا۔

باوصف یہ جاننے کے کہ وہ سچ کہتی ہے ۔ میں اس سے سخت کبیدہ خاطر ہوا ۔ بعض لوگ مذہب کو سب چیزوں سے بالا رکھتے ہیں میں بھی ان میں سے ایک تھا مگر معلوم ہوا کہ سوسائٹی کا قانون یعنی رسم و رسومات سب چیزوں سے بالا ہیں ۔ لاکھوں نہیں کروڑوں نے میری طرح سوسائٹی میں عزت برقرار رکھنے کے لئے خاموش شہید کی طرح گھر بار لٹایا ۔ فاقے کئے ، جان گنوائی ۔ مذہب کے لئے اور خدا کے خوف سے لاکھ میں سے ایک گھر لٹاتا ہے ۔ اور فاقہ کرتا ہے اور کروڑ میں ایک خدا کے لئے جان خطرے میں ڈالتا ہے ۔ خدا کو انسان آسانی سے پس پشت ڈال دیتا ہے لیکن برادری کے قانون اور رسومات کو ٹھکرا نہیں سکتا ۔ برادری میں بدنامی کے ڈر سے پانچ روپے کھا کر مکر گیا حالانکہ میں نے خدا کے احکام کی خلاف ورزی کی مگر عوام کا مقابلہ نہ کر سکا ۔ شرافت اور مذہب کا تقاضا تو یہ تھا کہ بیٹا بے دوائی مرتا اور میں فاقوں جان دیتا ۔ مگر اس کا کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل ۔

رسمی پردہ :۔

اب میں نے اپنے عمل کا یوں تجزیہ کرنا شروع کیا ۔ رسم پردہ نے شرط پوری کرنے سے روکا ۔ ضرورت نے ایک غریب عورت کا روپیہ ہضم کرنے پر مجبور کیا ۔ اس طرح رسم کی پابندی یعنی سوسائٹی کے خوف اور ضرورت کی مجبوریوں نے خیانت پر آمادہ کر دیا ۔ خیانت خدا اور خلق

دونوں کے نزدیک جرم ہے، خدا علیم و شہید ہے۔ لیکن خلق جرم کا ثبوت
یا اقبالِ جرم چاہتی ہے۔ خدا سے کیا چوری ہو سکتی ہے۔ خلق سے چوری
کی کہ کھا کر مُکر گیا۔ اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اوّل تنگ دست انسان
خدا اور خلق دونوں کا مجرم ہوتا ہے، دوئم سوسائٹی کے قانون یعنی رسم
کی خدا کے قانون یعنی مذہب سے زیادہ پابندی کی جاتی ہے۔ حاصل
یہ کہ افلاس اور مذہب پہلو بہ پہلو نہیں رہ سکتے۔

اب سوال یہ تھا کہ آیا سوسائٹی کے قانون کا احترام اور تنگ دستی
برابر چل سکتی ہے یا نہیں۔ جیسا گذشتہ عمل کا تجزیہ کیا تھا۔ ویسے موجود
حالات پر یوں نظر ڈالی۔ برادری میں پردہ کی رسم عورت کو کھیت پر
جانے سے روکتی ہے۔ اس کا کہا مانے تو فاقہ موت کی دھمکی دیتا ہے۔
مجھ غریب کو زندہ رہنا ہے تو رسم ترک کرنا ہوگی۔ اس لئے جب تک
تنگ دستی دُور نہ ہو برادری کی رسم کے قانون خطرہ میں ہیں۔ میں
تمام رات جاگا۔ خودکشی اور ترکِ پردہ پر دل میں بحث جاری رہی جب
پردہ کے ترک کرنے کا خیال آتا تو غیرت کو ٹھیس لگتی کہ دُنیا کیا کہے گی
اور فاقہ کہتا کہ خوشی سے موت قبول کر۔

میں اپنے اُسی پرانے مزارع کے پاس گیا اور وہی شرط پیش
کی۔ کیونکہ اسے پچھلی دفعہ خاصہ فائدہ رہا تھا۔ بڑا خوش ہُوا اور اسی
شرط پر آئندہ فصل کاشت کرنے کا معاہدہ ہُوا۔

عورت کو اپنا عزم راسخ بتایا کہ رسمی پردہ ترک کرنا ہوگا۔ فاقہ

موت بن کر گھور رہا تھا۔ اُسے بھی اس کے سوا کیا چارہ تھا۔ چھ ماہ کے اُدھار پر مجھے اس سے گندم بھی مل گئی اور میں کسی قدر اطمینان سے صبح کام کو گیا۔ اوّل کھیت کو جھاڑیوں سے پاک کرنے لگا۔ مگر دل دھڑکتا تھا کہ عورت کو گھر سے باہر دیکھیں گے تو لوگ اُنگلیاں اُٹھائیں گے تنگ دستی مجبور کرتی تھی مگر دل دُنیا سے اُچاٹ تھا۔ بیوی ابھی گھر میں بیٹھی تھی۔ میں کھیتوں میں عرق عرق ہو رہا تھا۔ آہیں بھرتا تھا۔ اور گاؤں کی طرف دیکھتا تھا۔ کہ آج کیا ہوگا۔ کبھی لڑکے کی پیدائش کو منحوس کہتا تھا۔ کبھی ماں باپ کی موت پر الزام دیتا تھا، کبھی اپنی رسم پرستی پر لعنت بھیجتا تھا۔ جُوں جُوں چاشت کا وقت قریب آرہا تھا۔ میری جان پر بن رہی تھی۔ کئی دفعہ دل میں آئی کہ بے پردگی پر لعنت بھیجوں۔ عورت کو جا کر باہر آنے سے منع کر دوں مگر تنگ دستی روکتی تھی اور میں بیٹھے کا بیٹھا رہ جاتا تھا۔

آخر دیکھا کہ بیوی خود نہیں آئی۔ لڑکے کے سر پر روٹی دے کر بھیج دی ہے۔ میں نے شکر کیا۔ وقتی طور سے تسلی ہوگئی۔ مجھے لڑکے نے بتایا کہ ماں کئی دفعہ روٹی لے کر باہر آئی پھر اندر چلی گئی۔ آخر مجھے ہی بُلایا کہ جا روٹی لے جا۔ میں نے اپنے حال پر اس کا قیاس کیا کہ اس کو یک بارگی باہر آنے میں مشکلوں کا پہاڑ عبور کرنا ہوگا۔ جوں توں کر کے دوپہر کا وقت آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت چادر میں لپٹی چھوئی موئی بنی شرماتی، لجاتی، اکھڑی چال چلی آرہی ہے۔ چار پانچ چھوٹے

ڑکے لڑکیاں حیرت سے اُسے تک رہے ہیں۔ اور تماشا سمجھ کر ساتھ
ساتھ آرہے ہیں۔ جو راہ گزر جاتا وہ بھی چند منٹ دیکھنے کو رُک جاتا
ں سمجھ گیا کہ گھر والی ہے۔ ہاتھ سے کُدال رکھ دی۔ دھڑکتے دل سے اس
و دیکھنے لگا۔ اس کے لئے وہ راہ قیامت کی ہوگئی اور مجھ پر بھی حشر
زرا۔ کبھی خیال آتا کہ خود اُٹھوں اور ہمراہ لے آؤں۔ کبھی وہیں بیٹھا مُنہ
ی مُنہ میں بچوں کو کہتا، نالائقو ہٹو۔ گھروں کو جاؤ۔

جب کوئی مرد کھڑا ہو کر گھورتا، میری پیشانی عرق آلود ہو جاتی اور
یرت آنکھیں نکال لینے کا تقاضا کرتی۔ غرض وہ پہنچی۔ مصیبت کا
ہاڑ پھاند کر آئی۔ اس کا رنگ زرد، جسم پسینہ میں شرابور، ہانپتی
ہنپتی بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی۔ اس نے گھونگھٹ
ں سے پانی کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے اُٹھا کر دیا۔ اب وہ ذرا
ستائی اور تھوڑا سا گھونگٹ اونچا کر کے اِدھر اُدھر کھیتوں کو حیرت
ے دیکھنے لگی۔ گویا نیا جانور ابھی چڑیا خانہ میں چھوڑا گیا ہے۔

بائیکاٹ :۔

خیر یہ تو گھر کی کہانی تھی۔ اب برادری کا قصہ سنئے۔ جب لوگوں
و ترکِ پردہ کا پتہ چلا تو ان کی خاندانی غیرت جوش میں آئی۔ پنچایت کی،
جھے بلایا، میں گیا تو میری ذلیل حرکت پر طعون کرنے لگے۔ خدا کا
نون اور ملک کا قانون توڑنے پر میں نے کبھی کوئی پنچائت ہوتے نہیں

دیکھی۔ نہ انہیں بھلائی کے کام میں متحد ہوتے پاتا۔ البتہ ترکِ رسومات پر سب اکٹھے تھے۔ انہوں نے سو سوال کئے۔ میں نے ایک جواب نہ دیا۔ جواب تو کبھی چارہ گر کو دیتا۔ برادری تو رسم و رواج کی پابندی میں ظالم ہے۔ رحم کھا کر مدد تو کوئی نہیں کرتا۔ انہیں کے رسم و رواج کا مارا میں بچارا اس نوبت کو پہنچا تھا۔ آخر سب نے فیصلہ کیا کہ اس کا حقّہ پانی بند کر دیا جائے۔ کوئی نہ اس سے کچھ لے نہ دے۔ میرے پاس لینے دینے کو کیا تھا۔ میں نے کہا یہ بھی پردہ رہا۔ پھر کہا۔ بھیور پانی نہ لے جائے۔ میں نے دل میں کہا یہ بھی کچھ مشکل نہیں۔ جو عورت کھیت پر جائے گی وہ پانی بھی لائے گی۔ تیسری بات یہ کہی، کہ خاکروب بھی اس سے ترکِ موالات کرے۔ میں نے سوچا یہ دِقّت بھی پردے کے ساتھ ہے۔ پنچ یہ حکم دے کر تتّر بتّر ہو گئے۔ میں گھر کو چلا آیا۔

حقّہ:۔

غرض میں برادری کا باغی شمار ہونے لگا اور بیوی عورتوں میں اچھوت ٹھہری۔ اب مجھے محنتی کاشتکاروں سے مل کر زمین کی ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ راجپوت زمینداروں کے گاؤں سے گزر کر سکھ جاٹوں کے ایک گاؤں میں گیا۔ راجپوتوں کے کھیتوں میں جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ جاٹوں کی کھیتیاں ہری بھری تھیں۔ میں ایک بوڑھے سکھ کسان کے پاس

جا بیٹھا جو خالی وقت میں مُوشیوں کے رسّوں کے لئے بیٹھا مونج بٹ رہا تھا۔ میں نے کہا، کہو چودھری کیا ہو رہا ہے۔ وہ بولا آؤ میاں صاحب مونج بٹ رہا ہوں۔ بیٹھو مگر پستول کی نالی ذرا پرے رکھنا۔ پہلے میں پستول کا نام سُن کر گھبرایا۔ پھر معلوم ہوُا، اس سے حقّہ مراد ہے جو میرے ہاتھ میں تھا۔ میں حقّہ الگ رکھ کر کھسیانہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا، میاں صاحب، آپ کی زمینداریوں کو تین باتوں نے تباہ کیا۔ ایک زمین خود کاشت نہ کرنا۔ دوسروں سے کرانا۔ دوسرے تنگ دست فاقہ مست اور مجبور ہو کر ایسا کرنا بھی تو خود کھیت پر جانا اور بیوی کو پردے میں بٹھانا۔ تیسرے حقّہ کو کھیتوں میں بھی گڑگڑانا۔ میں نے کہا۔ چودھری جو چیز من کو نہ بھاوے وہ عجیب لنظر آتی ہے۔ ورنہ حقّہ تو تکان کو دُور کرتا ہے۔ آپ کی دو باتیں تو بالکل ٹھیک ہیں۔ البتہ حقّے کے معاملہ میں مبالغہ ہے۔

اُس نے کہا۔ اچھا اس ساتھ کے گاؤں کو دیکھو۔ میں نے کہا ان کی کیا پوچھتے ہیں۔ یہ راجپوت لوگ کنگال رجے ہیں۔ ان کے سب کام دوسروں کے سپرد ہوتے ہیں۔ آرام طلب اتنے کہ ابر کا ایک ٹکڑا دیکھ کر بارش کی اُمید میں کھیت سینچنا بند کر کے واپس گھر آ جاتے ہیں۔ غریب فاقے کرتے ہیں۔ مگر پردہ نہیں اُٹھاتے۔ اس لئے ان کی کھیتیاں خشک اور کھیت نکمّے رہتے ہیں۔ اس نے بحث کو ٹال کر میرا پتہ پوچھا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کاشتکاروں کے

عام اصولوں کی بابت اس نے اپنے تجربے بیان کئے۔ میں نے دل پر لکھ لئے اور چلا آیا۔

ایک روز آسمان پر ابر محیط تھا۔ ہلکی ہلکی پھوہار پڑ رہی تھی میں کٹیا میں اس اُمید پر بیٹھ کر حقہ پینے لگا کہ مینہ برسے اور محنت سے جان چھوٹے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی بوڑھا کسان آتا دکھائی دیا۔ حقہ ہٹایا اُس کی آؤ بھگت کے لئے تیار ہو کر بڑھا۔ محبت سے پاس بٹھایا۔ وہ حقہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ میاں صاحب! میں ہوا کے اس رُخ بیٹھا ہوں۔ تم بے کاروں کا کام جاری رکھو۔ میں ہنس دیا۔ اس نے کہا۔ میاں صاحب تم میرے پاس آئے تو مجھے مُونج بٹتے پایا۔ میں آیا تو آپ کو حقہ پیتے دیکھا۔ میں نے وقت مفید کام میں لگایا۔ تم نے وقت اور پیسہ دھواں بنا کر اُڑا دیا۔ میں نے عذر تراشا کہ میں محنت سے ذرا تھک گیا تھا۔ صرف دم لینے کے لئے دو کش لگا لئے ہیں۔

وہ بولا، کاشتکاری میں تکان اور فراغت کا کیا ذکر؟ کاشتکاری اور باغبانی وہ محنت ہے جس میں انسان تھک نہیں سکتا۔ قدرت اپنے حُسن کو کھیتوں اور باغوں میں بے نقاب کئے پھرتی ہے۔ شادمانی اور فرحت کا دریا بہتا ہے۔ میرے بیٹے پوتوں میں جو تکان اور فراغت کا ذکر کرتا ہے۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ حیلہ جوئی کرتا ہے۔ کاشتکاری میں فراغت ممکن نہیں۔ پھر اُس نے کہا، کھیت سوکھ رہے ہیں۔ پانی نہیں دیا۔ میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ رحمت ہوا چاہتی ہے۔ وہ مُنہ

لگا کہ بے ہمتوں کے لئے رحمت آسمان سے نہیں برستی۔ البتہ باہمتوں کے لئے وہ زمین سے پھوٹ نکلتی ہے۔ اگر بے ہمّت کاشتکار کے لئے تھوڑا پانی برسے تو موت۔ زیادہ برسے تو قیامت۔ دو بوندیں پڑیں تو گھر کو بھاگے۔ کھیتیاں اُجڑیں یا بچیں؛ وہ پھر ان کی طرف مُنہ نہیں کرتے جس کاشتکار کی آنکھیں آسمان کی طرف ہوں وہ ناکارہ ہے۔ ہماری نظروں کو تو زمین پر لگے رہنا چاہئے۔ بُرا نہ مانو تو کہوں، تم نے جو میرے سوال پر کہ کھیت کیوں نہیں سینچے۔ آسمان کی طرف دیکھا تو مجھے ایک عورت کا قصّہ یاد آگیا جس نے گھٹا دیکھ کر گھڑا اچھوڑ دیا تھا کہ اب مینہ برسے گا اور جل تھل ہو جائے گا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے بادل بن برسے کھل گیا۔ اس نے کہا۔ لو ابر کھلا اب کھیتوں کو سینچو۔ وہ میرے منع کرنے پر میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ بوڑھا۔ میں جوان۔ ایک گھنٹہ کے بعد کچھ کسل سی معلوم ہوئی۔ میں نے بیلوں کو روکا۔ حقہ تازہ کیا۔ پیا اور پھر کام کو لگ گیا۔ ایک گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ پھر میں بیل روک کر کش لگانے لگا۔

اس نے مجھے ٹوکا کہ میاں صاحب میں نے تمہیں کہا تھا کہ حقہ پینے والا اچھا کسان نہیں ہوتا۔ جو مزدور جوانی میں ایک گھنٹہ کام کرے آدھ گھنٹہ آرام لے اس کو پوری مزدوری کون دے۔ زمین پر بھی پوری محنت کرو۔ پوری مزدوری پاؤ۔ حقہ نوش کسان اور حقہ سے مجتنب کسان کا مقابلہ کیا؛ وہ محنت میں عورت کے برابر نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہہ کر مجھ

سے رخصت ہو کر چلا گیا ۔ مجھ پر اس کی باتوں کا بڑا اثر ہوا ۔

ایک دن ہم میاں بیوی مکی کھیت سے اٹھا کر گھر لے جا رہے تھے ۔ میں بھاری بوجھ لے جاتا ، وہ تھوڑی مکی اٹھائے تھی ۔ مگر مجھے چار دفعہ حقہ کی خواہش ہوئی ۔ اور کام چھوڑ کر میں نے حقہ پیا ۔ اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ عورت نے مجھ سے بڑھ کر کام کیا ۔ اس دن سے میں نے حقہ پر بھی لعنت بھیجی ۔ اوّل اوّل تو تکلیف ہوئی ۔ مگر فصل پر معاوضہ مل گیا ۔ پہلے سے کھیت پر زیادہ محنت ہوئی ۔ برداشت پہلے سے زیادہ آئی ۔ میری محنت کی شہرت ہوئی ۔ کھیتی زر اُگلنے لگی ۔ اب ہمیں صرف کھیت اور کام سے واسطہ تھا ۔ اور گاؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ چھ ماہ کھیت میں کھڑے رہے ۔ کھیتی اُمید کے مطابق لہلہانے لگی ۔ خود ہی میاں بیوی نے مل کر فصل کاٹی ۔ خدا کی مہربانی سے بھاؤ ذرا تیز تھا چھ ماہ کا خرچ رکھ کر دو سَو روپے کا اناج فروخت کیا ۔ میری آنکھیں کھُل گئیں ۔ بیوی مارے خوشی کے نہال ہو گئی ۔

اب ہم نے اپنے بیل خریدے ۔ ساری زمین خود کاشت کی کبھی کبھی کام کی ضرورت کو دیکھ کر ایک آدھ مزدور رکھ لیتے تھے ۔ یہ دو سَو روپیہ بڑی دولت معلوم ہوئی ۔ پائی پائی پسینہ کی کمائی تھی ۔ کوڑی ہاتھ سے دینے کو جی نہ چاہتا تھا ۔ ضروری خرچ پر بھی پیسہ دینا شاق گزرتا تھا ۔ لڑکا جوان ہوتا گیا ۔ میری ہمت اور آمدنی بڑھتی گئی ۔ اب آہستہ آہستہ میں نے قرض اتارنا شروع کیا ۔ جو دو برس میں کھایا تھا ۔

وہ پورے تیرہ برس میں اُتارا۔ زمین پھر میری ہو گئی۔ ساہو کار اصل اور سود پا کر بڑا خوش ہوا۔ بازار میں میرا اعتبار جم گیا۔ اب میں جتنا چاہتا، قرض اُٹھاتا۔ مگر میں قرض سے اتنا گھبراتا تھا جتنا انسان موت سے۔ پندرہ برس کے بعد میرے سر سے بوجھ اُترا تو میں نے راحت کی سانس لے کر دُنیا پر نظر ڈالی۔ مگر فقیروں کی کٹیا سے بدتر۔ عورت کے کپڑے پھٹے۔ لڑکے کا لباس بوسیدہ۔

میرا حال تو کچھ نہ پوچھو۔ ابتداءً کثرتِ کار کی وجہ سے پگڑی ہمیشہ گلے میں پڑی ہی رہتی تھی۔ پھر مدتوں ننگے سر رہا۔ اب جو قرضہ سے فرصت پائی، کچھ تن بدن کا ہوش آیا۔ گھر کی صفائی کی سُوجھی۔ ایمان اور مذہب کے متعلق غور کرنا شروع کیا۔ جس عورت کے پانچ روپیہ کھا کر مُکر گیا تھا۔ اس کے پاس پہنچا۔ اب بڑھاپے کی وجہ سے اس کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ میں نے پانچ کی بجائے اُسے پچاس دیئے۔ معافی مانگی۔ اُس نے دعائیں دیں۔ میرے دل سے بوجھ ہلکا ہوا۔ اب مجھے دنیا میں انسانوں کی طرح محنت اور آرام کا خیال آیا۔ پہلے ایک خوش نُما مکان بنوایا۔ صحن میں مختصر سا باغیچہ لگایا۔ بھینس رکھی۔ دُودھ کی نہریں گھر میں بہنے لگیں۔ میں دوزخ سے نکل کر بہشت میں داخل ہوا۔ تنگ دستی کے بعد جو فارغ البالی نے قدم چُومے۔ اپنے حال پر دوسروں کی حالت کا قیاس ہوتا۔ تنگدست کو کچھ کر دستگیری کو جی چاہتا تھا۔

غریب نوازی :-

میری برادری میں ایک شخص تھا جس نے میری طرح اپنے پاؤں آپ گلہاڑی ماری تھی۔ اور اب بھیک مانگنے تک نوبت آ پہنچی تھی۔ میں ایک دِن چپکے سے اُس کے گھر گیا۔ پورے ایک سال کا سامان خورد و نوش اس کے گھر لا ڈالا۔ دو سو روپیہ نقد دیا کہ وہ بھی بیل خریدے اور کھیتی کرے۔ اس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ موت بے عزتی کے گڑھے سے نکل آیا ہے۔ اب ڈوب کر اُبھرنے کا موقع جو پایا سب کُنبے نے ہاتھ پاؤں ہلانے شروع کر دیئے۔

پہلے وہ میری طرح پردہ کی وجہ سے ہچکچایا۔ مگر میں نے اسے سمجھایا۔ کہ بھائی بیوی لڑکیوں کو پردہ میں بٹھا کر قیامت تک کھیتی کچھ کھانے کو نہیں دیتی۔ پردہ وغیرہ امیروں کے چونچلے ہیں۔ پردہ دار عورت کے لئے گھر بیٹھے ضروریات پوری کرنے کی غرض سے کم از کم ایک ملازم کی ضرورت ہے۔ جس گھر میں پیٹ کی فکر ہو وہ پردہ کی رسم کو کہاں تک نباہ سکتا ہے۔ بیوی اور لڑکیاں ہل کر کھیت میں کام کرنے لگیں۔ میاں نے میری پیروی میں حقہ چھوڑا۔ آخر اس کی بھی حالت بدل گئی۔

میرا لڑکا اب ۲۵ برس کا ہوا۔ شادی کی فکر ہوئی۔ میں نے اسی غریب بھائی کے ہاں پیغام بھیجا۔ انہوں نے خوشی سے قبول کیا۔ برادری کی شمولیت کی اُمید نہ تھی۔ اس لئے یہ کھٹکا ہی نہیں تھا کہ

روپیہ زیادہ خرچ ہوگا۔ بہو نے باپ کے ہاں تنگ دستی کا تلخ مزا چکھا تھا۔ اس لئے شیریں زبان اور ہوشیار تھی۔ اب ہم چار کمانے والے تھے۔ اور ایک بھی بیٹھ کر کھانے والا نہ تھا۔ میرے لڑکے کے ہاں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہؤا۔ میں نے ان کی تعلیم کا بیمہ کرا دیا۔ اس لئے ہمیں تعلیم کے اخراجات چنداں بار معلوم نہ ہوئے۔ میں نے برادری کے مستحق لوگوں کو صرف محنت کی شرط پر روپیہ دینا شروع کیا۔ کئی بیکاروں کو محنت پر لگایا اور خاندان کے آدمیوں کو فاقہ سے بچایا۔

غرض میں نے اسی سال دُنیا میں زندگی بسر کی۔ دونوں لڑکیاں بی۔اے ہوئیں اور ڈاکٹر بنیں۔ لڑکے نے ایم۔اے کیا اور پروفیسر ہؤا۔ تینوں بہن بھائی میں باہم مشورہ ہؤا کہ دو بڑے بہن بھائی دُنیا کمائیں اور چھوٹی بہن خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف ہو جائے۔ کسی کو کچھ تکلیف ہوئی۔ چھوٹی لڑکی جا حاضر ہوئی۔ دلاسا دیا۔ علاج کیا اور دُعا لی۔ اس سے خاندان کی شہرت، گاؤں کی شہرت اور برادری کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اپنی ہمت پر مجھے فخر ضرور تھا۔ مگر دل میں کبھی غرور پیدا نہ ہؤا۔ اطمینان نے دُنیا میں میرے لئے آرام کی جنت کے دروازے کھول دیئے تھے۔ میں اس جہان میں آیا تو محنت کا اجر اُمید سے زیادہ پایا۔"

میں نے اس شخص کا یہ سب ماجرا سُنا۔ اس کی ہمت کی داد دی اور اس کی غریب نوازی کی تعریف کی۔ اُس کی محنت سے قرضہ

اُتارنے اور تنگ دستوں کو سہارا دینے کا مقابلہ اپنی رشوت خواری
عیش پرستی اور انصاف فروشی سے کیا۔ ایک بے گناہ کو پھانسی پر لٹکانے
کی یاد آئی تو غم کے نشتر دل میں چُبھے۔ سینے سے آہ نکلی۔ چاہا کہ
آہ آہ کرتا کسی طرف نکل جاؤں مگر یک بیک، ہزاروں گھڑیال بجنے
لگے۔ "دروازے کُھل گئے" "دروازے کُھل گئے" کی آواز ہر طرف بلند
ہوئی۔ میں بھی ایک گروہ کے ساتھ ہولیا ✤

باب سوم

دار الصّلاح

دُور سے چاندی کا ایک عالیشان محرابی دروازہ دکھائی دیا جس کے سامنے کٹہرے لگے تھے اور اُوپر سبز بیل بل کھا رہی تھی۔ دروازے کے اندر جہاں تک نظر نے کام کیا چاندی کی صاف کشادہ سڑکیں دکھائی دیں۔ دو رویہ درخت لگے تھے۔ جن کے پتے نہایت سبز تھے مگر ہلکی سی ہوا بھی آتی تھی تو سنہری روپہلی جھلک مارتے تھے۔ ان درختوں تلے چار خوشرو جوان بصد تمکنت و شان نقرئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہم قریب گئے، وہ استقبال کو بڑھے۔ اُنھوں نے لکھنوی انداز میں جھک کر سلام کیا۔ دونوں ہاتھوں سے دروازہ کا راستہ دکھایا کہ چلئے تشریف لے چلئے۔ سب بڑھے اور اندر داخل ہوئے۔ میں چلا تو روکا۔ میں نے روکنے پر ان کو ٹوکا۔ اوروں سے یہ حسن سلوک اور مجھ سے یہ بدسلوکی۔ میں جھلایا لیکن اُنھوں نے نہایت نرمی سے جواب دیا کہ صاحب ہم مجبور ہیں، اس جگہ صرف خدا کے ان فرمانبردار بندوں کو اذنِ باریابی ہے جنھوں نے مجبور اور معذور انسانوں کی خدمت کی ہو۔ لیکن جنھیں دُنیا میں امن و انصاف سے رہنا نہیں آیا اور مختصر زندگی میں اپنے ہم جنسوں میں اچھا نام نہیں پایا۔ وہ اس دروازہ سے نہیں گزر سکتے۔

اتنے میں کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے گردن پھیر کر دیکھا تو اسی زرّیں کمر ساتھی کو پایا جس نے مجھے بتایا کہ آپ غلط دروازے پر آ گئے ہیں۔ بائیں ہاتھ کو چلئے۔ اعمالنامہ سامنے رکھئے جو وقت پیش آئے اس کا حل اسی میں دیکھئے۔ مجھے اب رخصت دیجئے اور آپ جلدی کیجئے۔ میں ہراساں ہو کر بائیں جانب بھاگا۔ اِدھر کئی لوگ سرافگندہ با حالِ پراگندہ جا رہے تھے۔ اِدھر کا دروازہ کوئی عالیشان نہ تھا اور چمک دمک اور سج دھج نہ رکھتا تھا۔ تاہم کشادہ اور صاف ضرور تھا۔ وہاں ایک سفید ریش سبز پوش بزرگ کھڑا ہم سب کے حال پر زار زار رو رہا تھا۔ اور بھرّائی ہوئی آواز سے کہہ رہا تھا "اے لوگو! تم نے دُنیا میں رہ کر اپنے آپ کو جنّت میں رہنے کے قابل نہ بنایا۔ یہاں محنت اور ہمّت سے کام لو۔ جنّت میں رہنے کا ڈھنگ اور اسلوب سیکھو۔ یہ آخری موقع نہ کھونا اور دائمی عذاب میں گرفتار نہ ہونا۔ دُنیا میں لوگوں کو اذیّت پہنچانے والو! ملک و ملّت کے لئے مصیبت کا باعث بننے والو! خدا تم پر رحم کرے جلد اس دروازہ سے اندر داخل ہو جاؤ۔"

داخل ہوتے ہی محراب پر نگاہ پڑی۔ اس پر یہ تحریر تھا "یہ مقام ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جنھوں نے اپنی ناشائستہ حرکات اور بد اعمال سے دُنیا کو دوزخ بنایا۔ یہ کتبہ نشتر کی طرح سینہ میں چبھا۔ آنکھیں شرم سے زمین میں گڑ گئیں۔ میں سر جھکائے اندر داخل ہوُا اور سب کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ حتےٰ کہ ایک اسٹیشن سا دکھائی دیا۔ وہاں کچھ سفید

رنگ سفید پوش آدمی منتظر کھڑے تھے۔ ان کی پگڑیوں پر نقرئی پٹکا تھا۔ انہوں نے نہایت رحم کی نظروں سے ہم سب کو دیکھا اور اندر داخل ہونے کے لئے کہا۔ ہم سب پلیٹ فارم پر جا کھڑے ہوئے، جہاں بھاری آہنی زنجیریں جگہ جگہ پڑی تھیں، جن کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ آپ کی پہلی منزل دس لاکھ میل ہے۔ ابھی چلتے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے تاکہ جھٹکے سے تکلیف نہ ہو۔ ہم سب اسٹیشن کے صاف اور نرم فرش پر بیٹھ گئے۔ گھنٹی بجی۔ ان میں سے ایک نے دیوار میں ایک بٹن دبایا ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ عمارت میں کچھ حرکت معلوم ہوئی۔ ایک منٹ میں ہم نے منزل اوّل طے کر لی۔

صفائی سے لاپروا

میں سمجھ گیا کہ یہ سب بجلی کا اعجاز ہے۔ ورنہ اور کسی شے میں یہ تیز رفتاری کہاں کہ منٹ میں لاکھوں میل طے کر جائے۔ ان میں سے ایک سفید پوش یک بیک پکارا کہ صاحبو تم پر خدا رحم فرمائے۔ اپنے اپنے اعمالنامے پڑھو۔ جن کے اعمالناموں میں "صفائی سے لاپروا" درج ہو وہ باہر نکل جائے اور غلیظ دروازے میں سے داخل ہو جائے۔ غلیظ دروازہ کا نام کھٹکا۔ میں نے اعمالنامہ پر نظر ڈالی تو بالکل سادہ نظر آیا۔ کچھ اطمینان سا ہوا۔ کچھ لوگ یہاں اُتر گئے، بہت سے بیٹھے رہے۔

جتنے اُترے ان میں کثرت سے ہندوستانی تھے۔ اور ان میں

بھی مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ تھیں۔ وہ باہر چلے گئے۔ ہم کو بھی ۲ منٹ کے لئے گردوپیش دیکھنے کی اجازت ملی۔ جانے والوں کے پانچ منٹ بعد ہم بھی اس اسٹیشن نما عمارت یا گاڑی سے باہر آئے تاکہ نئی دُنیا اور نئے حالات کا جائزہ لیں۔ کچھ دُور جا کر اسی طرح کا ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔ جس کا پھاٹک کھُلا تھا۔ سب "صفائی سے لاپروا" اس کے اندر داخل ہو گئے۔ اور پھر پھاٹک بند ہو گیا۔ میں نے صرف ایک نظر اندر کا نظارا کیا۔ اگرچہ اس کا نام غلیظ مقام تھا۔ مگر غلاظت کا اس میں کہیں نشان نہ تھا۔ اندرونی حِصّہ ایک سبزہ زار تھا۔ فوارے موتی نچھاور کر رہے تھے۔ ہوا عنبر بکھیرتی تھی۔ میں حیران تھا کہ ایسا خوش مقام اور یوں بدنام ہو چنانچہ میں اپنے ساتھیوں سے اظہارِ تعجب کئے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک نے کہا۔ خدا تم پر رحم کرے۔ یہ تعجب کا مقام نہیں۔ اس کے بیرونی حِصّہ پر نہ جاؤ۔ اگر اندرونی حِصّہ کو دیکھ پاؤ تو گھبرا جاؤ۔ وہاں کوڑے کے انبار اور غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ جامۂ ہستی پر جو داغ دُنیا میں لگ جاتا ہے، وہ اس جہان میں عمر بھر کی کوشش سے بھی دھویا نہیں جاتا۔ عالمِ عمل میں صفائی سے لاپروا یہاں پناہ بخدا ابتدا میں دنیوی زندگی کا پُورا ثبوت دیتے ہیں۔ یہاں معمولی آرام کا سب سامان ہے اور پیٹ کا دھندا نہیں۔ تاہم جہاں خود پڑے ہیں پڑے ہیں۔ جہاں جو چیز رکھی ہے رکھی ہے۔ ان کو درست جگہ لگانا۔ قرینے سے سجانا گویا ان کی فطرت ہی نہیں۔ درختوں کے پتے جو ہوا کے جھونکوں سے گرے وہ ہفتوں

فرش پر پڑے رہے۔ کیا مجال کہ ہاتھ ہلائیں۔ جیب میں رومال موجود ہے۔ مگر ناک دامن اور قبا سے صاف کرتے ہیں۔ تھوکنے کے لئے اُگال دان موجود ہے، مگر دیوار اور فرش دونوں خراب ہیں۔ میوہ کھایا، چھلکا اسی جگہ گرایا۔ مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ مگر انہیں کراہت نہیں ہوتی۔ نہانے کے لئے غسل خانے موجود، تولیہ حاضر مگر گندہ رہنے کی عادت نے ان میں ہمت نہیں چھوڑی کہ نہالیں۔ ہر روز کپڑے بدلنے کا پورا سامان اور انتظام مہیا ہے، مگر دریدہ اور بوسیدہ لباس تن پر ہے۔ چیز دستیاب نہ ہو تو مجبوری ہے، مگر ہر شے کے میسر ہونے پر بھی جوئیں مارنے میں بعض گمراہ انسان ایک فقیرانہ شان سمجھتے ہیں۔ دُنیا میں واعظ خوش بیان نے جب کبھی فردوس کے حسین نظاروں کا خوبصورت سماں باندھا۔ حوران جنّت کا زاہد فریب قصہ کہا یا نہروں کی صفائی ثمر شیریں سے جُھکے ہوئے درختوں کا نظارہ لفظوں میں دکھایا۔ تو یہ بھی پھڑک اُٹھے۔ کبھی خیال نہ کیا کہ اس پاک صاف دنیا میں ناپاک لوگ کیسے داخل ہوں گے۔ اگر صفائی سے لاپرواہ وہاں اپنی عادتیں لے جائیں تو آج بہشت بھی دوزخ کا نمونہ بن جائے۔ جہاں اب تنکا ڈھونڈے نہیں ملتا۔ وہاں غلاظت کے ڈھیر دکھائی دیں۔ حقّے کے دھوئیں سے مکان سیاہ ہوں۔ تھوک تھوک کر فرش کو ایک دن میں گندہ کر دیں۔

جب یہاں انسان کی وادی نہ تھی تو یہ مقام نہایت نزہت آگیں

اور صحت افزا تھا۔ جب یہ مقام صفائی سے لاپروا آدمیوں کی بستی بنا تو اسے گردشِ تقدیر کے ہاتھوں یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے اور خاک اُڑی۔ ان لوگوں نے آکر خوبصورتی کی افزائش کی بجائے اپنی گندہ عادات کی نمائش کی۔ سالوں میں غلاظت کے صدہا ڈھیر لگ گئے۔ صفائی کے ماہر سالوں ان کے ساتھ سر خالی کرتے ہیں تو کہیں آہستہ آہستہ انہیں صفائی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ بتدریج ترقی کر کے مضافات میں آتے ہیں اور اپنی محنت سے بیرونی حصص کو خوبصورت وخوشنما بناتے ہیں۔ یہ بیرونی حصہ جو نظر افروز ہے مبتدیوں کی جائے رہائش نہیں۔ بلکہ یہاں فارغ التحصیل لوگ رہتے ہیں۔ اب ان میں صفائی کا شعور پیدا ہو گیا ہے اور پاک وصاف رہنے کی عادت فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے جو بہشت کی خوبی اور خوبصورتی کو قائم رکھنے کی کافی ضمانت ہے۔ اگر بغیر کافی تعلیم کے اُن کو اپنی پُرانی عادتوں کے ساتھ ابتدا میں ہی بہشت میں چھوڑ دیا جاتا تو خالقِ ارض وسما بہتر جانتا ہے کہ اس سُنہری دُنیا یعنی بہشت کا کیا حال ہوتا۔

اتنے میں گھنٹی بجی۔ ہم سب جلد جلد اسی اسٹیشن نما گاڑی میں جا بیٹھے۔ باوجودیکہ ضرورت سے زیادہ جگہ تھی۔ مگر تنگ دل مسافروں نے لڑنا شروع کر دیا۔ ہاتھا پائی کی نوبت پہنچنے والی تھی کہ ایک فرشتہ پکارا، صاحبو اسی تنگ دلی اور دوسری بدعادات کا مزہ چکھنے تم سب جا رہے ہو۔ خدا جانے جاتے ہی کس مصیبت میں پھنس جاؤ۔ مگر

تم دنیا کی عادتوں سے اس قدر مجبور ہو کر چند منٹ امن و امان سے نہیں بیٹھ سکتے۔ اس پر اکثر شرمندہ ہوئے لیکن بعض پھر بھی ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ دوسری گھنٹی بجنے والی تھی کہ پھر شور ہوا۔ دیکھا کہ پھر آپس میں سر پھٹول ہو رہی ہے۔ اب فرشتے کچھ نہیں بولے بلکہ لڑنے والوں کے گلے میں بھاری زنجیریں ڈال دیں۔ بچارے ہلنے سے معذور ہو گئے۔ پھر بھی بندھے کتوں کی طرح لال لال آنکھیں نکال کر گھورتے اور گالیاں دیتے رہے۔

صحت سے غافل

دوسری گھنٹی ہوئی۔ بٹن دبایا گیا۔ پھر کچھ جھٹکا سا لگا۔ عمارت حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ گاڑی دوسری جگہ رکی۔ یک بیک بلند آواز سے پکارا ہوئی "نامۂ اعمال دیکھو۔ اگر اس پر صحت سے غافل کے الفاظ مرقوم ہیں تو اتر آؤ۔ تمہاری منزل آ پہنچی۔ کئی شخص ہانپتے کانپتے اترے۔ ان کے جانے کے پانچ منٹ بعد بیس منٹ کی رخصت ہوئی تاکہ یہ پڑاؤ دیکھیں۔ ہم سب باہر نکلے تو بالکل اسی سج دھج کا مکان پایا۔ روپہلی محرابی دروازے کا اندرونی حصہ فردوس نگاہ تھا۔ سبز درخت اور سبز گھاس لہکتی اور پھول مہکتے تھے۔ نہروں اور حوضوں میں رنگا رنگ مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں۔ یہاں میں نے کئی گھبرو جوان دیکھے سب کے سب سرو قد۔ رخسار ان کے قندھاری سیب کے سے سرخ

چہرہ آئینہ کی طرح صاف اور سینے کشادہ، بازو مضبوط، آنکھوں میں ایک دلآویز چمک۔ ان کی باصحت صورتوں کو حسن مجسم پایا۔ اس مقام کے ہر خوبرو کو دیکھ کر میں حیران تھا۔

میں نے استعجاب کے ساتھ ایک اورپیک سے پوچھا کہ یہ حسن سراپا ہیں یا صحت سے لاپروا۔ وہ بولا۔ خدا تم پر رحم کرے۔ یہ اصل مقام کا بیرونی حصّہ ہے۔ مرکزی بستی نووارد اشخاص سے بسائی جاتی ہے جہاں رونے کراہنے اور زور زور سے کھانسنے کی مسلسل آوازیں آتی ہیں۔ متوسط طبقہ اور مزدوری پیشہ افراد میں سے جن لوگوں نے صحت کو لاپرواہی کی بھینٹ کیا، وہ بھی اسی مقام پر محبوس ہیں۔ اور اپنی غلطی کا خمیازہ اُٹھا رہے ہیں۔ خرابیٔ صحت سے نہ صرف دُکھ درد کا دُنیا میں اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ سوسائٹی کی ترقی کو بھی نقصان پہنچا۔ ان لوگوں کی حالت عجیب ہے۔ جس قدر محنت ایک انسان کے لئے ضروری ہے وہ اس سے قاصر رہتے ہیں۔ کمزور آدمی اپنی ذات کے لئے تو پورا فائدہ حاصل کرتا رہتا ہے۔ مگر سوسائٹی کو محنت کا پورا حصّہ بہم نہیں پہنچاتا۔ اس لئے نکمے اُمرا، دوسروں کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرنے والے مذہبی مقتدا اور کمزور اور کاہل عزباجنّت میں جلدی راہ نہیں پاتے۔ اس جگہ کمزوروں کو قوی اور کاہلوں کو محنت کا عادی بنایا جاتا ہے۔

مرکزی حصّہ کی آبادی ان اُمرا پر مشتمل ہے۔ جو دُنیا میں باوجود فکرِ معاش سے آزاد ہونے کے پیٹ کے غلام رہے۔ صبح مرغن غذائیں

کھائیں۔ شام تک بستر پر لوٹا کئے۔ عیاشیوں میں غرق ہو کر آنکھوں میں رات کاٹی۔ صبح ڈاکٹر کے مشورے سے مقویات طلب کیں۔ باورچی کو اور لذیذ کھانے کی فرمائش ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحت جیسی خداداد دولت لٹا دی۔ عمر کو بے کار گنوایا۔ ان بستیوں کے ساتھ ساتھ علماء کی آبادیاں ہیں۔ مذہب کی یبوست نے ان کی دل کی کلی کو مرجھا دیا ہے۔ خندہ رُوئی اُن کے نزدیک عیب ہے، اور ترش روئی کا نام اُنھوں نے متانت رکھا ہے۔ پُربہار گلستانوں سے گزریں تو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں۔ بچوں کو اُچھلتے کُودتے دیکھ پائیں تو غصّے سے گھُورنے جائیں۔ غرض خدا کی بنائی ہوئی حسین دُنیا ان کے لئے زنداں سے زیادہ مصیبت خیز اور وہاں کی خوشیاں ان کے لئے بے حد غم افزا ہیں۔ جن کے دل کا کنول کبھی نہ کھلا۔ ان کے چہرے کی رنگت کیا کھلے۔ ہر لحنِ داؤدی، ہر حسنِ یوسف، ہر خلد نگاہ نظارہ سے جن کا دل کُڑھے یا محض لوگوں کو دکھانے کے لئے ان چیزوں کی طرف سے کان اور آنکھ بند کر لیں۔ ان کا خُون کیوں نہ سڑے۔ چہرے پر نُور برسنے کی بجائے افسردگی کیوں نہ چھائی رہے۔

جو لوگ اپنی بے احتیاطیوں، غفلتوں اور غلط کاریوں سے جوانی میں بڑھاپے کو دعوت دیتے ہیں۔ وہ جنّت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ لوگ اپنی عادتیں نہ لے کر بہشت میں پہنچیں تو خدا جانے کیا قیامت برپا کر دیں۔ وہ نغمہائے گوناگوں جن کو تصوّر کی زبان نے نہیں چکھا،

اور تخیل کی نگاہ نے نہیں دیکھا۔ اگر دُنیا کے ان شکم پرستوں کے ہاتھ آ جائیں۔ تو نہ معلوم کتنا کھا جائیں۔ جنہیں دنیا میں حسن صورت اور خوبی نہ بھائی۔ وہ اپنی حور وش بی بیوں کے پاک جمال اور جنت کے غلمانِ خوش آواز سے کیا حظ اُٹھائیں گے۔ اس سُنہری دُنیا کے حسین نظارے ان لوگوں کو کیا بھائیں گے جنہیں دُنیا میں فصلِ گل کی بہار دیکھنے کی کبھی خواہش نہ ہوئی۔ اس لیے یہاں مزاج میں اعتدال، طبیعت میں مناسبت، جسم میں توانائی پیدا کرنے کے قاعدے اور طریقے بتائے جاتے ہیں۔ اور اس طرح لوگ بہشت کے رہنے کے قابل بنائے جاتے ہیں۔ خاکی دُنیا میں انسان جو بات سال بھر میں سمجھ سیکھ سکتا ہے، یہاں وہی بات سمجھاتے سکھاتے صدیاں گزر جاتی ہیں تب کبھی طبیعتیں اصلاح کی طرف آتی ہیں۔

رُوحانی امراض کے مریض

اتنے میں پھر گھنٹی بجی۔ ہم اندر آ کر بیٹھ گئے۔ گاڑی حرکت میں آئی۔ منزلِ سوم میں آ کر رُکے۔ سب کے اعمال نامہ میں "روحانی امراض کے مریض" مرقوم تھا۔ ایک آواز نے سب کو اُترنے کے لئے کہا۔ ہم حسب الحکم اُتر کر باہر آئے۔ اپنے سامنے ایک روپہلی دروازہ نمودار پایا۔ میری وہی کیفیت تھی۔ جو سسرال کے گھر میں داخل ہونے پر نئی نویلی دُلہن کی ہُوا کرتی ہے۔ یہاں کیا ہو گا کیا نہ ہو گا؟ کس کس سے پالا پڑے گا؟ لوگوں کے

طور طریقے کیا ہوں گے ؛ مجھ سے کیا سلوک ہو گا ؛ کون ترچھی چتون سے دیکھے گا ؛ کون محبت سے پاس بٹھائے گا ؛ میں اسی طرح فکر میں غلطاں و پیچاں سب کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ کچھ دور گردن جھکائے چلا گیا۔ پھر آنکھ اُٹھائی تو ہر جگہ ایک جان پرور منظر دیکھا۔ جا بجا چاندی کے خوب صورت محل اور ہر محل کا صحن رشکِ جناں، سبز پتوں سے ڈھکے ہوئے درخت، پھولوں سے لدی پھندی ڈالیاں، بہتے پانی میں کھیلتی مچھلیاں، خوشنما روشیں، ستھری سڑکیں ہر طرف موجود تھیں۔ تھوڑی دُور چل کر ہم سب رُکے۔ یہ ایک کُشادہ چوک تھا، ایک ٹرام وے کی قسم کی گاڑی گھنٹی بجاتی آئی۔ وہاں ٹھہر گئے۔ کچھ سیاہ پوش نوجوان اندر سے نکلے۔ اگرچہ وہ زریں کمر فرشتوں اور سفید پوش پیکوں کی طرح بھولے بھالے تھے مگر کلام میں درشتی اور سختی تھی۔

اُنہوں نے آتے ہی حاکمانہ لہجے میں سوار ہونے کو کہا۔ ہم سب ڈرتے ڈرتے سوار ہو گئے۔ یہ گاڑی چلی۔ جگہ جگہ رُکی۔ کچھ کچھ سواریوں کو اُترنے کو کہا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اشارہ کیا۔ میں اور دو سَو مرد اور کوئی ڈیڑھ سو عورتیں یہاں اُتر پڑیں۔ ہم اُترے تو گاڑی چل پڑی۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر ایک چھوٹے دروازے میں سے داخل ہوئے اور ہم ایک بستی میں پہنچ گئے۔ جس کے گرد فصیل کھچی ہوئی تھی۔ راستہ میں ہر طرف ایک سی سج دھج اور یکساں شوکت و شان کے محل نظر آتے

تھے ۔ جگہ جگہ سیاہ پوشوں کے پہرے لگے تھے ۔ وہ چہروں کو دیکھ دیکھ کر پہچانتے تھے اور روک لیتے تھے۔

میرا مسکن

مجھے بھی تھوڑی دور چل کر ایک جگہ روکا اور کہا کہ تمہارا مقام آگیا ہے اعمال نامہ میں نمبر دیکھو ۔ مکان کے نمبر سے ملاؤ ۔ ملتا ہے تو داخل ہو جاؤ ۔ پھر بغیر اجازت باہر نہ آؤ ۔ اعمال نامہ پر پانچ کروڑ تین سو ایک حروف میں لکھا تھا ۔ وہی نمبر ہندسوں میں محل کے دروازہ پر منقوش پایا ۔ اور داخل ہو گیا ۔ کیسی فرحت زا ہوا اور کیا نظر افروز منظر، ٹہنیاں سبز پتوں سے ، ہری ڈالیاں پھولوں سے بھری تھیں ۔ طیور کا شور ہر طرف سنائی دیتا تھا ۔ ایک ہرنی گھاس چگ رہی تھی ۔ کئی خوبصورت رنگا رنگ کے خرگوش اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے ۔

وسطِ باغ میں چاندی کا چھوٹا سا حوض تھا ۔ جس کے صاف پانی میں سرخ سنہری مچھلیاں اِدھر سے اُدھر ، اُدھر سے اِدھر تیرتی پھرتی عجیب سماں باندھ رہی تھیں ، مکان کی کرسی تین زینے اونچی تھی ساری عمارت چمکتی چاندی سے بنی ہوئی تھی ۔ اندر آدم قد آئینے جابجا خوبصورت الماریاں ، چاندی کی میزیں اور چاندی کی کرسیاں اپنے قامت کے مطابق نئے سلے ہوئے لباس اور آرائش و آسائش کے جملہ سامان پہلے سے تیار پاکر میں نے سوال کیا کہ آیا یہ مقام بہشت کا ٹکڑا

ہے۔ اعمالنامہ میں لکھا پایا کہ یہ بہشت کے قدموں کی خاک بھی نہیں۔ میں نے کہا اگر یہ خاک ہے تو وہ عالمِ پاک کیا چیز ہوگا۔ اس خیال سے دل کو صدمہ ہوا۔ آہ اے میری گناہگار روح دُنیا کی تیری چند روزہ عیاشیاں اور ناانصافیاں یہ رنگ لائیں کہ اتنی مدت کے لئے اس خوبصورت عالم سے محروم ہوگیا۔ میں اسی فکر میں برآمدہ کی آرام چوکی پر آکر بیٹھ گیا۔

شام ہوئی شفق پھولی۔ سورج نے روشن چہرہ شب کی تاریک نقاب میں چھپانا شروع کردیا۔ چڑیوں نے خدا کی تقدیس شروع کر کے ختم کر دی۔ ہرنی نے اپنی محبت بار آنکھوں سے مجھکو دیکھا۔ میں نے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں وہ سیاہ پوش دربان داخل ہوا۔ مجھے اندر جانے کو کہا۔ میں اندر چلا گیا۔ کہا کہ خدا تم پر رحم کرے۔ اپنے اعمالنامہ کو پڑھو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ وہ باہر چلا گیا۔ دروازہ آہستہ آہستہ خود بخود بند ہوگیا۔ اندر تاریکی بڑھ رہی تھی۔ اور میں گھبرا رہا تھا کہ یکبیک کمرہ بقعۂ نور بن گیا۔ باوجودیکہ بظاہر کوئی لیمپ نہ نظر آتا تھا تاہم دیواروں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ میں نے اعمالنامہ کو پڑھا اور یہ مرقوم پایا:۔

"ابتدائی رات میں سو جاؤ۔ آدھی رات کو اُٹھو نہاؤ دھوؤ۔ پل بھر خدا کی یاد کرو۔ نور کے تڑکے تک بندگانِ خدا کی سلامتی کی دُعا مانگو۔ اور بنی نوع انسان کی خدمت میں مصروف رہنے کے عمدہ عمدہ تصوّرات

دل میں قائم کرو۔ تاکہ نیکی کا خیال تمہارے دل میں کالنقش فی الحجر ہو جائے۔ ورزش کرو۔ آنگن کی صفائی میں مدد دو۔ کھاؤ پیو اور باغ میں کام کرو۔ ظہر کا وقت آئے تو سجدے میں گر کر اہلِ دنیا کے لئے امن اور انصاف کی خواہش کرو۔ پھر پھولوں کی غور پرداخت کرو۔ عصر کے وقت اپنے عمل کے میزان کا خیال کر کے بایں الفاظ التجائیں کرو۔ "کہ الٰہی اگر پھر دُنیا میں جانے پاؤں تو تیری مخلوق کو کبھی نہ ستاؤں۔ اپنی اغراض کے لئے دوسروں کا نقصان نہ کروں۔ اہل وعیال کی پرورش کے بعد جو فرصت پاؤں وہ خدمتِ خلق میں لگاؤں۔" شام کو سیر و تفریح کرو۔ مغرب کی نماز کی نیت باندھو۔ ہر رکوع و سجود پر مخلوق کے لئے خدا کے رحم کی دعائیں مانگو۔ پھر کچھ کھاؤ پیو۔ اور نمازِ عشا میں مصروف ہو جاؤ۔ مخلوق کا واسطہ دے کر خالق کو یقین دلاؤ "کہ اگر انسانوں کے درمیان رہنے کا موقع پاؤں تو کسی سے ترش روئی سے پیش نہ آؤں۔" یاد رکھو، خالق کو مخلوق اپنی ذات سے زیادہ پیاری ہے۔ جو اس کی پیاری مخلوق کو پیار کرے گا۔ وہ خدا کا محبوب ہو گا۔"

میں نے اس آسان پروگرام کو دیکھ کر شکر کیا۔ مگر اوقات کی پابندی نظر آئی۔ پھر بھی ہمت باندھی کہ بات کیا ہے۔ ایسی فضا اور عمدہ ہوا نہ پیٹ کا فکر، نہ روزی کا دھندا اگر مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا تو اور کیا ہو سکتا ہے طبیعت نے کچھ اطمینان سا پایا۔ کچھ بھوک سی محسوس ہوئی۔ ایک کمرہ میں اکل و شرب کا سامان چنا تھا، خوب پیٹ بھر کر کھایا اور پلنگ پر

آلیٹا۔ دل میں سوچا کہ عجب حال ہے کہ دُنیا میں علمائے دین خدا کی عبادت پر زور دیتے تھے اور اسی کو سرمایۂ فلاح بتاتے تھے۔ یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخلوقِ خدا کی محبت ذریعۂ نجات ہے۔ کاش دنیا میں پہنچنا نصیب ہو تو سب کو سمجھاؤں کہ حقوق اللہ پر حقوق العباد کو مقدم جانو ہمسایہ کا حق پہچانو۔ بوڑھوں کمزوروں سے نیک سلوک اور بچوں سے پیار کرو صحت اور صفائی پر زور دو کہ بہشت میں داخلہ کے لئے یہ دو ابتدائی ضرورتیں ہیں۔ زنہار ان کو نظر انداز نہ کرو۔

عالم دار الصّلاح میں ناپاک روحوں کی افسوسناک سرگزشت

صفائی سے بے پرواہ عورت کی کہانی

غرض اسی سوچ بچار میں نیند آگئی۔ صبح اُٹھا، پروگرام کے مطابق عمل کرنا شروع کیا۔ دن چڑھا تو دروازہ کھلا۔ ایک سفید پوش بوڑھی عورت ہاتھ میں جھاڑو لے کر آئی۔ مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ وہ بولی، بھائی تمہارے خاکی دُنیا سے یہاں آنے کی خبر پا کر میں مکان سجا

گئی تھی ۔ ہر چیز قرینے سے لگا گئی تھی ۔ اہلِ دُنیا کی سلامتی کی دُعا مانگو ۔ مجھے بتاؤ کہ اُن کا کیا حال ہے ۔ تمہارے گاؤں میں اب تو عورتیں گھروں کی صفائی سے غافل نہیں ۔ بدن کے لباس کو تو پاکیزہ رکھتی ہیں ۔ میری طرح گھر کا کوڑا دوسرے کے دروازے یا گلی کوچہ میں تو نہیں پھینک جاتیں ۔ آہ میری جان، اگر میں نے تھوڑی احتیاط برتی ہوتی یا کسی نے بتایا ہوتا تو یہ نوبت نہ پہنچتی ۔ گھر گھر تنکے چننا اب میری مقررہ عبادت ہے ۔ میں تقریر سے جان تو گیا کہ بی بی خاکی دُنیا میں صفائی سے لاپروا رہی ہے، اب غلیظ مقام میں زیرِ عتاب ہے ۔ اس جہان کو صاف رکھنا اس کی عبادت ہے، تاہم متجسّس طبیعت تفصیل کی طالب ہوئی، وہ جھاڑو رکھ کر ایک چوکی پر بیٹھ گئی اور بولی :۔

بھائی میں جے پور کے ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں ۔ دو ہزار سال کا عرصہ ہوا، میں خاکی دُنیا میں تھی ۔ جس نے کہا، یہی کہا کہ ایشور کے گیان دھیان سے جیو دُکھ سے چھوٹ جاتا ہے اور سُکھ سورگ پراپت ہوتا ہے ۔ میں دل و جان سے پُوجا پاٹ کرتی تھی ۔ منتیں مانا کرتی تھی ۔ اس کے گیان دھیان میں ایسی مگن رہتی تھی کہ جسم جان کی صفائی کا خیال نہ ہوتا تھا ۔ جو میرے گھر میں آتا وہ مکان کی حالت کو دیکھ کر گھبراتا تھا ۔ نہاتی بھی تو بغیر جسم کو ملے ۔ نہا کر پہنتی بھی تو بوسیدہ اور پرانا لباس سر دھوتی تو ہفتوں کے بعد ۔ ایک دفعہ جسم پر خارش سی معلوم ہوئی میں کھُجلاتی رہی ۔ چھوت سے کھجلی کا مرض سارے گاؤں میں پھیل گیا ۔ بچوں

بوڑھوں، جوانوں سب کو خارش سے سال بھر تکلیف ہوتی رہی۔ ایک دوسرے موسم میرے گھر میں چوہے مرنے شروع ہوئے۔ میں نے اُٹھا کر کوڑے کرکٹ کے ساتھ کوچے میں ڈالنے شروع کئے۔ مجھے طاعون کا مرض ہوا اور تھوڑے عرصے تک بیمار رہ کر مرگئی۔ یہ مرض بھی دُور دُور پھیلا۔ مجھ پر موت کے بعد یہ وبال آیا کہ میں دو ہزار سال کے لئے سورگ سے محروم ہوگئی۔ مجھ پر چار الزام ہیں۔ ایک تو لباس اور جسم کو صاف نہ رکھا۔ دُوسرے گھر میلا رہا اور گلی میں کوڑا کرکٹ جمع کرتی رہی تیسرے گاؤں میں خارش کی بیماری کا باعث ہوئی، چوتھے پلیگ کے چوہے گھر سے نکلے تو میں نے باہر پھینکے۔ اسی طرح خود بھی مری اور دوسروں کو بھی لے مری۔ لیکن صاحب اب رونے دھونے سے کیا ہوسکتا ہے۔ رات دن غلطیوں کی اصلاح کرتی رہتی ہوں۔ اب صفائی کی عادت پختہ ہو چلی ہے۔ میری نجات میں ایک سو سال باقی رہ گئے ہیں۔ بہت کٹ گئی۔ تھوڑی سی رہ گئی، یہ بھی کٹ جائے گی۔ آؤ بھائی مِل جُل کر گھر کی صفائی کریں۔ کیونکہ صفائی کی عادت سورگ میں رہنے کی ابتدائی شرط ہے۔

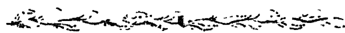
چنانچہ وہ جھاڑو دینے لگی۔ تنکا تنکا چُنا، اگرچہ مکان پہلے سے آئینہ تھا لیکن اس باہمت عورت نے غبار تک صاف کیا۔ میں بھی اسے مدد دیتا رہا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے نہا دھو کر اُجلا لباس پہنا۔ کنگھی سے بال سنوارے اور گدی پر آکر بیٹھ گیا۔ سُورج سونا بکھیرتا نکلا۔ چڑیاں محبت

کا پیغام پھولوں کے گوش گزار کر کے شاخوں سے اُڑ کر دانے دُنکے کی تلاش میں چلی گئیں ۔ ہرنی خاموشی سے آکر میرے پاس بیٹھ گئی ۔ تھوڑی دیر میں دروازہ پھر کھلا، ایک صاف لباس بزرگ تازہ دودھ کا جام لے کر آیا ۔ سلام مسنون کے بعد اس نے اندر جا کر اسے شیشہ کے گلاس میں ڈال دیا ۔ پھر باہر آکر پوچھا، کہو خاکی دُنیا کا کیا حال ہے ۔ اب تو کوئی باپ بچوں کی تعلیم سے غافل نہیں ۔ میں سمجھ گیا کہ حضرت دُنیا میں بچوں کو جاہل رکھنے کی پاداش میں دُکھ اُٹھا رہے ہیں ۔ تاہم تجسس نے استفسار پر مجبور کیا ۔ میں نے تفصیل پوچھی ۔ وہ بولا :۔

بچّوں کی تعلیم سے غافل باپ کی کہانی

اے صاحب خدا تم پر رحم کرے تین ہزار برس سے مبتلائے عذاب مصیبت ہوں ۔ خاکی دُنیا میں ہاتھ کشادہ اور مزاج لاپروا تھا ۔ باوجود مقدرت کے بچوں کی تعلیم سے غافل رہا ۔ مجھ سے دُنیا میں کسی نے یہ بیان نہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو تعلیم دینا اور دوسروں کو اس زیور سے آراستہ کرنا نیکیوں کا چشمہ ہے ۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ظالموں میں شمار کیا گیا ۔ الزام یہ کہ میں نہ صرف ہمسایہ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہ دے سکا بلکہ اپنے بچوں کی پرورش کے ناقابل ہُوا ۔ اس لئے بھینس بکری کی خدمت اور گوالے کا کام میرے سپرد ہُوا ہے ، آہ اگر میں ذرا توجہ اور تھوڑی کوشش سے کام لیتا تو ان مصیبتوں سے چھوٹ جاتا ۔

میرے اعمالنامہ میں یہ مرقوم تھا کہ ۱۶ برس تک بچے کی تعلیم اور صحت
کے والدین ذمہ دار ہیں۔ تندرست اور تعلیم یافتہ اولاد قومی دولت میں
اضافہ اور ملک پر احسانِ عظیم ہے۔ ایسا عمدہ تحفہ قوم کی نذر کرنے سے
میں قاصر رہا۔ کمزور اور جاہل بچے پیدا کر کے ملک پر مصیبت کا بوجھ زیادہ
کر دیا۔ صرف ایک میں ہی اس مصیبت میں مبتلا نہیں بلکہ گاؤں کا نمبردار
علاقہ کا ذیلدار اور بڑے بڑے چودھری بھی اسی الزام میں ماخوذ ہیں، کہ
کیوں ان کے حلقۂ اثر میں بچے جاہل رہے۔ اس وقت تو یہ نکتے نظر انداز
کئے۔ اب اپنی غلطی کا پورا احساس ہوا۔ اگر اب کہیں خاکی دنیا میں
جانا ہو تو بچوں کی صحت اور تعلیم سے ایک لمحہ غافل نہ ہوں۔ خیر اب بہت
گزری، تھوڑی سی رہ گئی۔ اے صاحب تم پر خدا کا رحم ہو۔ مجھے اجازت دو۔
وہ سلام علیکم کہہ کر چلا گیا۔ آفتاب کی آنکھ ابھی نیم باز تھی۔ ہوا ابھی قدرے
خنک تھی۔ ایک رنگین شکل اور رنگین نوا بلبل گلاب کی شاخ پر آ
کر بیٹھی۔ ڈالی اس کے بار سے کسی قدر جھکی، وہ پھول کو دیکھ کر چہچہائی
میں نے دل میں کہا، بلبل تیرے ولولے اور ترانے خاک اور افلاک
دونوں میں یکساں باقی ہیں۔ مگر انسان اپنی خطاؤں سے لمبی سزاؤں
میں پھنس گیا ہے۔ اے کاش یا ہم خاک ہوتے یا تیری طرح
فکرِ سزا سے لاپروا بلبل ہوتے۔



بے کار امیر کی کہانی

ایک دفعہ پھر دروازہ کھلا۔ ایک خوشرو نوجوان نعمتوں سے بھرا خوان لایا۔ رحم کی دعا دے کر اندر گیا۔ میرے کھانے کی میز پر سب چیزوں کو چن دیا۔ پھر خوان لے کر باہر آیا اور بولا کہ صاحب دُنیا کا حال کہو کیا وہاں اب بھی امرا نشۂ امارت سے چُور ہیں اور میری طرح محنت اور مشقت سے نفور ہیں۔ کیا اب بھی وہ اظہارِ امارت کے لئے خیرات دیتے ہیں۔ گاؤں کی محنتی آبادی کی تعلیم و تربیت کے خیال سے غافل رہتے ہیں۔ آہ! اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ دولت اور اثر کے بڑھنے کے ساتھ ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ تو جیتا مرتا اس جنجال کو قوم کے سر ڈالتا۔ خود معمولی حال میں بسر اوقات کرتا۔

میں سمجھ گیا کہ دولت کی بدمستی میں بنی نوع انسان کی کما حقہٗ خدمت سے محروم رہا۔ خود ریشم پہنا گاؤں کے ننگوں کا خیال نہ کیا۔ کبھی کچھ دیا تو نمود و نمائش کے لئے نہ محض امداد کی نیت سے باوجود اس صحیح قیاس کے مفصل ماجرا سننے کو جی چاہا۔ وہ پاس زمین پر ایک رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔ میں نے کرسی پر بیٹھنے کو کہا، وہ رو دیا اور بولا:۔

"خدا تم پر رحم کرے، میں ایک امیر گھرانہ میں پیدا ہوا۔ ناز کی گود میں کھیلا نعمتوں میں پرورش پائی۔ جس کا بچپن ان جنتوں میں گزرا ہو اس کی جوانی کیا قیامت ہوگی۔ آہ میری نازک مزاجیاں۔ ریشم پہنا۔ پھولوں کی سیج پر سویا۔ دُختِ رز مُنہ کو لگی۔ خلوت و جلوت میں عیش کے ہنگامے برپا ہوئے

آخر بہارِ عیش میں جوانی رُوٹھ گئی، بڑھاپے نے جامہ ہستی کو پُرشکن کر دیا۔ عالم پیری میں بھی گرگِ ظالم کی طرح پرہیزگار بنا۔ ہاتھ میں تسبیح لی، اور گوشۂ تنہائی میں گزر اوقات کرنے لگا۔

ذرا درد سر ہُوا۔ بہت صدقہ دینے لگا۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا جانے لگا۔ پھر حکم دیا۔ دس بجے سے دو بجے تک جو فقیر میرے دروازے پر آئے وہ ایک پیسہ خیرات پائے۔ سینکڑوں انسان صبح ہی دروازے پر آجاتے اور ایک میلہ سا لگ جاتا۔ سب دُھوپ میں بیٹھ کر جوئیں مارتے رہتے۔ دس بجتے ہی خیرات و زکوٰۃ دی جاتی۔ دوپہر تک یہ ہنگامہ رہتا۔ سب کہ وہ پکار اُٹھتے، امیر ہو تو ایسا ہو۔ آخر موت نے عمر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ مجھے اپنی غریب نوازی پر بڑا ناز تھا۔ اس جہاں میں آیا تو قصہ دگرگوں پایا۔ میری داد و دہش میری اوباشی سے زیادہ وبالِ جان ہوگئی۔ میرے اعمال نامہ پر فردِ قرار داد جرم یہ ہے کہ دُنیا کی دولت کا مالک خدا ہے۔ مخلوق اس کا کُنبہ۔ اس لئے دولت دُنیا میں برابر بٹنی چاہئے۔ تم نے جوانی میں مے نوشی کی۔ تمہارے نزدیک غریبوں نے خون کے گھونٹ پیئے۔ تم نے حریر پہنا۔ لوگ ننگے پھرے، تم نے خوش ذائقہ کھانے کھائے۔ غریبوں نے فاقے کئے۔ اگر ایسا بھی ہوتا رہتا تو بھی خیر تھی مگر بڑھاپے میں جب تقسیم خیرات کا خیال آیا تو وہی رعونت کا اندازہ جاری رہا۔ صبح سے فقیر آئے۔ دوپہر ہوگئی۔ آٹھ گھنٹے میں ایک پیسہ محنت کا ملا۔ غریب خاک میں ملے تمہارا نام روشن ہُوا۔ تم لعلوں کے لعل، وہ اسی طرح غریب اور کنگال

تم نے ان کی حالت بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی - بلکہ اپنی داد و دہش سے بھکاریوں اور ناداروں کی فوج میں اضافہ کرتے رہے - ان کو محنت کے گُر نہیں سکھائے - ان کے بچوں کو تعلیم نہیں دی - بلکہ امیری اور غریبی میں مستقل امتیاز رکھنے کی کوشش کی - تمہاری اور تمہارے جیسے لاکھوں امیروں کی خیرات و زکواۃ پر خدا اور اس کے فرشتوں نے لعنت بھیجی ہے کیونکہ غریبوں کو تنگ دستی کی مصیبت سے نکالنے کی بجائے تم نے ان کو اس گڑھے میں ڈالے رکھا - اس لئے اب اپنے کئے کی بوجوہ ذیل سزا بھگتو :-

چونکہ دُنیا میں تن آسان رہے اور محنت کر کے دنیا، ملک اور قوم کی دولت میں اضافہ نہیں کیا - اس لئے آٹھ گھنٹہ روزانہ کام کرو تاکہ محنت کی عادت ہو جائے -

چونکہ تمہارا روپیہ غریبوں کو قعرِ مذلت سے اُٹھانے کی بجائے غریبی اور امیری امتیاز کو قائم رکھنے کا باعث ہوا اس لئے تم دوسروں کی چاکری کرو تاکہ طبیعت سے امارت کی بُو جاتی رہے -

چونکہ تم نے دُنیا میں خوب پیٹ پوُجا کی اس لئے اب ہر دوسرے دن روزہ رکھو - دوسروں کو عمدہ کھانے کھلاؤ - خود نانِ خشک کھاؤ -

چونکہ تم تعلیم کی روشنی پھیلانے کا باعث نہیں ہوئے - اس لئے تم اس دُنیا میں کوتاہ بیں رہوگے اور دُور بینی سے محرومی کا مزہ چکھو گے -

چونکہ تم نے غریبوں کو اپنے برابر کا نہ سمجھا اس لئے ہمیشہ دوسروں

کے مقابلہ میں فرش پر بیٹھو۔ تاکہ تمہیں ذلت کا احساس ہو اور طبیعت سے رعونت جاتی رہے۔

اگرچہ میں ابتدا میں اس کو ناانصافی سمجھتا تھا مگر اب پانچ ہزار برس گزر جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں اسی سزا کا مستحق ہوں۔ اب بھی کبھی کبھی وہی رعونت عود کر آتی ہے، میں لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہوں۔ پھر خود اپنی موجودہ حالت کا خیال کر کے شرمندہ ہوجاتا ہوں بہشت میں سب کا درجہ برابر ہوگا۔ ہر ایک رحیم حلیم اور منکسر المزاج ہوگا۔ اگر میں اپنی دُنیاوی عادات کے ساتھ بہشت میں چلا جاتا تو ان غریبوں کے لئے جنہوں نے میرے ہاتھ سے زکوٰۃ وخیرات لی جنت کو دوزخ بنا دیتا۔ خدا جانے کس کس کو ڈانٹتا، کس کس کو دیکھ کر سلام کا متوقع ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری بدعادات دُور ہو رہی ہیں اور میری آنکھیں کُھلتی جاتی ہیں۔

اب میں آٹھ گھنٹے روزانہ مارا مارا پھرتا ہوں، دوسروں کیلئے نعمت خانے سے سب چیزیں لاتا ہوں۔ مگر خود ایک دن خشک روٹی کھاتا ہوں، دوسرے دن فاقہ کرتا ہوں، خیر صاحب بہت کٹ گئی۔ تھوڑی باقی ہے۔ اب شکوہ شکایت سے کیا سُود۔" اس نے اپنا ماجرا ختم کیا اور اُٹھ کر چل دیا۔ میں خیالات میں غرق وہیں بیٹھا رہا۔ ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے نے پتوں میں کچھ سرسراہٹ پیدا کی۔ شاخیں جھُومیں۔ حوض کے صاف پانی میں دھیرے دھیرے دلفریب موجیں اُٹھیں، طبیعت میں ایک سرور سا پیدا ہوا۔ میں نے ایک انگڑائی سی لی۔ پھُولوں کے زیور سے آراستہ

شاخوں کو دیکھنے لگا۔ لطافتِ فضا کی داد دی۔ کچھ بھوک محسوس ہوئی کھانا کھایا۔ پھر باہر آ بیٹھا۔ ہرنی سایہ میں گھاس چُگ رہی تھی، خرگوش اِدھر اُدھر کھیل رہے تھے، چڑیاں درختوں کے پتوں میں چہچہا رہی تھیں۔ میں نے دِل میں کہا! اے دُنیا کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے والے جاندارو، تمہاری آزادیاں باعثِ صد رشک ہیں۔ آہ اس بدقسمت انسان کی اس جہان میں پابندیاں رونے کے لائق ہیں۔ جس نے دُنیا کی دلفریبی میں اضافہ کرنے کی بجائے اپنے ضرر رساں عمل سے دُنیا کو دوزخ بنا دیا۔ ہر چند یہ مکان آسائش سامان ہے۔ مگر دروازہ کھول کر باہر جھانکنے کی اجازت نہیں، یہ تنہائیاں تو مجھے مار ڈالیں گی۔

میں اُٹھا، دروازہ کی طرف بڑھا، بند پا کر کھٹکھٹایا۔ سیاہ پوش پہرہ دار معاً اندر آیا۔ میں نے پوچھا، تم پر سلامتی ہو۔ میں کب تک پابند اور دربند رکھا جاؤں گا۔ اس نے کہا "اعمال نامہ پڑھو"! اتنا کہا اور چلا گیا۔ دروازہ بند کر کے میں آرام چوکی پر آ بیٹھا۔ ایک لمحہ کے بعد اعمال نامہ اُٹھایا اور یہ جواب مرقوم پایا۔

"باہر جانا دوسروں سے ملنا تمہاری طبیعت کی اصلاح پر موقوف ہے۔ جو لوگ دُنیا میں جان ستانی کا باعث ہوئے اور انسان کی جان کی قدر و قیمت کو نہ سمجھے۔ اب انہیں اصلاحِ اخلاق کے بغیر دوسروں کے ساتھ مِل بیٹھنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔ مبادا بے رحمی کی عادت عود کر آئے، جس سے نقصان کا اندیشہ ہو۔ یہاں کوئی کام شک و شبہ میں

نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک طبیعت کی اصلاح کا پورا ثبوت نہ مل جائے گا۔ تب تک پابندی اور نظر بندی برابر جاری رہے گی"۔ میں اسے پڑھ کر مایوسی کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ اور ٹھنڈے سانس بھرنے لگا۔

غریبوں کو ستانے والے شخص کی کہانی

اتنے میں دروازہ کھلا ایک خوش پوش مالی ہاتھ میں درانتی لئے آیا۔ مجھے مخاطب کر کے بولا، خدا تم پر رحم کرے کیا اب تو کوئی دنیا میں میری طرح کاہل اور سست نہیں جو دوسروں کا مال کھاتا ہو۔ اور خود کچھ نہ کماتا ہو!" میں بولا بہت۔ اس نے کہا آہ میری جان، اگر میرا حال وہ سن پائیں تو محنت کر کے کھائیں۔ میں نے کہا برادر تم پر خدا کا رحم ہو۔ سارا ماجرا مفصل کہو۔ وہ بولا بھائی داستانِ غم تفصیل کی متحمل نہیں ہوتی۔ کوئی خوشی کا قصہ ہو تو کہانی طولانی کر کے دل بہلا لیا جائے۔ ماجرائے غم ہمیشہ مختصر ہی اچھا ہے۔

میرا قصہ یہ ہے کہ پانچ سو برس ہوئے میں اور میرا بھائی خاکی دنیا میں پیدا ہوئے۔ باپ بچپن میں مر گیا۔ ماں کی عمر نے بھی زیادہ وفا نہ کی، محلے میں یوں تو کسی کو مجھ پر رحم نہ آتا البتہ جب کسی کا بچہ بیمار ہو جاتا تو بچے کی بلا ٹالنے کے لئے ہماری تلاش ہوتی۔ صدقے اور خیرات کے نام پر کچھ مل جاتا۔ اس طرح کے ٹکڑے کھا کر ہم پلے اور جوان ہوئے۔ میری طبیعت میں اہلِ دنیا سے نفرت پیدا ہو گئی۔ میں نے اور میرے بھائی نے اپنی طرح کی خانہ برباد یتیم لڑکیوں سے شادی کی۔ میرا بھائی متاہل

زندگی کے باوجود گوشہ نشین ہوگیا۔ اور رات دن یادِ الٰہی میں مشغول رہا
بیوی بچے بھوکے مرتے تھے۔ مگر یہ مردِ خدا رکوع و سجود میں رہتا۔ میں چوری
اور عیاری سے روپیہ لاتا۔ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا۔ ابتدا
میں مجھے اپنے ٹکڑوں کے پروردہ سمجھ کر اہلِ محلہ بات بات پر گالی گلوچ اور
مارپیٹ کرتے تھے۔ میں یہ ساری تکلیفیں اُٹھاتا تھا لیکن زبان سے کچھ
نہ کہتا تھا۔ جب کوئی محلہ کا صاحبِ ثروت شخص پاس سے گزرتا تو وہ ضرور
مجھ سے آداب بجالانے کی اُمید رکھتا اور مجھے گھورتا۔ میں نہایت عاجزی
سے دانت نکال کر سلام کرتا۔ وہ خوش ہو کر گزر جاتا اور اس شان سے
چھڑی اُٹھا کر جواب دیتا کہ میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ کبھی دل
میں خیال آتا کہ الٰہی کیا غریب لوگ امیروں کو سلام کرنے کے لئے بنے
ہیں۔ کبھی اپنی غریبی پر اپنے آپ کو ملامت کرتا۔ کبھی ان کی ثروت پر
لعنت بھیجتا۔ آہستہ آہستہ مجھے خدا کے انصاف پر بھی شبہ ہونے لگا۔

جب میرا بھائی مجھے نماز کے لئے کہتا کہ مجھے تیر سا لگتا۔ بے انصاف
خدا سے مجھے کوئی محبت نہ رہی تھی۔ اور نہ اس کی بنائی ہوئی دُنیا سے
کوئی دلچسپی تھی۔ صاحب تنگ دستی دُنیا میں بدتریں لعنت ہے۔ میں دُنیا
سے بالکل مایوس ہوگیا۔ مایوسی نے نفرت کو بھڑکایا۔ نفرت نے مجھے
مشتعل کر دیا۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ میں بھی برابر کا انسان ہوں میں
ہی کیوں جھک جھک کے کورنش بجالاتا ہوں۔ میں رفتہ رفتہ بیباک ہونے
لگا۔ اب کوئی دولت مند پاس سے گزرتا۔ تو میں آنکھ نہ ملاتا۔ وہ

یُونہی گھورتا چلا جاتا - ایک دن میں گھر کے دروازے پر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے پیٹ سے بھُوکا بیٹھا ہُوا تھا کہ میر محلہ کا صاحب زادہ لباس فاخرہ پہنے اٹھلاتا اور چھڑی گھماتا ہُوا آیا - اُس نے مجھے خواہش سلام میں گھورا اور میں نے بھی گدلائے متکبّر کی طرح آنکھیں دکھائیں - غریب تو صُورت سے ہی رمضانی مار کھانے کی نشانی ہوتا ہے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بید برسانے شروع کر دیئے اور کہا کمبخت بیٹھا شریفوں کی بہو بیٹیوں کو گھورتا ہے ۔

صاحب غریب بڑا بزدل ہوتا ہے ۔ جُوں جُوں جُوتے کھاتا ہے ۔ زیادہ عاجز ہو جاتا ہے - میں مار پیٹ کی اصل وجہ جانتا تھا - اب ہمسری کے نشے ہرن ہو گئے - میں نے جھٹ جھُک کر سلام کیا - وہ فتح کے فخر سے ایڑی اُٹھا کر بولا کہ آ گیا ہوش - میں بے بسی سے آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور چُپکا ہو رہا - جب وہ چلا گیا تو میرے دِل سے رُعب دُور ہُوا - اپنی بُزدلی پر نادم ہُوا - جُوتے بھی کھائے اور سلام بھی کرتے بنی - میں نے کہا - اس زندگی سے موت بہتر ہے جو ہو سو ہو مار کھا کھا کر مروں گا مگر اس طرح رُعب میں آ کر پھر سلام نہ کروں گا -

چنانچہ میں میر محلہ کے صاحب زادہ کے انتظار میں دیر تک بیٹھا رہا - وہ واپس آیا - مجھے دیکھ کر مُونچھوں کو تاؤ دیا - میں نے بھی آستینیں چڑھائیں - غریب کا امیر کے مزاج کے خلاف کوئی حرکت کرنا بارُود کو آگ دکھانا ہے - وہ میری گستاخی کی تاب نہ لا سکا - آگ بگولا ہو گیا -

مجھ پر چھریاں برسائیں۔ میں نے بھی پٹے کا ہاتھ دکھایا۔ وہ معشوق اندام زمین پر گر گیا۔ غریب طبقہ دل میں خوش ہوا۔ اور گھر میں بیٹھ کر میری ہمت کی داد دی مگر صاحب ثروت طبقہ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس فتنہ کو یہیں دبا دو۔ ورنہ حوصلہ زیادہ بڑھا تو قیامتیں برپا کرے گا۔ غریب لوگ ہمیشہ اُمراء کا آلۂ کار بنے رہے ہیں۔ ایک غریب کو کچھ دے دلا کر چوری کی تہمت لگانے پر آمادہ کیا اور کچھ تنگ دستوں نے لے دے کر جھوٹی گواہی دی۔ غریب غریب یا امیر امیر کے درمیان جھگڑا ہو تو انصاف ممکن ہے، امیر اور غریب کے درمیان تنازع ہو تو انصاف نہیں ہو سکتا۔ قانون غریب کو پیتا ہے۔ دولت مند قانون پر حکومت کرتا ہے۔ میں چیختا رہ گیا۔ کسی نے ایک نہ سُنی۔ کوتوال نے پکڑا، قاضی نے قید کر دیا۔ جو لوگ میر محلہ کا مقابلہ کرنے پر خوش تھے۔ خوشامدانہ اُمراء کے پاس میری بُرائیاں کرنے لگے۔

جیل کی مصیبت اور بدمعاشوں کی صحبت نے مل ملا کر اس نتیجہ پر پہنچایا کہ غریب امیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے پہلے بیوقوفوں کو لُوٹ کر اور غریبوں کا خُون چُوس کر امیر بننا چاہئیے۔ پھر غریبوں کے ذریعے سے میر محلہ سے انتقام لینا چاہئیے۔ چنانچہ رہا ہو کر میں نے کئی سادہ مزاج مرد عورتوں کا مال مارا، کچھ روپیہ سُود پر لگایا۔ باقی کی زمین خریدی۔ روپیہ کا کاروبار جلدی ہونے لگا۔ اب سادہ لوح غرضمند میش از پیش پھنسنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں نہ صرف فکرِ معاش سے آزاد ہو گیا بلکہ انتقام لینے

کے قابل بھی ہو گیا۔ غریب اور غرض مند ہر وقت میرے پاس رہتے۔ میر محلہ میرے مقابلے میں بے وقعت ہو گیا۔ اب میں نے غریبوں کو لالچ دے کر میرِ محلہ کے جُوتے لگوائے۔ پھر جھُوٹا استغاثہ کروایا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اس نے بھی بڑے گھر کی سیر کی۔ اب میرے دِل کی آرزُو پُوری ہوئی۔ روپے کی ہیرا پھیری کے باعث مجھ پر متعدد مقدمے چلے۔ زر کے زور سے قانون کی زد سے محفوظ رہا۔ ایک دفعہ جعلسازی کا الزام لگا۔ الزام درست تھا۔ راشی قاضی بدل چُکا تھا۔ نیا قاضی امین و متدین تھا، کوتوال نے ڈر کے مارے مجھ سے کچھ نہ لیا اور چالان کر دیا۔

قاضی کی نیکو سیرتی کی شہرت سُن کر مجھے رشوت دینے کا حوصلہ نہ ہُوا اب مجھے جیل کے نقشے خواب میں ڈرانے لگے۔ میں متوحش ہُوا۔ میرا بھائی میرے پاس آیا۔ خدا کے خوف سے ڈرایا۔ نماز اور خیرات کی تلقین کی۔ نماز شروع ہوئی، خیرات بھی بٹی، گواہوں کو بھی راضی کیا۔ اسی طرح سچ کو جھُوٹ کر دیا۔ قاضی برأت پر مجبور ہُوا۔ میرا بھائی میرے پاس بھاگا آیا کہ دیکھا خدا کا کیسے فضل ہُوا۔ یہ سب نماز اور خیرات کی برکت ہے۔ اب بُری کمائی سے توبہ کرو اور کان پکڑو۔ میں نے کہا اگر روپیہ میں اضافہ نہ کروں گا۔ خیرات کہاں سے دوں گا۔ وہ چُپ ہو گیا۔ میں نے اپنا پیشہ زیادہ حوصلہ سے جاری رکھا۔ نماز اور خیرات کی طرف زیادہ توجہ کر کے پورے طور پر مطمئن ہو گیا کہ اب قاضی اور کوتوال کی کیا فکر۔ جب سب حاکموں کا حاکم خوش ہے تو پھر کِس کا ڈر۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ نماز اور خیرات نے بڑا کام

کیا۔ قاضی اور کوتوال دونوں کو کبھی ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگر ایک مظلوم نے میرے خلاف آواز بلند کی تو ہزاروں زبانوں نے تردید کی۔ اس طرح مظلوم کی فریاد نقارخانہ میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی۔ میں نے بے غل و غش بیوقوفوں کو لوٹا اور غریبوں کا خون چوسا۔ غرض تھوڑے دنوں میں میری نیکی اور پرہیزگاری کی دھاک بیٹھ گئی۔

اب محلّے کے ایک ایک سرکردہ شخص کو گھورتا تھا۔ وہ گڑگڑا کر مجھ سے کلام کرتے تو میں سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ ایک دن میرے اسی بھائی نے مجھے کہا کہ دیکھو انہیں لوگوں کے جھوٹے ٹکڑوں پر پرورش پائی۔ انہی سے یہ بُرائی۔ میں بولا کہ یہ ٹکڑے کب محبت سے کھلاتے تھے۔ ورنہ تمہیں معلوم ہے کہ کئی کئی دن فاقوں گزر جاتے تھے۔ اب محلّہ بھر کی بلائیں مجھ میں جمع ہیں جب تک جیتا ہوں ان کے لئے زندہ مصیبت بنا رہوں گا اگر ماں باپ کے مرنے کے بعد محبت سے پرورش کی ہوتی یا عمدہ تعلیم دی ہوتی تو میں کب ان کے خلاف زبان کھولتا۔ نہیں بلکہ ان کے اور ان کی اولاد کے دُکھ درد میں شریک ہوتا۔ وہ بولا کہ اچھا یہ تو ہوا بھلا بے کس لوگوں نے کیا بُرا کیا ہے۔

میں نے جواب دیا بھائی یہ کیا بات فرمائی۔ بے کس طاقتوروں کی خوراک ہیں بڑی مچھلی چھوٹی کو ڈکار جاتی ہے۔ بے عقل لوگ دانا آدمیوں کی کھیتیاں ہیں۔ وہ پیدا کرتے ہیں، یہ کھاتے ہیں۔ اقوام اور افراد میں یہی قانون جاری و ساری ہے۔ دُنیا کا یہی انصاف ہے کہ طاقتور قومیں کمزور

لوگوں کو غلام بنائیں۔ عقلمند آدمی کم سمجھ آدمیوں کو لوٹ لوٹ کر کھائیں۔
عدل و انصاف کا تخیل جو تمہارے ذہن میں ہے وہی اگر دُنیا کا قانون ہوتا تو جہان میں کوئی امیر اور کوئی غریب نہ ہوتا، کوئی حاکم نہ رہتا کوئی محکوم نہ ملتا۔ پھر یہی دُنیا بہشت ہو جاتی۔ برعکس اس کے تم دیکھتے ہو کہ ایک کو مانگے بھیک نہیں ملتی، دوسروں کو مرغن غذا ہضم نہیں ہوتی۔ ایک کے تن پر ریشم زیب دیتا ہے۔ دوسرے کو جامہ ہستی میں رہنا مشکل ہے، کوئی امیر ہے، کوئی فقیر، کوئی شاہِ بے پرواہے کوئی گدائے بے نوا۔ اگر امیر و غریب شاہ و گدا سب ابنِ آدم ہیں تو اُمرا اور شاہ نے ترکہ کہاں سے پایا۔ ظاہر ہے کہ دوسروں کا حق دبا یا۔ تم کسی عالمِ دین سے جا کر پوچھو تو دولتمندی کو رحمت خداوندی کہے گا۔ فلاں شخص ورثے سے بڑا دولت مند ہے میں اپنی عقل سے بڑا دولتمند ہو گیا ہوں۔ اس لئے مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔ مگر بھائی تم مجھ کو مطعون کرتے ہو۔ وہ بولا کہ ان لوگوں کے ورثے میں امارت آئی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ تم ابھی خاموش رہو۔ جب ہمارا ترکہ ہماری اولاد کو ملیگا تو میرے غصب اور غارتگری کی کہانی کوئی جاننے نہ پائے گا۔ ہماری اولاد امیر ابنِ امیر کہلائے گی۔ اور ہماری اگلی نسل صاحب توقیر ہو جائے گی۔ کئی مولوی مُلّا ختم پڑھنے آئیں گے۔ زاہد و عابد کھا جائیں گے اور جان و مال کو دعا دیں گے۔

قصہ کوتاہ بھائی کی عمر سجدہ سجود میں، میری زندگی غریب لوگوں کو لوٹنے کھسوٹنے میں گزری۔ آخر کوسِ رحلت بجا۔ کاروانِ عمر نے منزل ختم

کی اور ہم اس دُنیا میں آئے۔ مجھ پر الزام لگا کہ دُنیا میں غریبوں اور سادہ لوحوں کا مال مارا اور محنت نہ کی۔ میرے بھائی قصور وار ٹھہرے کہ محض عبادات میں مصروف رہا۔ بیوی بچوں کی خبر نہ لی اور اہلِ عالم کی خدمت کا حق ادا نہ کیا۔ غرض لوگوں کا مال اُڑانے والا اور بے محنت بیٹھ کر کھانے والا دونوں موردِ عتاب ہوئے۔ میں نے عذر کیا کہ دُنیا کا آئین ہی ایسا ہے۔ اعمالنامہ میں لکھا پایا کہ باہمت لوگ آئین کو بدل دیتے ہیں۔ آئین ہمت کر کے بدلا ہوتا۔ امیر و غریب کو برابر کا بھائی بنا دیا ہوتا۔ مگر تم نے کم فہم لوگوں کو اُمراء کی طرح حرص و آز کا شکار اور غریبوں کو سرمایہ داروں کی طرح انتقام کا آلۂ کار بنایا۔ دُنیا کی بُرائی میں اور اضافہ کیا۔

بھائی نے آہِ سرد بھری کہ اطاعت و عبادت کا یہ صلہ! اس کے اعمالنامہ میں مرقوم پایا" دنیا میں سب سے بڑی عبادت بچوں کی تعلیم اور پرورش کمزوروں کی مدد اور اعانت ہے جس ذات پاک کو کسی امداد کی پروا نہ تھی، اس کی دہلیز پر دھرنا مارے بیٹھا رہا۔ جو تیرے ہاتھ اور مُنہ کو تکتے تھے۔ اور مستحق امداد تھے۔ تُو نے آنکھ اُٹھا کر اُن کی طرف نہ دیکھا۔ ہاتھ ہلا کر محنت نہ کی۔ بھائی کے مالِ حرام پر اُن کی پرورش ہوئی۔ تم نے اور تمہاری تعلیم کی بدولت تمہارے بھائی نے خدا کی حیثیت قاضی سے کم قرار دی۔ متدین قاضی تو رشوت و خوشامد سے کام نہیں کرتا مگر نماز کی خوشامد اور زکوٰۃ کی رشوت سے خدا حسب خواہش کام کر دیتا ہے۔ گویا تمہارا خدا قاضی سے بہتر نہیں۔ قاضی تو رشوت و رعایت کے قریب نہ جائے اور تمہارا خُدا

نماز اور خیرات سے خوش ہو جائے۔ غرض قرار پایا کہ انسانی سوسائٹی کے لئے ہم دونوں بھائیوں کی زندگی یکساں طور سے لعنت ثابت ہوئی۔ اس لئے اس جہان میں ہم مردود ہوئے۔ اب صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں تب کہیں کھانا ملتا ہے۔

پابندی

یہ کہہ کر وہ رخصت ہؤا۔ اس وقت آسمان نکھرا ہؤا تھا۔ چمکتے آفتاب کی تیز کرنیں چاندی کے محل پر پڑ کر آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ میں پانی کے حوض کو دیکھنے لگا۔ رنگین مچھلیاں نیلگوں پانی میں چلتی پھرتی کیا بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ کبھی وہ سطح آب پر آتیں اور کبھی نہر کی تہ میں بیٹھ جاتیں۔ پھر اٹھتیں، اِدھر اُدھر بھاگتیں، حوض کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آجاتیں۔ اُن کی اس پابندی سے اپنی نظر بندی کا خیال آیا۔ آہ میری گنہگار جان تو بھی اس حوض کی مچھلیوں کی طرح ماہیِ کم آب ہے۔ اس چھوٹے باغیچہ تک تیری گلگشت محدود ہے۔ قوموں کے لئے غلامی افراد کے لئے قید بدترین لعنتیں ہیں۔ میرا عمل بے شک دُنیا میں بدترین تھا۔ اب میں سزا کے طور پر بدترین لعنت میں مبتلا ہوں۔ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ نصاف فروشی کی، بے گناہ کی جان لی، بلاشبہ میں انتہا کا خودغرض ہوں۔ یں انسانی جان کے اتلاف کا باعث ہؤا۔ لاریب مجھ بے انصاف پر اعتبار کرنا عین انصاف ہے۔ اور میں سخت ترین مصیبتوں کا مستحق ہوں، مگر طبیعت نے

اپنے خلاف فتویٰ قبول نہ کیا۔ پھر خیال آیا کہ اتنی لمبی مدت پابند و نظربند رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔ اب مجھے کافی عبرت ہوگئی ہے۔ خدایا میری توبہ قبول کر اور پابندیوں سے آزاد کر، غمگین دل کو شاد کر، سب کو مل بیٹھنے اور حق و انصاف سے رہنے کا ایک اور موقع دے۔ ہم پر رحم کر، انتقام نہ لے۔

اس پر دل سے یہ آواز اُٹھی ۔ دوکاندار جو کم تولتا ہے، گواہ جو جھوٹ بولتا ہے۔ کوتوال جو رشوت لیتا ہے، قاضی جو رعایت سے فیصلہ دیتا ہے، خاوند جو بیوی سے بُرا سلوک کرتا ہے، باپ جو اولاد کی پرورش اور تعلیم سے غفلت برتتا ہے، بیٹا جو والدین کی خدمت سے گریز کرتا ہے، اچھوت جو چھوت سے پرہیز کرتا ہے، امیر جو غریب کو ستاتا ہے، زور آور جو کمزور کو دباتا ہے سب ظالم اور بے انصاف ہیں۔ جہاں ظالم اور بے انصاف انسانوں کی بستی ہے اگر سب کو ہر ایک کی خواہش کے مطابق آزاد کر دیا جائے اور عالم کا انتظام بھی ہمارے سپرد کر دیا جائے تو اس سرزمین کا کیا نقشہ ہو، گریہ و بکا کا شور، صُورِ اسرافیل کی صدا سے زیادہ بلند ہو۔ انسانوں کے لاشے خون کی ندیوں میں تیرتے نظر آئیں۔ سر معززوں کی نوکِ کفش سے ٹھکرائے جائیں۔ جہاں گواہ جھوٹے، کوتوال رشوت خوار، قاضی بے ایمان ہو وہاں پل بھر میں نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ بعض دُنیاداروں کا یہ مقولہ صحیح تھا کہ دُنیا نیکوں کی وجہ سے قائم ہے۔ خاکی دُنیا میں کچھ بھلے آدمی تھے کچھ بُرے لوگ۔ تباہ ہوتا گیا بھلا بُرا انتظام قائم رہا۔ اگر اس طبقۂ ارذل کے آدمی جن کی نیک خصلتیں خوابیدہ اور شرپر نفس بیدار ہے۔ سب کے سب یک بیک آزاد ہوجائیں۔

اور اپنی طبیعت اور عادت کے مطابق کام کرنے پائیں تو مجھے خود قدرِ عافیت معلوم ہو جائے۔

یہ خیالات دِل میں آئے تو سجدہ میں گر گیا اور عجز و الحاح سے کہا، یا خدا ہم پر رحم فرما۔ ہم گنہگاروں کو اصلاح کے راستے پر لگا۔ دُنیا کے لوگوں کو انصاف سے رہنے کی توفیق دے۔ تاکہ وہ بہشت میں جائیں اور اس سنہری دُنیا کے خوبصُورت مناظر کا لطف اُٹھائیں۔ عمدہ تریں کھانوں اور بہترین نعمتوں کا مزا چکھیں، شیریں پھل کھائیں اور ٹھنڈے پانی پئیں۔ بہتی ندیوں کے کنارے گھنے سائے میں بیٹھ کر حور وش بیوی اور غلمان رو بچوں کی رفاقت سے لُطف اندوز ہوں۔ آمین۔ اِس دُعا کے بعد میری طبیعت سے خوشی اور غمی کی کیفیتیں آہستہ آہستہ محو ہونے لگیں۔

رات تک کا پروگرام پورا کر کے لیٹ گیا۔ قیدِ تنہائی کیسی صبر آزما اور روح فرسا ہوتی ہے۔ دماغ پر بوجھ سا معلوم ہوتا تھا اور خیالات پریشان تھے۔ دُنیا کے نظارے اس جہان کی عقوبت اور قید کی مدت میں مدھم فلم کی طرح فکر کے پردے دل پر دھندلی سی صُورت دکھا جاتے تھے۔ میں سونے کی ہزار کوشش کرتا تھا مگر ناکام رہتا تھا۔ سینکڑوں کروٹیں بدلیں، آنکھیں بند کیں اور تنگ آ کر کھول دیں۔ لیٹا لیٹا اُٹھا، اُٹھ اُٹھ کر لیٹا اسی طرح لیٹتے بیٹھتے رات کٹی۔

صبح کا پروگرام شروع ہوا۔ جوں جوں دن چڑھا میں خوش ہوتا گیا۔ وہی بی صفائی کے لئے آئی۔ انسان کا مُنہ دیکھ کر شگفتہ ہو گیا۔ صبح گذری دوپہر

ہوئی - دن ڈھلا - میں فکر میں غرق ہوا۔ سورج ڈوبا - میرا رنگ فق ہوا۔ تنہائی کی رات آئی، ہر گھڑی پھر پہاڑ بن کر سر پر کھڑی تھی - بھوک کم لگی - پریشانی زیادہ بڑھی۔ میں بستر خواب پر لیٹ کر خیال کی دنیا میں چلا گیا۔ الٰہی یہ تنہائیاں تو مجھے پاگل کر دیں گی - میں اتنی مدت انہیں کب برداشت کر سکوں گا۔ طبیعت کو ہر چند خوشی کی طرف لاتا تھا - مگر دل فکر کی طرف جاتا تھا۔ سر بے تابی سے تکیے پر مارتا تھا - ٹانگوں کو سکیڑتا اور پھیلاتا تھا۔ یہ شب کی ابتدا تھی، اس کی انتہا کب ہوگی - میں نے کئی دفعہ فصل گل کے شگفتہ نظارے برسات کی دلفریب بہاریں اپنے قوتِ خیال سے پیدا کیں مگر دل پر خزاں کی سی اداسی چھائی رہی - نیند کو موت کا واسطہ دیا - پر وہ نہ آئی -

یونہی تڑپتے کلپتے صبح ہو گئی - بارے طبیعت کا بوجھ ہلکا ہوا۔ رات کی کوفت دور کرنے کے لئے میں پھولوں کی سیر میں مشغول ہو گیا - خرگوشوں سے کھیلا - ہرنی کے پیچھے دوڑا - مچھلیوں کی تیراکی دیکھی - صبح گئی - دوپہر ڈھلی - شام ہوئی رات کالی بلا کی طرح دکھائی دی طبیعت کی پریشانی بڑھی، رات خدا خدا کر کے آنکھوں میں کاٹی - صبح طلب شیر اڑاتی آئی تو کچھ قلب کو تقویت ہوئی - مدت تک یہی لیل و نہار رہے - میری طبیعت بگڑی، بال جلد جلد سفید ہونے لگے - چہرے پر جھریاں پڑ گئیں - آنکھیں اندر دھنس گئیں - میں ہر روز اضطراب سے نامۂ اعمال اٹھاتا تھا - سیاہ پوش محافظ کو بار بار کے استفسار سے ستاتا تھا - مگر نظر بندی کا عرصہ جلد جلد ختم ہونے کا اشارہ بھی نہ پاتا تھا - سوچتا تھا الٰہی میرا کیا انجام

ہو گا۔ یہی کیفیت رہی تو کہیں دماغ نہ چل جائے۔

یاد رہے کہ حضرت آدم بہشت کی خوشگوار فضاؤں میں یاس انگیز تنہائی کو برداشت نہ کر سکے تو خلاقِ اکبر کے حضور میں سجدہ ریز ہو کر دُعا مانگی۔ کہ کوئی ایسا مُونسِ تنہائی ملے جو دِل کی بستی آباد کرے اور طبیعت کو گرمائے حضورِ حقیقی نے آدم کا دِل بہلانے کو حوّا کی تصویر بنائی۔ اس میں رُوح ڈالی وہ مُسرّت کی پُتلی بن کر آدم کی آنکھوں کو بھائی۔ دِل کا ویرانہ معمور ہُوا غم تنہائی دِل سے دُور ہُوا۔ رفیقہ حیات جب تک ساتھ رہی جنگل میں منگل رہا۔ خلد سے گِر کر وادی خاک میں آیا تو تنہا گھبرایا۔ اس کے ہجر میں خون کے آنسو رویا۔

اس قید کی تنہائیاں مجھ ابنِ آدم پر شاق ہوئیں تو دل نے چاہا کہ کوئی حوّا کی بیٹی یہاں اقامت کے لئے آجائے اور غم انگیز تنہائی اور یاس انگیز رات کی تاریکیوں کو دُور کر دے۔ وُہ گھر میں مسرّت کی پھول بن کر بکھرے اور مجھ پر مسرّتوں کا دروازہ کھول دے۔

جس گھر میں خوش مزاج اور پاک باز عورت ہے۔ وہاں یاس اور غم پاس نہیں پھٹکتے۔ یا الٰہی اگر نظر بندی مقدر ہے تو کوئی ایسی مونس غم ہی دلا دے جو قید کی کلفت کو خوشی میں بدل دے۔ یہ دُعا مانگی۔ اعمالنامہ اُٹھایا تو یہ جواب پایا۔ تُو نے دُنیا میں ایسی ہی خواہش کی تھی جو پوری ہوئی مگر تیرے جدّت پسند مزاج نے عشرت جہاں کو ڈھونڈا گھر چھوڑا بازار میں زندگی بسر کی۔ خدا کی حکومت ہے انسان کی خواہش کے

مطابق کام سر انجام نہیں پاتے۔
غرض راتیں گھڑیاں گن گن کر اور دن جماہیاں لے لے کر کٹنے لگے۔ میں ایک سال کے اندر بوڑھا دکھائی دینے لگا۔ ۱۵ برس کے اندر پیٹھ کبڑی ہوگئی۔ لاٹھی کے سہارے بمشکل نقل و حرکت کے قابل رہ گیا۔ میں بوڑھا ہوگیا۔ میرے ساتھ میری فطرت بھی بوڑھی ہوگئی۔ میں دن بھر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہتا تھا۔ دل اُداس رہتا تھا۔ در و دیوار پر دل کی اُداسی حسرت برسانے لگی۔ میرے اپنے قویٰ کمزور تھے۔ درخت ہمزاں دیدہ نظر آتے تھے۔ دِل بڑھاپے سے افسردہ تھا۔ نونہالانِ چمن پژمردہ دکھائی دیتے تھے۔ شامِ عُمر آئی تو صبح میں پہلا سرُور نہ رہا۔ آفتاب و ماہتاب کی ضیا باری کم ہوگئی۔ موسموں کی تبدیلی بے کیف نظر آنے لگی۔ تمام حسین مناظر دلچسپیوں سے خالی ہو گئے۔ راگ میں اثر نہ رہا۔ ساز میں سوز نہ رہا۔ جوانی تو کھوئی تھی۔ اس کے ساتھ حسِ لطیف بھی کھوئی۔ لذتِ کام و زبان کھوئی۔ شوقِ بے پروا کھویا۔ غرض جوانی کیا کھوئی سب کچھ کھو دیا۔

آزادی

جب زندگی کو موت سے بہتر سمجھنے لگا تو ایک دن یک بیک باہر کا دروازہ کھلا۔ وہ سیاہ پوش فرشتہ اندر آیا۔ اس کے چہرہ پر مسکراہٹ کے آثار کسی خوشی کا پیغام دے رہے تھے۔ میں نے دھڑکتے دل سے مسکراہٹ

کا سبب دریافت کیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ آپ کی نظر بندی اور پابندی
کی مدّت تمام ہوگئی۔ مَیں سُن کر سجدہ شکر میں گرا۔ مدت تک عجز سے
خاکِ فرش پر پیشانی رگڑی۔ اُٹھا تو دُنیا کے دیکھنے کے شوق سے بغیر عمر
لحاظ کئے بھاگ کر باہر آنے لگا۔ ناتوانی نے پاؤں تھامے۔ میں لڑکھڑا کر گر
چوٹ لگی۔ سر میں چکّر سا آیا۔ آنکھوں کے سامنے کچھ اندھیرا چھا گیا۔ آدمی
خود گرے تو چوٹ کم معلوم ہوتی ہے۔ مَیں اِدھر اُدھر دیکھ کر اُٹھا۔ کپڑے
جھاڑے۔ لکڑی ٹیکتا ہوا پھر باہر نکلا۔ اِک عمر کے بعد جو باہر جھانکا۔ ہر چیز
نظر افروز اور رُوح پرور دکھائی دی۔ عجب سیر تھی، جدھر نظر اُٹھتی تھی، نظ
نظر کا دامن تھامتا کہ ٹھہرو اور دیکھو۔ بے شک سب اشیاء پہلے کی دیکھی بھا
تھیں مگر مدّتِ مدید تک محرومِ نظارہ رہنے سے ہر چیز جدید اور لذیذ معلوم
تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔ آفتاب بھی نصف النہار پر تھا
پہلے یہ سماں دیکھتا تو قلب پر کوئی کیفیت طاری نہ ہوتی۔ اب ان معمولی چیز
نے میرے دِل پر غیر معمولی اثر کیا جو غیر معمولی چیزیں تھیں ان کے اثر کا کہنا

تھوڑی دُور تک بڑی مشکل سے گیا۔ عمر کے بوجھ سے پہلے میں د
ہو رہا تھا۔ مسافت کی دُشواری سے دم پھُولا۔ لاچار ہو کر سایہ دیوار میں
گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ میں ان کو حسرت سے بیٹھا دیکھتا
چاہتا تھا کہ کوئی سہارا دے، کچھ قدم اور چلوں۔ تھوڑی دُور چل کر ا
لُطف اندوز ہوں۔ اسی سوچ بچار میں وقتِ نماز قریب آیا۔ جوں توں ا
گھر کی ٹھانی۔ میں پہلے ہی ہمت سے زیادہ منزل طے کر آیا تھا۔ ط

نے جواب دے دیا۔ زانو پر سر رکھ کر بے کسوں کی صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ میری بے کلی بڑھ رہی تھی کہ کہیں اوقاتِ معینہ کے وظائف سے محروم نہ ہو جاؤں۔ آہ، اگر ایسا ہوا تو خدا جانے کس اور مصیبت میں مبتلا کر دیا جاؤں۔ مجبور ہو کر ایک جانے والے کو پکارا۔ او میاں جانے والے! اسی سڑک پر میرا مکان ہے۔ اپنی جوانی کے صدقے اس بوڑھے کو سہارا دے اور دعا لے۔

شرارت:۔

وہ بھاگ کر میری طرف آیا، مجھ کو خوشی سے اُٹھایا اور سہارا دے کر آہستہ آہستہ لے چلا۔ خوش نصیب ہیں وہ جو جوانی میں بوڑھوں کے کام آتے ہیں، مجھے جب دُنیا میں اپنے وطیرہ کا خیال آیا تو سر دُھنا اور پچھتایا۔ میں دوسروں کے بڑھاپے پر ہنس کر گزر جاتا تھا۔ اب مجھ کو پیرانہ سالی نے آ دبایا تو یاد آیا کہ جوانوں پر بوڑھوں کی خدمت اور اعانت فرض ہے۔ اے کاش میں جوان ہو جاؤں تو کبھی عمر رسیدہ لوگوں کو نہ ستاؤں بلکہ ہر قسم کی خدمت بجا لاؤں۔ آہ مگر دُنیا میں کھویا ہوا موقع کب ملتا ہے، جو شخص خاکی دُنیا میں اہلِ دُنیا کو ستاتا ہے، اس جہان میں تلافی مافات کا کب موقعہ پاتا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کم بخت نوجوان مجھے دھکا دے کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ میں بر سرِ راہ بیٹھا بدن کے خستہ حصوں کو سہلانے لگا اور جان کے خوف سے کسی نوجوان کو مدد کے لئے بُلانے کا حوصلہ نہ رہا۔ نماز کا وقت تنگ ہو جانے کا امکان تھا۔ خود ہی کھسکتا کھسکتا اُفتان و خیزاں بصد دشواری و ہزار خواری

مکان پر پہنچا۔ نماز پڑھی اور شکر کیا۔ خیال آیا کہ کیسا جہنّمی نوجوان تھا کہ پہلے سہارا دیا۔ پھر دھکا دے کر چھوڑ دیا۔ اعمالنامہ اُٹھایا۔ اس پر یہ مرقوم پایا:۔

تمہیں خاکی دُنیا کا وہ واقعہ یاد ہے۔ جب تم نے بھی ایک بوڑھے کے ساتھ ایسی حرکت کر کے اس کو اسی طرح گرایا تھا تو اس نے تمہیں جہنّم کا مستحق ٹھہرایا تھا۔ مگر اطمینان رکھو یہ نوجوان جس نے آج تم سے استہزاء کیا ہے، قرار واقعی سزا پائے گا۔ اس نے دُنیا میں بھی کمزوروں کو ستایا تھا اس لئے تمہاری طرح مُدّتِ مدید کے لئے پابند کر دیا گیا۔ اس نے زاری و الحاح سے دُعا مانگی اور یقین دلایا کہ اب میری عادت چھُوٹ گئی ہے مجھے باہر نکلنے کا موقع ملے تو کبھی پہلا سا جُرم سرزد نہ ہو گا۔ وہ تمہاری طرح لمبی نظر بندی کو مبنی بر انصاف نہ سمجھتا تھا آج بطورِ امتحان باہر آیا تو عادت کی مجبوری سے تمہیں اُٹھا کر دے پٹکا۔ یہ واقعہ تم دونوں کے لئے درسِ عبرت ہے اور تم یہاں کے قوانین کو مبنی بر انصاف سمجھنے لگو گے۔ اگر اس عالم میں بدر اصلاح لوگ چھوڑ دیئے جائیں تو اس دُنیا کو پل بھر میں جہنّم کا نمونہ بنا دیں۔

میں پھر سجدے میں گر پڑا، اور کہا اے خدا جو تو جانتا ہے وہ میں نہیں جانتا۔

زیادہ غم اور کمال خوشی اعصاب پر یکساں اثر رکھتے ہیں۔ میں نے رات کو سونا چاہا پابندی ہٹ جانے کی خوشی میں نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتے صبح کر دی۔ آج علی الصّبح گھر سے نکلا۔ قدم قدم چلا، جگہ جگہ رُکا۔ اٹھتا بیٹھتا دُور تک گیا۔ ہر شخص اپنے کام میں مصروف تھا۔ عورتوں سے بھری گاڑیاں آتی اور اسی طرح بھری ہوئی واپس جاتی تھیں

کہ ایک اندھا نوجوان دائیں بائیں لکڑی ہلاتا بچتا بچاتا چلا آتا ہے۔ چوراہے
میں بجلی کا کھمبا تھا، باوجود احتیاط کے اندھا اس سے ٹکرایا۔ سر میں چوٹ لگی۔
لاٹھی ہاتھ سے گری۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھے بڑا رحم آیا۔
پکار کے پوچھا حافظ جی کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ وہ بولا مردِ خدا جب سے آنکھیں
کھوئی ہیں چوٹیں کھانا تو رات دن قسمت میں ہو گیا ہے۔ مگر کیا بتاؤں گھر سے
دُور ہوں عبادت کے اوقات میں تاخیر ہو رہی ہے۔ دِل مسافت کی دُوری
سے گھبراتا ہے۔ اگر وقت کھو دیا تو کیا جانے کس مصیبت میں مُبتلا ہوں گا۔
مَیں وہیں سے پکارا، حافظ جی کیا کروں مجبور ہوں، بڑھاپے کی وجہ سے معذور
ہوں نہیں تو رہنمائی کرتا۔ وہ آواز کی سمت معلوم کرکے اُٹھ کر میری طرف
آیا۔ کبڑی کمر اور جسم پر ہاتھ پھیر کر میرے قول کی صداقت کی جانچ کر کے بولا۔
بوڑھے میاں ایک کرم کرو۔ میری کمر پر سوار ہو جاؤ اور نابینا کی بینائی بنو۔
میں چلوں تم دیکھو، راہِ راست سے بھٹکوں تو بتاؤ۔ کوئی چیز سنگِ راہ ہو
تو متنبہ کرو۔ تاکہ جلدی منزل طے کروں۔ میں کسی قدر تامّل کے بعد
آخر اس پر رضی ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر بھاگا۔ میں موقع بموقع دائیں بائیں
کی صدا برابر بلند کرتا رہا۔

بالآخر اس کے مکان پر پہنچے۔ اس نے پہنچتے ہی عیسائیوں کی طرح
عبادت شروع کی۔ فارغ ہو کر آیا تو میں نے واپسی کی خواہش کی۔ اُس نے
اندھوں کی طرح آنکھیں مٹکائیں اور سر ہلایا اور کہا میاں کُبڑے تمہاری مہربانی
کا ممنون ہوں۔ اچھا خدا حافظ تم جاؤ۔ میں بالکل تھک گیا ہوں، ورنہ

میں جس طرح کمر پر لاد کر لایا تھا۔ اسی طرح لے جاتا اور تمہارے گھر تک پہنچا آتا۔ میں بوڑھا تھا اور وہ جوان اس لئے اس کی خود غرضی پر حیران تھا مجھے توقع تھی کہ وہ مجھے کم از کم روشنی کے کھمبے تک پہنچا جائے گا۔ لیکن اس کم بخت نے عجب دھوکا دیا۔ میں دل میں اس نابینا کی خود غرضی پر لعنت بھیجتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ ہمت پست اور منزل دور تھی۔ قدم قدم پر رکتا تھا، دم لیتا تھا، پھر چل دیتا تھا۔ دونوں مکانوں کی درمیانی مسافت بمشکل دو میل ہو گی مگر مجھ ضعیف کے لئے دس منزل سے کم نہ تھی۔

ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ اسی نابینا کی آواز آئی۔ اے بڑے میاں ٹھیرنا، اے بوڑھے بابا خدا تم پر رحم کرے کہاں ہو۔ آواز پہچان کر پیچھے مڑا کر دیکھا تو حافظ جی لکڑی ادھر ادھر ہلاتے ہوئے تیز قدم اٹھاتے چلے آتے ہیں۔ میں ٹھیر گیا اور وہ پہنچا۔ بڑی معذرت کی اور کہا کہ میاں خود غرضی کی عادات نے مجھے بھی اندھا کر رکھا ہے۔ دنیا میں سب سے کام لیتا تھا لیکن کسی کو کام نہ دیتا تھا۔ یہ بری عادت بصارت کھو جانے کے باوجود باقی ہے۔ تم چل دیئے تو خیال آیا کہ کس طرح تم نے مجھے یہاں تک پہنچایا اور میں نے کس مصیبت میں تمہیں پھنسا دیا۔ اس لئے اب بھاگا چلا آیا کہ تمہیں پاؤں تو کمر پر بٹھا کے تمہارے گھر پہنچا آؤں۔ میں ٹھٹک کر چپ رہ گیا، چون و چرا نہ کی۔ اس پر سوار ہو کر پہنچا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ کر دم لینے لگے۔

آفتاب کی شعاعیں کچھ تیز معلوم ہوئیں ہم نے کرسیاں سائے میں کر لیں۔ ذرا دم لے کر اس سے پوچھا، اے مہربان تمہارا نام کیا ہے۔

کہاں سے۔ وہ بولا میرا نام سلطان اور وطن بدخشاں ہے۔ میں نے پھر استدعا کی کہ دُنیا کی کہانی اپنی زبانی پوری تفصیل سے بیان کرو تاکہ کچھ وقت کٹے۔ اس نے کہا برادر اپنی بداعمالیوں کی کہانی کون بالتفصیل بیان کرتا ہے جو کہے گا۔ مختصر کہے گا۔ ہاں نیکیوں کی روئیداد ہوتی تو مزے لے لے کر بیان کی جاتی۔ جانِ برادر میری مختصر داستانِ دُنیا یہ ہے کہ......

چور اور سینہ زور کی کہانی

ایک ہزار برس ہوئے ہیں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ قدرت نے مضبوط ہاتھ پاؤں دیئے تھے۔ خوشگوار آب و ہوا میں پرورش پائی بڑا گراندیل جوان نکلا۔ مگر تربیت میں بھاری نقص رہا۔ دوسروں کی کھڑی فصل کاٹ لایا۔ تو ماں باپ نے نہ روکا۔ مویشی رات لے جاکر دوسروں کی فصلیں چرا لاتا تو والدین حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کوئی شکایت لے کر آتا تو میری حمایت کرتے تھے۔ اس طرح میرا حوصلہ بڑھ گیا اور چوری کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن اپنے ہم حیثیت اور اعلیٰ لوگوں کے مال پر ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ البتہ غریبوں کے ہاں چوری کرتا تھا۔ دیکھ پاتے تو سینہ زوری کرتا تھا۔ اس طرح میں علاقے میں سینہ زور چور مشہور ہوا۔ یہی نہیں بلکہ غریب اور کمزور لوگوں کو چلتے وقت کہنیاں مارتا تھا۔ کندھوں سے دھکیلتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر دم بخود رہ جاتے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ جب کبھی کوئی میری حرکت سے نالاں ہوتا تو میں اس

سر کھینچ دیتا تھا اور کہتا کہ اب تو بیچاروں میں سونے کا بھی حوصلہ نہ رہتا تھا۔
قصہ کوتاہ ایک مدت یونہی بسر ہوئی۔ آخر میری جوانا مرگی نے لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دی۔ اس عالم میں ایک لمبی مدت کیلئے مجھے قید کر دیا گیا میں نے ہزار زاری کی، رستگاری نہ پائی، گو ہر چیز بافراط ملتی تھی مگر پابندی نے دولت آزادی کی قدر دلنشین کرائی۔ آزادی کی ہر خواہش یہ کہہ کر ٹال دی جاتی رہی کہ تمہاری رہائی غیروں کی آزادی اور امن کے لئے خطرہ ہے۔
جب میری حالت مسلسل نظر بندی سے تنگ ہوئی تو آہستہ آہستہ بینائی کم ہونے لگی۔ ایک صبح اٹھا تو دن رات کو برابر پایا میں گھبرایا۔ ہاتھ ادھر ادھر پسارا، کچھ سجھائی نہ دیا سمجھ گیا کہ میں اندھا ہوا۔ آسمان سے ایک ہلکی سی آواز آئی کہ حافظ جی تمہاری دعا منظور ہوئی۔ اور پابندی دور ہوئی دروازہ کھلا ہے جہاں جانا چاہو جاؤ۔ خوب گھومو اور باہر کی سیر کر آؤ۔ میں نے کہا اے بولنے والے اس بے کس اندھے سے تمسخر ٹھیک ہے؟ آواز آئی حافظ جی کیا دنیا میں غریب اور ناتواں پر جبر ہوتے ہیں؟ میں اضطراب عالم میں ادھر ادھر بھاگا، دیوار سے ٹکرایا، دروازے کو ٹٹولتا باہر آیا۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ مشرق مغرب تاریک ہے۔ زمین آسمان تاریک۔ کل کائنات تاریکی کا برقع اوڑھ لیا تھا۔ محل کی دیوار کو ٹٹولا۔ اس میں سختی اور صفائی تو تھی مگر سنگ اسود سے زیادہ سیاہ معلوم ہوئی۔ میں نے خوشنما پھولوں پر ہاتھ پھیرا ان میں نرمی موجود تھی مگر رنگ نہ تھا۔ میں حوض پر جا کھڑا ہوا۔ پانی میں وہی صفائی ہوگی۔ مچھلیاں تیرتی ہوں گی لیکن مجھ بدنصیب کو اس کی لطف اندو

سے محروم کردیا گیا۔

آفتاب سنہری کرنوں کا تاج پہن کر نکلتا ہوگا۔ مگر آہ آنکھیں اس کے نظارے سے محروم ہوگئیں، خوبصورتی اور حسن کا تصور محض آواز کی بنا پر کرتا ہوں۔ مردانہ خوبصورتی کا مظہر محض سخت اور کرخت آواز رہ گئی۔ نسوانی حسن کا اندازہ بھی صرف بالیاں مترنم آواز سے کرنے لگا جھلملاتے تارے جو تاریک شب میں آسمان کی زینت ہیں۔ میری بے بصری سے کھو گئے ہیں آنکھیں کل بل کر دیکھتا تھا، مگر کہیں سے روشنی نظر نہ آتی تھی۔ سبز پتوں سے لدے درخت اس سے ڈھلے ہوئے پھول، فصلِ گل کی رنگینیاں موسم برسات کی بہاریں سب چشمِ بینا پر موقوف ہیں جب بینائی باقی نہ رہی تو لطفِ زندگی جاتا رہا۔ برادرِ عزیز کیا بتاؤں آنکھیں کھو کر کیا حال ہوا، ناتوانوں کا ناتوان کمزوروں کا کمزور ہوں، ہر قدم پر خندق، ہر طرف دیواروں اور رکاوٹوں کا شبہ رہتا ہے، ابتدا میں تو کبھی کسی جگہ ٹھوکر کھائی کبھی کسی جگہ گرا۔ اب تو پھر بھی راستے کی کچھ واقفیت ہوگئی ہے، گرتا پڑتا باہر جاتا ہوں، رکتا رکاتا واپس آ جاتا ہوں۔ اب میں طفلِ کم سن سے زیادہ عاجز اور پیرِ فرتوت سے زیادہ بے بس ہوں۔ باوجودیکہ میں اسی طرح جوان ہوں، قوتِ بینائی کی محرومی نے طاقت کے استعمال سے عاجز کردیا ہے، چوری اور سینہ زوری کا چسکا اب بھی باقی ہے۔ مگر چور کے لئے بینائی اور سینہ زور کے لئے دسترس ضروری ہے۔ نظر کے فقدان نے سب کو میری دسترس سے باہر کردیا ہے، اور میں سب کی دسترس میں آگیا ہوں۔ اب مجھے بندر رکھنے کی ضرورت

نہیں۔ میری چشم بندی نے نظر بندی سے بڑھ کر مصیبت برپا کر رکھی ہے۔ میں ویسے دُنیا میں چلتا پھرتا بھی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ہی قید ہوں۔ کیونکہ مجھے تو نزدیک و دُور تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔

اے برادر! اگر دُنیا میں جاؤں تو سب کو رو رو کر اپنا حال بتاؤں لوگوں کا مال چُرانے اور کمزوروں کو ستانے سے منع کروں۔ آہ میری جان۔ اگر اہلِ دُنیا میرا حال سُن پائیں۔ تو کبھی بُرائی کے پاس نہ جائیں۔ اُس نے اپنا قصہ ختم کیا اور اجازت چاہی۔ مجھے بھی بھُوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے خدا حافظ کہا اور وہ لاٹھی سے راہ ٹٹولتا ایک سمت کو چلا گیا۔

ہوا کے جھونکے تیز ہو رہے تھے۔ شاخیں جھوم رہی تھیں۔ ہرنی گھاس چُگ رہی تھی، نابینا کی لاٹھی کے کھٹکے سے اس نے چوکڑی بھری، ہرنی کے دوڑنے سے خرگوش بھاگے اور بھاگ دوڑ کا ایک عجیب سماں بندھ گیا۔ کھانے کا وقت ہوا۔ میں اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ سیر کو جانے آنے سے مجھے بڑی فرحت ہوتی تھی۔ میں آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگا کہ میری طاقت بحال ہو رہی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ باغ جوانی سے بہار جا کر بتدریج لوٹ آئے۔ پیری میں پھر شباب کا لُطف اُٹھاؤں۔ بڑھاپے میں جوانی کی یاد کیسی فرحت افزا چیز ہے۔ خزاں میں موسم بہار کا تصور بندھ جاتا ہے۔ عالم غم میں خوشی کا سماں آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے۔ اے جوانی بوڑھوں کے لیئے تیرا تصور بھی اکسیر ہے۔ جوانی کے خیال اور اُمید نے مجھ پر اور عمدہ اثر کیا۔ پانچ سال کے اندر میری کُبڑی کمر سیدھی ہوگئی۔

اور میں نے لاٹھی ہاتھ سے رکھ دی۔ دس برس کے اندر گیا ہوا شباب لوٹ آیا۔ جوانی کا جوبن گل کائنات پر چھا گیا۔ اب دنیا کی ہر چیز حسین تھی پھولوں کی رنگت میں شوخی، طیور کے نغموں میں گرم جوشی معلوم ہوتی تھی۔ آواز اور ساز سوز پیدا کرتے تھے۔ ولولے طبیعت کو بھڑکاتے تھے۔ محبت کے چشمے دل میں پھوٹتے تھے۔

اس عرصہ میں اس نابینا کی شناسائی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ خدا کی حکمت اس کی بینائی بھی بتدریج عود کر آئی۔ اب ہم چاہتے تھے کہ تمام عمر اس جہان کے مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں بسر کریں مگر ہمیں اعمالنامہ کی تحریر نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس میں رقم تھا کہ یہاں کے لولے لنگڑے، اندھے، بوڑھے دنیا کی شریر روحیں ہیں۔ ان کے حال میں مدد خدمت مناسب نہیں، دور سے دیکھو رحم کا خیال نہ کرو اور گزر جاؤ۔ جب ان کی طبیعت کی پوری اصلاح ہو جائے گی تو ان کی سب تکلیفیں تمہاری طرح دور کر دی جائیں گی۔ خدا تم سے زیادہ رحیم ہے۔ جب ان میں مخلوق پر رحم کرنے کا جذبہ پورے طور پر پیدا ہو جائے گا۔ تو ان کا گناہ خود بخود بخش دیا جائے گا۔

شریر اپاہج

ایک دن ہم دونوں شہر کو نکلے۔ تھوڑی دور چل کر ایک ایسا اپاہج ملا جو ٹانگوں کی بجائے بازوؤں کے سہارے چلتا تھا۔ میں نے پہچانا کہ یہ

وہ ذاتِ شریف ہیں جو ایامِ پیری کی پہلی سیر میں دھکا دے کر بھاگ گئے تھے۔
اس نے بھی مجھے دیکھا اور پہچانا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور بولا
کہ میاں تم وہی بوڑھے ہو جس کو میں نے پہلے سہارا دیا۔ پھر زمین پر پٹک دیا
آہ جو بد عادت دُنیا میں پڑ جاتی ہے، وہ پوری پاداش بھگتے بغیر نہیں
جاتی۔ ناتوانوں کو خاکی دُنیا میں ستا کر بھاگ جانا میری عادت میں تھا۔
اس دُنیا میں میری یہ دُرگت ہوئی کہ رات دن کی پابندی اور ایک مکان
میں نظربندی کا حکم ہوا۔ میں نے پابندی اور نظربندی کے دُور ہونے
کی پورے اضطرار اور عاجزی سے دُعا مانگی اور تجربتاً اس روز مجھے باہر آنے
کا موقعہ ملا مگر میں نے یہ گُل کھلایا کہ جب آپ کو فرش سے اٹھایا پھر گرایا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے قیدِ تنہائی کی سزا پائی اور اب چلنے پھرنے کی طاقت سے
بھی محروم کر دیا گیا۔ جانِ برادر مجھ کو معاف کرو اور میرے لئے رحم کی دُعا مانگو۔
آپ سے کوئی بُغض نہ تھا، عادت سے ہی مجبور تھا۔ آپ کو معذور دیکھ کر
طبیعت کو شرارت سُوجھی، اور رذیلوں کی سی حرکت کر بیٹھا۔ لہٰذا آپ معاف
کر دیجئے۔ شاید اللہ مہربان ہو جائے۔ وہ پھر رونے لگ گیا۔ مجھ سے اس
کا حال دیکھا نہ گیا۔ رحم رحم کہتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ میرا ساتھی بھی مجھ
سے رخصت ہو کر گھر گیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد حسبِ دستور ہم دونوں سیر سے واپس آ
رہے تھے شام کا وقت تھا شفق پھولی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل نیلگوں
سمندر میں سونے کے پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ یک بیک میرا ساتھی ایک

مکان کے سامنے جا رُکا۔ جرأت سے اندر جانا تھا۔ کچھ دیر کھڑا رہا۔ گویا کسی کو پہچانتا ہے۔ میں نے جب نظر اُٹھائی تو ایک لنجے کو دیکھا، جو وسطِ صحن میں ڈر ڈر کر تھم تھم رہا تھا۔ میرے ساتھی نے نام لے کر پکارا۔ وہ نہ بولا۔ قریب جا کر اشارہ کیا۔ اس نے نہ دیکھا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص نہ صرف لنجا ہے بلکہ بہرا اور نابینا بھی ہے۔ آخر میرا ساتھی پکارا۔ آہ چلتے پھرتے پتھر! دنیا میں تیرا عمل اسی سزا کے قابل تھا۔ میں نے پوچھا۔ کیا کہا؟ اس نے جواب دیا، آج تو دیر ہو رہی ہے کل بتاؤں گا۔ دوسرے روز میں وظائف ضروری سے فارغ ہو کر اپنے دوست کے مکان پر پہنچا۔ اس مصیبت زدہ بہرے نابینا کو ماجرا بیان کرنے کو کہا۔ وہ بولا:۔

بیوی بچوں سے بدسلوکی کرنیوالے شخص کی کہانی

یہ شخص خاکی دنیا میں میرا ہمسایہ تھا۔ حسن کی مملکت کا بادشاہ اور دولت دنیا کا خزانہ دار تھا۔ حسن اور دولت دونوں دلکش چیزیں ہیں۔ جدھر نظر بھر کر دیکھتا تھا لوگ جگر تھام کے رہ جاتے تھے۔ اکثر عورتوں کے خیال میں تو حسین اور دولتمند شخص عمدہ ترین خاوند ہوتا ہے۔ والدین بھی عموماً داماد میں یہی دونوں چیزیں تلاش کرتے ہیں۔ اس کی شادی متوسط گھرانے کی ایک حسین لڑکی کے ساتھ ہوئی جو علم و حلم میں یکتا تھی۔

بیاہ کی ابتدائی گرمجوشیاں تھوڑا عرصہ گزرنے پر ختم ہو گئیں اور خاوند کی محبت بیوی کی آتش عشق کے مقابلہ میں کھوٹا سونا ثابت ہوئی۔

خاوند کی اُلفت جُوں جُوں کم ہو رہی تھی، عورت کی محبت ترقی کر رہی تھی معصوم بیوی سایہ کی طرح جوں جوں خاوند اس سے دُور بھاگتا ہے، اس کے پیچھے دوڑتی ہے۔ یہ کھچا کھچا رہنے لگا، وہ قربان ہو ہو جانے لگی۔ اس عرصہ میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے، باغِ محبت کے ان پھُولوں کو دیکھ کر بھی وہ خوش نہ ہوتا تھا۔ اس نے دلبستگی کا سامان گھر سے باہر بنالیا تھا۔ آوارہ مزاج مشیر اوباش مصاحب کب کسی کو گھر گھاٹ کا چھوڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پری جمال بیوی گھر میں آہیں بھرنے کو رہ گئی اور یہ حضرت رذیل طبقہ کے حسن کا دیوانہ بنے۔ جب کبھی گھر تشریف لاتے تو بچوں کو گھُورتے اور بیوی کو بے وجہ مارتے۔ وہ غریب خُون کے آنسو روتی مگر زبان سے اُف تک نہ کرتی۔ بچے سہم کر کونوں میں دبک جاتے تھے۔

جب دولت اور حُسن دونوں لُٹ چکے تو یکایک اس کی طبیعت نے پلٹا کھایا۔ حسن فروشوں کے بالاخانوں سے ہٹ کر فقیروں کی دہلیز پکڑی۔ رات دن نماز و وظائف میں کٹنے لگی۔ مگر بیوی بچوں کی قسمت نہ بدلی۔ پہلے تو کبھی گھر میں آجاتا تھا، اب مہینوں گزرنے لگے۔ بچے بھُوک کے مارے روتے تھے۔ اس کو رحم نہ آتا تھا۔ اس عفیفہ نے محنت اور مشقت سے بچوں کو پالنا شروع کیا۔ یہ پیرِ طریقت کے قدم چُوم کر درگاہ کے ٹکڑوں سے پیٹ بھر لیتا تھا۔

جان برادر میں تو اُسے اسی لنگ ڈھنگ میں چھوڑ کر مرا تھا۔ ضرور ہے کہ بیوی بچوں سے اس کا سلوک تادمِ زیست ایسا رہا ہو، ورنہ یہ نوبت

نہ آتی۔ تم جانتے ہو یہاں تو سلوک اور معاملہ کی پرسش ہوتی ہے جس کا سلوک اور معاملہ بیوی بچوں سے اچھا نہ ہو اس کی نمازیں عبادتیں کس کام کی ہیں۔ بیشک یہ اندھا تھا کہ بیوی کی بدحالی اسے نظر نہ آتی تھی۔ بہرا تھا کہ بھوکے بچوں کی فریاد نہ سنتا تھا۔ ہاتھ ٹوٹنے کے سزاوار تھے کہ بے گناہ بال بچوں کو پیٹتا تھا۔ بے شک دنیا میں یہ سنگ دِل تھا اور یہاں بھی چلتا پھرتا پتھر بنا دیا گیا۔

میں نے جب اس کا وہ حال دیکھ کر اس کی یہ روئداد سنی۔ تو پاداشِ عمل سے غافل دنیا دار کی لاپرواہی پر غم کے آنسو بہانے لگا۔ اے کاش خاکی دنیا میں جا کر کوئی یہاں کا حال دکھلائے کہ وہ پل بھر کی خوشیاں جو بنی نوع انسان کو تکلیف دے کر حاصل ہوتی ہیں ان کے بدلے اس عالم میں مدتوں کی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ آہ مگر سعی لاحاصل سے کیا فائدہ؛ ہزاروں پیغمبر اور لاکھوں صلحا خاکی دنیا میں آئے اور سر ٹپکتے رہ گئے۔ پاداشِ عمل سے کیا کچھ نہ ڈرایا۔ لیکن دنیا داروں نے ان کی نصیحتیں ایک کان سنیں دوسرے کان نکال دیں۔ بہت سے پیغمبر دنیا کی اصلاح کے لئے آئے۔ اکثر نے ان کو قبول بھی کیا، انہوں نے عمل نہ کیا جنہوں نے عمل کیا، انہوں نے مفہوم کو نہ سمجھا۔ عبادت کو ذریعہ نجات قرار دیا اور حسنِ معاملہ کو پس پشت ڈالا۔ اگر مجھے دنیا میں دوبارہ جانے کا موقع مل جائے تو اوّل میری صداقت کا یقین کون کرے گا۔ پھر اگر یقین ہو بھی جائے تو عمدہ سلوک اور خوش معاملگی کی سعی کے کامیاب ہونے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔

میں وہاں سے اُٹھا۔ گھر آیا۔ اور سجدے میں گر گیا۔ اور نہایت بیقراری سے پُکارا۔ اے خُدا تو اپنی مخلوق کی خود رہنمائی فرما، تاکہ دُنیا انسان کی حُسنِ سعی، حُسنِ سلوک اور حُسنِ معاملہ کی وجہ سے بہشت بن جائے۔ سب ایک دوسرے کی بھلائی کریں اور بُرائی نہ سوچیں تاکہ اس جگہ کی پابندیاں نظر بندیاں المناک امراض اور پریشانیاں اُٹھانی نہ پڑیں۔ رحم، رحم! اے خدا خاکی دُنیا پر رحم!

میری مسلسل عبادت نے جو مخلوقِ خدا کے امن کے لئے کی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اطمینانِ قلب پیدا کیا۔ اب تو یہ عالم ہوگیا کہ علاوہ اوقاتِ معیّنہ کے اُٹھتے بیٹھتے بنی نوع انسان کی بھلائی کی دُعا میرا وظیفہ ہوگیا۔ ہر وقت ایک خوشگوار خیالی نقشہ پیشِ نظر رہنے لگا۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ خاکی دُنیا میں ہُوں، ہمسایہ بیمار ہے اور میں تیمارداری میں مصروف ہوں، کبھی بیمار کے تلوے سہلاتا ہوں، کبھی پاؤں دابنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ محلّہ کی ایک عفیفہ مجھے کام کے لئے کہتی ہے تو میں بھاگ کے بازار جاتا ہوں، اس کے حسبِ خواہش سودا سلف لاتا ہوں۔ محلّے میں ایک دیانت دار اور متأہل زندگی بسر کرنے والے مزدور کو دیکھتا ہوں کہ باوجود محنت کے تنگ حال ہے۔ چُپکے سے مدد کرنا چاہتا ہوں، اس کی غیرت امداد کی ذلّت گوارا نہیں کرتی۔ وہ انکار کر دیتا ہے، مَیں مایوس ہو جاتا ہوں، پھر میں زراعانت چپکے سے مناسب وقت پر اس کی ڈیوڑھی میں رکھ جاتا ہوں تاکہ وہ اُٹھا لے اور اپنے کام میں لائے۔

میرا تصوّر :-

غرض اس قسم کی خیالی امداد میں مصروف رہنے سے مجھے ایک سرُور سا ملتا تھا۔ کبھی عالمِ خیال میں ایک غمگین شخص کو جاتے دیکھتا تھا خفیہ طور پر اس کے غم کا سبب دریافت کرتا تھا اور اُسے اطلاع کیئے بغیر اس سبب کو دُور کر دیتا تھا۔ کبھی مجھے دو میاں بیوی ملتے تھے۔ جن میں چند غلط فہمیوں کی بنا پر نا چاقی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی غلط فہمیوں کو اس حکمت سے دُور کرتا تھا کہ میری سعی نیک کا ان کو گمان بھی نہ گزرتا تھا اور وہ شیر و شکر ہو جاتے تھے کبھی میں خیال کرتا تھا کہ میں متاہل زندگی بسر کر رہا ہوں، گاؤں میں والدین کی ناگہانی موت سے دو بچے یتیم رہ گئے ہیں اور وہ رو رہے ہیں، میں انہیں محبت سے اُٹھا کر گھر لاتا ہوں اور اپنے بچوں کی طرح ان کی پرورش میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ کبھی ایک غریب بوڑھے لکڑہارے کا تصوّر سامنے آتا ہے کہ وہ لکڑیوں کے گٹھے کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے، میں فوراً گٹھے کو اپنے سر پر اُٹھا لیتا ہوں اور اس کے گھر پہنچا آتا ہوں۔ کبھی ایک ایسی بستی بساتا ہوں جس میں سب کی املاک اور حقوق برابر ہیں۔ جہاں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں ہر شخص چھ گھنٹے محنت کر کے مشترکہ سرمایہ میں اضافہ کرتا ہے جس میں سے ہر بچے کی تعلیم اور بڑھاپے کی پنشن کا انتظام ہوتا ہے، بیشک نیک عمل کا تصوّر بجائے خود خوشیوں کا چشمہ ہے قلبِ مطمئن دُنیا کی بڑی دولت ہے۔ یہ ان ہی لوگوں کو دی جاتی ہے جن کا اہلِ دنیا کے ساتھ معاملہ اور سلوک عمدہ ہے میری نشاط جُو طبیعت نے دُنیا میں گناہ آلود خوشیوں کے حصول کیلئے کیا کچھ نہ کیا۔ مگر نیکی کے تصوّر میں

جو مزا پایا وہ عیش و عشرت میں کہاں۔ عفو کی لذت انتقام کی تلخی سے بہتر ہے مگر بدقسمت انسان عفو کی نسبت انتقام پر زیادہ آمادہ اور مستعد نظر آتا ہے۔

غرض نیکی کے تصورات نے مجھے مایوسی کی گہرائیوں سے نکال کر مسرت کے بامِ بلند پر لا کر چھوڑ دیا تھا۔ میں لمبے لمبے دن اور بڑی بڑی راتیں چاہتا تھا مگر لیل و نہار حسن اور جوانی کی طرح اڑے جاتے تھے۔ آئینِ عالم ایسا ہے کہ عمر چاہو تو موت ملتی ہے۔ موت کو بلاؤ تو دُور بھاگتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ پابندی کی مدت بڑھ جائے لیکن معلوم ہوا کہ ہزار برس یونہی گزر گئے۔

الوداع :-

ایک دن صبح کسی دُور کے گرجے سے گھنٹوں کی طرح دلکش و دلفریب آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بیسیوں بار اس جگہ یہ آوازیں سُنی تھیں۔ مگر باوجود استفسار کے کسی نے نہ بتایا کہ یہ کیا اور کیوں ہے۔ آج سیاہ پوش فرشتہ جس کا طرزِ عمل تبدیج ہمدردانہ اور دوستانہ ہو رہا تھا۔ آیا اور کہا کہ آج کچھ لوگ اس عالمِ مکافات سے دارالامان کو جائیں گے۔ آپ بھی الوداع کہنے جائیں ہار اور گجرے ابھی بنائیں اور جاکران کی کامرانی پر مبارکباد کہیں اور پھول پہنائیں۔ نیا نظارہ اور نئی مشغولیت کتنی دلفریب ہوتی ہے۔ میں باغ باغ ہو گیا۔ پھول اور کلیاں چُنیں، ہار پروئے، عمدہ لباس پہنا، اور ہلکی سی خوشبو لگائی۔ پہلے بدخشانی دوست کی طرف بدیں خیال گیا کہ شاید اس کو بھی اس تقریب میں شمولیت کی اجازت ہو گئی ہو۔ مگر معلوم ہوا کہ ابھی

وہ اِس اعتبار کے قابل نہیں سمجھا گیا کہ مجمع اور ہجوم میں جائے ۔ چنانچہ تن تنہا آواز کی سمت گیا ۔ اس بستی کی فصیل کا پھاٹک کھلا تھا ۔

محافظ فرشتہ میرے پہنچنے پر الگ ہوگیا ۔ ایک ٹرام گاڑی کی طرف اشارہ کیا جس میں اور لوگوں کے ساتھ جو اسی تقریب پر جارہے تھے بیٹھ گیا ۔ میرے گاڑی میں داخل ہوتے ہی مجھ سے پہلے بیٹھی ہوئی سواریوں نے خوش آمدید کہا اور عزت کے ساتھ پاس بٹھایا ۔ محبت کی باتوں سے دِل بہلانے لگے میں بھی ہر ایک کو عزت سے مخاطب کرتا اور باتوں کا جواب دیتا تھا ۔ گو ہم ایک دُوسرے سے ناواقف تھے ۔ مگر سب ایک کُنبہ اور پُرانے دِلی دوست معلوم ہوتے تھے ۔ اگرچہ سواریاں بہت زیادہ تھیں مگر دل تنگ نہ تھا ۔ جو آتا باوجود جگہ کی کمی کے سب کو خندہ پیشانی پاتا خود بیٹھنے کی کوشش نہ کرتا لیکن ہر ایک اس کو بٹھانے کے لئے بے تاب نظر آتا تھا ۔

غرض گاڑی چلی اور ہم ایک وسیع میدان میں پہنچے ۔ لوگوں کا ہجوم تھا ۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا ۔ مگر کیا مجال کہ ہجوم میں افراتفری پیدا ہو ۔ ذرا سی غفلت سے کسی کو خفیف سا کندھا بھی لگا تو دونوں طرف سے معافی مانگی گئی ۔ ہر ایک اسی سعی میں رہتا تھا کہ دوسرا آرام گزر جائے ۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر دُنیا میں اتنا میلہ ہوتا تو خدا جانے کتنوں کا خون ہوتا مگر یہاں کسی کی نکسیر نہیں پھوٹی ۔ عورتیں جب بھیڑ میں سے گزرتی تھیں ، مرد راستہ چھوڑ کر دو رویہ کھڑے ہو جاتے اور جب تک بیبیاں نہ گزر جاتیں ، وہ نہ چلتے تھے اللہ اللہ شرافت کا کیا دِل خوش منظر تھا کہ ہر ایک کی آنکھیں محبت بار تھیں

ہر ایک کا طرزِ عمل مستحسن تھا۔

میں دل میں اس سفر اور اس روز کے سفر سے مقابلہ کر رہا تھا جب کہ ہم اس دُنیا میں لائے گئے تھے اور چند منٹ آرام سے نہ کاٹ سکتے تھے اور آپس میں لڑنے کی وجہ سے زنجیروں میں جکڑے گئے تھے۔ انسان کو غلط تربیت اور بُری صحبت برباد کر دیتی ہے۔ ورنہ وہ نیکی کا فرشتہ ہے ہر آدمی نے فطرت سعید پائی ہے مگر تعلیم کا نقص اس کو بدتر از حیوان بنا دیتا ہے۔ وہ جو دُنیا میں پلید مشہور تھے، مناسب نگرانی سے کیسے سعید ہو گئے ہیں کہ دوسروں کو ملال دینا اور اپنی خاطر پر غبار لانا ان کے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ میں انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ یک دم شور ہوا۔ سب کی نظریں مشرق کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں نے بھی دُور سے ایک گاڑی آتی دیکھی جو اس میدان کے قریب آکر آہستہ ہو گئی۔ مردوں نے عورتوں کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ جنہوں نے آگے بڑھ کر گاڑی سے اُترنے والی سواریوں کو ہار پہنائے۔ سب نے مل کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ مرد دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ نو وارد ہار پہنے درمیان میں سے گزرے ان کے چہروں سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ اور مُسکراہٹ لبوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ سب کو سلام کہتے تھے اور جواب پاتے جاتے تھے۔

پھر ہم سب گروہ در گروہ سایہ دار درختوں کے نیچے بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے، وہ بھی تماشائیوں کے گروہ میں آ بیٹھے ہم میں سے اکثر نے اُن سے آپ بیتی سنانے کی فرمائش کی اور اصرار کے بعد آمادہ کر لیا۔ وہ صاحب جو میرے قریب آ بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے اپنا ماجرا یوں بیان کیا۔

خوشامد پسند کوتوال کی کہانی

صاحبو! خدا تم پر رحم کرے۔ میں خاکی دُنیا میں کوتوال کے عہدہ پر فائز تھا۔ ریا اور خوف اگر گناہ سے باز رکھیں تو نیکی کا جزو ہوتے ہیں۔ مَیں قاضی کے خوف اور لوگوں میں شہرت قائم کرنے کے خیال سے رشوت کے پاس نہ جاتا تھا۔ ہمیشہ نماز وقت پر پڑھتا تھا اور بلا ناغہ تلاوتِ قرآن کرتا تھا۔ انصاف سے محبت جو کوتوال اور قاضی میں امتیازی خصوصیت ہونی چاہیے۔ مجھ میں نہ تھی۔ گو میں رشوت تو نہ لیتا تھا۔ مگر وہی کام خوشامد سے کر دیتا تھا۔ جس نے جھک کر سلام کیا اور میری انصاف پسندی کی تعریف کی اسی نے مجھے ناانصافی پر آمادہ کر لیا۔ جو ذرا اکڑا یا مؤدبانہ سلام نہ کیا اس سے میں بگڑا۔ دِل میں گرہ رکھی۔ موقع تلاش کر کے اس طرح اس کے کس بل نکالے کہ کسی کو ظلم کا سان و گمان نہ ہوتا تھا۔ خلق خدا خوش، قاضی راضی رہا حتےٰ کہ مَیں اسی حال میں مَرا۔ خود مجھ کو اپنی ناانصافیوں کو پورا علم نہ تھا۔ جب اس جہاں میں آیا تو عافیت نہ پائی۔ بڑا اچھلا یا۔ اعمالنامہ اُٹھایا تو اس پر یہ لکھا پایا۔ رشوت لے کر بے ایمانی کرنا اور خوشامد سے خوش ہو کر بے انصافی کرنا دونوں یکساں قابلِ مواخذہ ہیں۔ بے گناہوں کو ذاتی انتقام لینے کے لئے پھنسانا یا گناہگاروں کو اپنی خواہش سے رہائی دلانا لائق سرزنش ہیں۔ بے شک قاضی اور خلق تم سے خوش رہے۔ مگر ہوشیار آدمی کو انسانی قانون کے پنجہ سے

بچ نکلنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ جہاں انسانی قانون اور رائے عامہ کی سرحد ختم ہوتی ہے، وہاں سے اخلاق کے قانون کی حکومت شروع ہوتی ہے۔ مذہب یا اخلاق کا قانون خفی اور جلی دونوں حرکات کا مواخذہ کرتا ہے۔ بیشک قانونِ دُنیا کے پنجہ اور خلق کی نظر سے تم بچ نکلے لیکن مذہب کے قانون کے رو سے تم قابلِ مواخذہ ہو۔ اب اپنے کئے کی سزا بھگتو۔

پورے دو ہزار برس میں مبتلائے مصیبت رہا۔ یہاں کی سزائیں کم و بیش سب کو معلوم ہیں۔ اب اس قابل سمجھا گیا ہوں کہ اگر میں جنت میں چلا جاؤں تو علانیہ بُری حرکت کجا مردم آزاری کی کوشش بھی نہ کروں گا۔ صاحبو! دُنیا کی حکومتوں میں لاکھوں عمال ہیں جو میری طرح اعلیٰ افسروں کے خوف سے علانیہ رشوت تو نہیں لیتے تاہم خفیہ طور پر ناجائز رعایت اور بے جا ظلم سے باز نہیں آتے۔ وہ دُنیا میں تو کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں مگر اس جہان میں مصیبت اُٹھاتے ہیں۔ اس نے اپنی کہانی نہایت مختصر بیان کی پھر لوگ اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگ گئے۔ میں وہاں سے اُٹھ کر دُوسری جگہ جا بیٹھا۔ قصے کہانیوں کا شوق انسانی فطرت ہے۔ یہاں بھی ایک صاحب کو مصروف بیانِ ماجرائے حیات پایا:۔

ایک حاسد کی کہانی

میں خاکی دُنیا میں بڑا حاسد تھا۔ مگر حسد کو ریا سے چھپاتا تھا۔ میرے

دل کا حال کوئی نہ جانتا تھا۔ ریاکاری ایک فنِ لطیف ہے۔ عقلمند کے دل میں چوری کی نیت کے ساتھ فریب شامل ہو جائے تو انسان ریاکار ہو جاتا ہے۔ میری ساری عقل اور ہمت حاسدانہ خواہشات کی تکمیل میں گزری ہے۔

بی۔اے میں پڑھتا تھا۔ ایک ہم جماعت ہونہار طالب علم کی پرنسپل نے تعریف کی۔ میں جل گیا۔ اور اس بچارے کو نقصان پہنچانے کے لئے موقع تلاش کرنے لگا۔ اس کو آوارہ مزاج بنانے کی انتہائی کوشش میں مصروف رہا۔ عشق کی چاٹ لگائی اور لہو و لعب کا شوق دلایا۔ وہ دامِ تزویر میں پھنس گیا۔ پہلے تو میلے تماشے پر مل کر جاتے تھے، پھر وہ راگ رنگ ناچ گانے پر خود ہی جانے لگا۔ جب وہ غیر حاضر ہوتا تو میں پڑھ لیتا۔ جب وہ آتا تو میں اس کو باتوں میں لگائے رکھتا۔

اگرچہ میں ہمیشہ امتحان میں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوتا تھا لیکن اب اس کو آوارہ کرنے کی سعی میں مصروف رہا تھا۔ اس لئے پوری محنت نہ ہو سکی تاہم میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ اور وہ ناکام رہا۔ میری طبیعت کو ایک خاص قسم کا اطمینان محسوس ہوا۔ بعد ازاں میں محکمہ مال میں اُمیدوار تحصیلدار ہو گیا۔ میرے ساتھ ایک اور اُمیدوار کام کر رہا تھا۔ غریب کا لڑکا بی۔اے میں اوّل آیا تھا۔ پیمائش کے کام میں محنت اور جمع بندی میں احتیاط کرتا تھا۔ افسر مال اس سے بہت خوش تھا۔ میں نے دل میں سوچا، اچھا حرام زادے تجھے بھی نہ لیا۔ تو کہنا۔ پہلے اس کا بڑا یار بنا۔ اور پیار بڑھایا پھر دُخترِ رز کا شوق دلایا۔ وہ میرے اصرار پر گاہے گاہے تھوڑی

پینے لگا۔ یہ کم بخت مُنہ لگی کب چھوٹتی ہے ، برسات آئی تو ہم جھوم گئے
دونوں خم لنڈھانے لگے۔ وہ ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اور
میں نے دولت کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ سب خرچ کا بوجھ مجھ پر پڑتا رہا۔
میں نے آہستہ آہستہ خرچ سے ہاتھ کھینچا۔ اس نے بتدریج پینا کم کیا۔
اور پھر محنت کرنے لگا، مجھے یہ شاق گزرا، میں نے پھر روپیہ گھر سے
منگایا، پھر اسے یہی چاٹ لگائی۔ نتیجہ دونوں کے حق میں بُرا نکلا۔ میں
بہت معتوب ہوا۔ وہ بہت کچھ بدنام، مجھے تو نوٹس آگیا کہ اگر چھ ماہ
کے اندر اندر اپنی اصلاح نہ کی تو اُمیدواری سے نام خارج سمجھئے میں نے
ناچار شراب چھوڑ دی۔ اُس نے بھی بدستور محنت شروع کی۔ خدا خدا کر کے
دونوں کو تحصیلداری کا عہدہ مل گیا۔ اور اتفاق سے ایک ہی ضلع میں تعیناتی ہوگئی۔

وہ خداداد قابلیت سے شہرت حاصل کرنے لگا۔ اس پر میرا مزاج بگڑا۔
اور میں رات دن اس کے نقائص تلاش کرنے کی فکر میں رہنے لگا لیکن
وہ کام میں بڑا ہوشیار تھا۔ نقص کی گنجائش نہ پاکر میں نے رشوت ستانی
کی شکایتیں لکھ کر گمنام چٹھیاں اعلےٰ افسروں کے نام ڈالنی شروع کیں۔
پہلے تو کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک دن کسی سرکاری کام کے لئے میں اور وہ اکٹھے
ہوئے۔ وہ بڑی محبت سے ملا۔ اپنا قصّہ بیان کرنے لگا کہ باوجود محنت
کے افسرانِ بالا ناراض ہیں۔ میں نے اسے لمبی رُخصت لے لینے کا مشورہ
دیا۔ اور اندریں اثنا تبادلہ کی کوشش کی صلاح دی۔ اس نے یہ بات
قبول کی اور چھٹی کی درخواست دے دی۔ میں نے جھٹ ایک گمنام

چٹھی کلکٹر کو لکھ دی کہ یہ بددیانت افسر رخصت لے کر حضور سے پیچھا چھڑانا اور
حضور کی ماتحتی سے نکل جانا چاہتا ہے۔ تاکہ دُوسری جگہ رشوت کا بازار گرم کرے
میری چٹھی کے بعد اس کی عرضی پہنچی۔ اعلےٰ افسر کو اس کی بددیانتی کا یقین ہوا۔
رشوت کا ثبوت ڈھونڈنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دیانت دار آدمی ہے تاہم
میں نے لکھا کہ اس کے خلاف بددیانتی کا ثبوت نہیں مل سکتا۔ اس بچارے
نے مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ میں نے اس سے پُورا پورا ناجائز فائدہ اُٹھایا میری
ہیرا پھیری سے حکام کے مزاج میں شبہ کی بجائے یقین ہو گیا کہ یہ شخص بددیانت
ضرور ہے، مگر ہوشیار ہے۔ اس لئے بجائے رشوت ستانی کا مقدمہ چلانے
کے اسے حکم دے دیا گیا کہ وہ استعفےٰ داخل کرے۔ وہ روتا ہوا میرے پاس
آیا۔ میں نے بھی جھٹ مغموم سا چہرہ بنا کر کہا اب شکر و صبر کے سوا کیا چارہ ہے
افسرادب رایک جیسے ہوتے ہیں، ان کو اپیلوں سے چڑانا ٹھیک نہیں
مبادا کوئی جھوٹا مقدمہ چلا دے۔ ملازمت تو گئی تھی۔ عزت بھی خاک میں ملے
وہ آہیں بھرتا ہوا یہ کہہ کر اُٹھا کہ اچھا میری تقدیر اس کی مصیبت پر مجھے خاص
مسرت اور طمانیتِ قلب محسوس ہوئی۔

ادھر میری کیفیت سنئے کہ میں تو مدت سے اس کی تباہی کی اُدھیڑ بُن میں
لگا تھا۔ سرکاری کام میں برابر غفلت برتی، اُمیدواری کے زمانے میں محنت
سے کام نہ سیکھا نہ ملازمت کے دَوران میں سمجھنے کی کوشش کی۔ میرا سارا
کام ماتحتوں کے مشوروں سے ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کو لُوٹتے تھے۔ مجھے مجبوراً چشم
پوشی کرنی پڑتی تھی۔ نالائق افسر ہوشیار ماتحتوں سے دبا ہی کرتا ہے اکھوڑ

ہی عرصہ کے اندر میں بھی ملازمت میں سے بدنام ہو کر نکلا۔ استعفیٰ دے کر گاؤں میں آیا، شریکوں نے انگلیاں اُٹھائیں اور نالائقی کے طعنے دیئے۔ مجھے بڑا صدمہ ہؤا۔ ایک رات نصف شب میری آنکھ کُھل گئی، موسم معتدل تھا۔ مہتاب کی دلفریب روشنی باعثِ تسکین ہو رہی تھی۔ ستارے گو روشن تھے مگر چاندنی میں ماند پڑے تھے۔ کئی دن کے بعد دِل خوش ہو گیا۔ مگر جب ملازمت سے اپنی برطرفی کا خیال آیا۔ تو دِل پر غم کے بادل چھا گئے، حکومت کو چھوڑ کر کون مایوس نہیں ہو جاتا اور کس کے دل کو غم نہیں کھاتا۔ میں بہت دیر آہیں بھرتا رہا۔ آج یہ خوش قسمت رات تھی جب کہ اپنے حال سے میں نے دوسروں کا اندازہ لگایا۔ اور وہ مظلوم تحصیلدار اور ہونہار طالب علم یاد آیا۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے کتنی ندامت ہوئی۔ ضمیر پکارا اے سنگدل تُو تو اپنی نالائقی سے برطرف ہؤا۔ وہ غریب عیال دار تحصیلدار تیرے ہاتھوں سے مارا گیا اور تیرا کس پتھر کا سینہ ہے، کہ لوگوں کو مصیبت میں پھنساتا ہے اور ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھتا ہے۔ لوگ انتقام میں حد سے تجاوز کر کے ظالم کہلاتے ہیں۔ اے بدبخت حاسد تو بغیر وجہ کے درپے آزار ہو جاتا ہے اور خود بھی آرام نہیں پاتا۔

ضمیر کی آواز:-

جوں جوں اپنے حاسدانہ افعال پر نظر ڈالتا تھا۔ مجھے اتنی اذیت ہوتی تھی گویا ننگے بدن کانٹوں کے جنگل میں سے گھسیٹا جا رہا ہوں۔ بقیہ رات انگاروں پر لوٹ کر کاٹی۔ صبح مؤذن نے اذان دی۔ شوالے کے گھنٹے بجے۔ سعید روحیں جاگیں۔ جن کی رُوح پر شیطان نے قبضہ کر لیا ہے، وہ اسی طرح مست

خواب پڑے رہے۔ صبح اطمینان کا پیغام لے کر آئی۔ میرے غیر مطمئن دل نے یک بیک پلٹا کھایا۔ میرے خیال کی دُنیا نئی ہو گئی۔ وہ دِل جو حاسدانہ خیالات کا خرابات بنا ہُوا تھا۔ اس میں نیکی کی دیوی براجمان ہوئی اور وہ صومعہ سے زیادہ پاک ہو گیا۔ میں یہ کہہ کر اُٹھا کہ میں مرنے سے پہلے تلافیٔ مافات کروں گا۔ مسجد میں گیا۔ نماز پڑھی۔ لوگ چلے گئے تو ایک کونے میں جا کر سجدہ کیا اور پکارا۔ اے خدا آج سے میں ایک نئی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتا ہوں۔ مجھے زندہ رکھ اور اعمالِ سیاہ کی تلافی کا موقع دے۔ میرے ضمیر سے ہلکی سی آواز اُٹھ رہی تھی کہ تُو نے زندگی میں آج ہی پہلی دفعہ نماز پڑھی ہے اور پہلی ہی دفعہ دُعا مانگی ہے۔ صرف ایسی ہی دُعائیں منظور ہوتی ہیں۔ اور یہی نمازیں قبول کی جاتی ہیں۔ وہ تیری پہلی عبادتیں جو فاسد خیالات میں پرورش پاتی رہی ہیں، درخورِ اعتنا نہ تھیں۔ جو شخص عبادت اور عمل میں مطابقت پیدا نہیں کرتا۔ وہ زندگی بیکار ضائع کرتا ہے۔

غرض میں خاک پر سر رکھ کر ندامت کے آنسو رویا، عزمِ راسخ لے کر اُٹھا۔ کائناتِ ارضی پر نظر ڈالی تو ایسا معلوم ہُوا کہ اُس کا ذرّہ ذرّہ میرے ارادوں پر تہنیت کے پیغام دے رہا ہے۔ میں شب گزشتہ تک تو مایوسیوں میں گھرا ہُوا تھا آج اطمینان کا سمندر ہر طرف موجیں مار رہا تھا۔ میرے پاس کچھ بزرگوں کا اندوختہ نقد و زمین کی صُورت میں موجُود تھا۔ میری سب سے اوّل نظر اُسی پر پڑی اور خیال آیا کہ ممکن ہے کہ میں مالی پریشانیاں دُور کرنے کے قابل ہو جاؤں۔ میں مسجد سے خوش خوش گھر آیا۔ بیوی مجھے خوش دیکھ کر مسرور ہوئی۔ بچے جو میری

وحشت کو دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ اور میرے ساتھ کھیلنے کا حوصلہ نہ کرتے تھے مجھے خوش پاکر میری ٹانگوں سے چمٹ گئے۔

میں نے اپنی اہلیہ سے سب ماجرا کہہ سنایا، نیک عورت ہمیشہ عمل صالحہ میں ممد و معاون ہوتی ہے اس نے تلافی مافات کے عزم میں اور ہمت افزائی کی اور میں اگلے روز اپنے مظلوم ساتھی کی تلاش میں اس کے شہر پہنچا، جسے میری حیلہ سازیوں نے تحصیلداری سے برطرف کرایا تھا۔ اس کو بحالت زار پایا۔ اب وہ اُمراء کے بچوں کو پڑھا کر گزر اوقات کرتا تھا۔ کُنبہ کثیر آمدنی قلیل میں جو ہر کسی کی حالت ہوتی ہے، وہ اس کی ہو رہی تھی۔ وہ پُرانی سی ڈیوڑھی میں پھٹی پُرانی دری پر بیٹھا ایک رسالہ کے لئے مضمون لکھ رہا تھا۔ فلاکت زدہ گھرانے میں مہمان عزیز کے آنے سے جو کیفیت ہوتی ہے، وہی اس پر طاری ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگیا۔ گرمجوشی سے اُٹھا اور بغل گیر ہُوا۔ لیکن جلد چہرے پر افسردگی کی تاریکی چھا گئی۔ وہ فوراً گھر گیا، ایک پُرانا گاؤ تکیہ تحصیلداری کے وقت کا اور ایک دریدہ کمبل لا کر میرے نیچے بچھایا۔ کھانے کا وقت ہوا کچھ دال ترکاری تیار کرا کے لایا۔ "چہ کند بے نوا ہمی دارد" کہہ کر کھانا سامنے رکھ دیا۔ میں نے کھانے کی احتیاط سے تعریف کی کہ مبادا مبالغہ تعریض سمجھا جائے۔ وہ ذرا مطمئن ہُوا۔ میں نے اپنی برطرفی کی داستان کہی۔ حاسدانہ اطمینان کے بجائے اس کو ہمدردانہ رنج پہنچا۔

پھر میں نے ایک من گھڑت کہانی بنائی کہ میرا ایک مالدار عزیز مجھے تجارت کا پیشہ اختیار کرنے پر زور دیتا ہے۔ میں تن تنہا اس کام کو انجام نہیں دے

سکتا۔ اس نے مجھے ایک ہوشیار ملازم بشاہرہ دو سو روپے ماہوار رکھنے کا اختیار دیا ہے۔ مجھے چاروں طرف نظر دوڑانے پر بھی تم سے بہتر کوئی آدمی خیال میں نہ آیا۔ دو دوست جب مل کر محنت کریں تو خدا برکت دیتا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ ملازمت سے یہ پیشہ زیادہ اچھا ثابت ہو۔ وہ بولا تجارت قسمت کا کھیل ہے۔ اس کی کامیابی اور ناکامی میں غیر مرئی اسباب کا دخل ہوتا ہے۔ تاجر ایسا قمار باز ہے جس کی قسمت کا پانسہ قدرت کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ میں نے کہا کہ میرے اس سرمایہ دار عزیز کا تجارت کے متعلق بالکل یہی خیال ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ہر انسان رُوحانی اور مادی تاجر ہے اور ہر تاجر لازمی طور پر قمار باز ہے۔ جو قوم اور افراد دُنیا میں قمار بازی سے ڈرتے ہیں، وہ ناکام زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو ڈر کر ساحل سلامتی پر جا بیٹھتا ہے اس کا دامن موتیوں سے نہیں بھرا جا سکتا غوّاص کے بہت سے ناکام غوطے اسے بالآخر کامیاب کر دیتے ہیں۔ لیکن میرے مالدار عزیز کی تجویز کیسی حوصلہ افزا ہے کہ بیس ہزار روپیہ ہمارے دونوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ ایک سال تک دونوں کو دو سو روپیہ ماہوار اس کے علاوہ دیتا رہے گا۔ رقم ڈوبی تو اس کی۔ منافع ہوا تو آہستہ آہستہ رقم ادا کر دیں گے۔ ہم بیاج کی فکر سے آزاد ہیں۔ کیونکہ یہ قرض قرضِ حسنہ ہے۔ وہ ایسا قریبی عزیز ہے کہ میں اس کے پیشکش کو مسترد کرنا آئینِ قرابت کے خلاف سمجھتا ہوں، وہ اسے مروّت پر محمول کرے گا۔ اُمید کرتا ہوں کہ تم میری پیشکش رد نہ کرو گے۔ میری باتیں سُنکر وہ راضی ہو گیا۔

ہم نے مل کر کاروبار شروع کیا۔ مجھے میرے عزم نے محنتی بنا دیا تھا۔ وہ

پہلے ہی جوس اور دُور اندیش تھا۔ جب کسی کاروبار میں محنت جُزرسی اور دُور اندیشی شامل ہوں تو کامیابی آسان ہو جاتی ہے۔ ایک سال کے بعد دو سال کی تحصیلداری کی تنخواہ منافع میں آئی۔ جوں جوں ہمارے تجربہ میں اضافہ ہوتا گیا کاروبار چمکا۔ دس سال کے اندر ہمارے پاس ایک لاکھ کا سرمایہ ہو گیا اور ہمیں ایک اور ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

میں نے اُس ہم درس کی تلاش شروع کی جو میری فریب کاری سے بی۔ اے میں فیل ہو گیا تھا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کیے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ مجھے اس کا نام یاد تھا، مکان بھول چکا تھا۔ لیکن جوئندہ یابندہ۔ آخر میں نے کالج کے رجسٹروں کو دیکھ کر بڑی محنت سے اس کا پتہ تلاش کیا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے وطن پہنچا۔ پوچھتے پوچھتے اس کے گھر کا سُراغ نکالا۔ عیش میں پڑ کر نہ صرف اس نے تعلیم چھوڑ دی تھی بلکہ صحت و دولت دونوں کھو چکا تھا۔ سن چالیس سے کم تھا مگر سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ آنکھوں پر عینک لگائے عصا کے سہارے گھر سے نکلتا۔ میں نے اس کو پہچانا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ تھوڑی دُور جا کر بیٹھ گیا اور کھانسنے لگا۔ میں نے اسے نہیں بُلایا۔ ہمسایہ لوگوں سے کیفیت دریافت کی۔ معلوم ہوا آج کل بیکار ہے اور بیکار ہے۔ میں ہوٹل میں جا کر ٹھہرا۔ ہمارے کاروباری بنک کی یہاں شاخ تھی۔ اس کے منیجر سے ملا اور دو ہزار روپے کے نوٹ لئے اور جیب میں ڈال کر پھر دوست کے مکان پر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک سات برس کا بچہ باہر آیا۔ میں اس کے خط و خال کو دوست کے حلیہ سے ملتا جلتا دیکھ کر جان گیا

کہ یہ اس کا لڑکا ہے۔ وہ بہت لاغر تھا۔ اس کا رنگ کمی خوراک کی وجہ سے زرد تھا، لباس صاف تھا مگر نہایت کہنہ و دریدہ، لباس کی صفائی سے میں سمجھ گیا کہ باوجود عسرت کے اس کی والدہ سلیقہ شعار ہے۔ اس نے مجھے نہایت ادب سے سلام کیا۔ میں نے محبت سے پیار کیا، اور پوچھا کہ برخوردار تمہارے والد کہاں ہیں۔ وہ بولا صاحب آپ بیٹھئے۔ وہ ابھی ہسپتال دوا پینے گئے ہیں کچھ دیر کے بعد آجائیں گے۔ مجھے اس کی غیر حاضری کا حال سن کر اطمینان ہوا۔ ہینڈ بیگ میں سے کاغذ کا لفافہ نکالا اور اس مضمون کا خط لکھ کر دو ہزار روپے کے نوٹوں کے ساتھ ملفوف کر دیا۔

خط :۔

برادر مکرم : اُمید تو ہے کہ آپ میرے نام سے مجھے پہچان جائیں گے۔ میں تو ہمیشہ سے ہی لاپرواہ رہا ہوں مگر کبھی آپ نے بھی تو نوازش نامہ سے سرفراز نہیں فرمایا۔ آج میں سلام روستائی کے لئے آیا تھا۔ حاضری کی غرض یہ تھی کہ آپ سے درخواست کروں کہ آپ مجھے ایک ایسا آدمی تلاش کرنے میں مدد دیں جو آپ کی طرح تعلیم یافتہ اور با اعتبار ہو۔ میری بدقسمتی دیکھئے کہ اول تو دولت خانہ ڈھونڈھتے دیر لگی۔ پھر آپ نہ ملے۔ مجھے ضروری کام کے لئے واپس جانا ہے۔ محترمہ ملاقات جا رہا ہوں۔ یہ تو میری قسمت کہاں کہ آپ کو آمادہ پاؤں۔ تاہم اگر یہ نہ ہو سکے تو کسی ایسے ہوشیار شخص کو جس پر آپ قلبی طور پر اعتماد کر سکیں۔ کاروبار میں میری معاونت کے لئے تیار کر دیں۔ فی الحال میرا کاروبار کسی بڑے بوجھ کا متحمل نہیں۔ میں صرف تین سو

روپیہ ماہوار دے سکتا ہوں۔ دو ہزار کے نوٹ ملفوف موجود ہیں تاکہ اس شخص کے ابتدائی اخراجات کے کام آئیں اور تنخواہ میں سے آہستہ آہستہ کٹتے رہیں۔ اُمید ہے کہ میرے لئے یہ تکلیف ضرور گوارا فرمائیں گے اور مجھے مفصلہ ذیل پتہ پر یاد کریں گے"۔

تیسرے دن خط بھی آیا۔ اپنے متعلق میرے حسنِ ظن کا شکریہ ادا کیا۔ اور لکھا کہ آج تک تو نالائق ہی تھا۔ ایشور نے چاہا تو اپنے آپ کو آپ کے نیک گمان کے قابل بناؤں گا۔ ایک ماہ کے بعد وہ آیا۔ اگرچہ وہ اب کمزور تھا مگر صحت غیر متوقع طور سے بحال ہو چکی تھی۔ مالی بدحالی سے جو پریشانی اس کے چہرے پر تھی خوشگوار مستقبل کے خیال نے اس کو اطمینان میں بدل دیا تھا۔ غرض ہم تینوں نے بھائیوں کی طرح زندگی بسر کی۔ اور کام میں مزدوروں کی طرح لگے رہے۔ ہمارے نئے ساجھی نے وہ محنت کی اور اس سلیقہ سے کام کیا کہ ہم دونوں عش عش کر اٹھے۔ دوسرے سال ہم نے اسے برابر کا حصہ دار بنا لیا۔ اس نے کام کو زیادہ وسعت دی اور دس سال میں فرم کی شہرت کہیں کی کہیں جا پہنچی۔

کاروبار کا پچیسواں سال تھا۔ ہم دنیا میں کامیاب تاجر مشہور تھے۔ ایک دن ہم تینوں ایک میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے میں نے دونوں دوستوں کو مخاطب کر کے کہا۔ دوستو! آج مجھے آپ کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار کرنا ہے۔ ابھی یہ فقرہ ختم نہ کیا تھا کہ ساہنی مسکرا کر بولا۔ گناہ کا اقرار صرف خدا کے سامنے ہونا چاہئے۔ نادانستہ کو اپنے عیب و ثواب کا شاہد بنا:

کم ظرفی ہے، تم کم ظرف نہیں، اس لئے تم سے اِس قسم کی کسی بات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ میں بولا بہت اچھا، اقرار گناہ نہ سہی معذرت سہی۔ دوستو! میں اپنے کیئے کی معافی چاہتا ہوں۔ تحصیلدار نے آنکھوں آنکھوں میں کالج کے زمانے کی شراب نوشی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ اگر تیس برس پہلے آپ ایسی بات کرتے تو میں سمجھتا کہ کچھ بہک گئے ہیں۔ وہ ہمارو دوست بھی میری حیران کرنے والی باتوں پر ہنسنے لگا۔

میں بہت سٹپٹایا۔ آخر کہا کہ تم بات تو سُن لو۔ تحصیلدار نے کہا بشرطیکہ سننے کے قابل ہو۔ میں نے مختصر اپنے حاسدانہ مفاسد کا ماجرا کہا، انہوں نے دل لگی سمجھا۔ ہر چند میں نے اصرار سے بتایا مگر انہیں یقین نہ آیا۔ میں نے قسم اُٹھائی، اُنہوں نے کہا بس بس مذاق کو نہ بڑھاؤ۔ ہمیں اُلّو نہ بناؤ۔ تحصیلدار بولا۔ میں نے مانا کہ تم نے تحصیلداری گنوائی مگر اس بُرائی کا انجام بھلائی نکلا۔ بُرا نہ ہُوا۔ ہم درس دوست نے کہا، اگر بی، اے نہ ہُوا تو کیا ہُوا۔ اب کئی بی، اے فرم میں ملازم ہیں۔ بھائی تمہاری تو بُرائی کا انجام بھی بھلائی ہے نہ تمہیں اقرار گناہ کی حاجت نہ معذرت کی ضرورت، لو اب دیر ہو رہی ہے اجازت دو اور تم بھی آرام کرو۔ وہ اُٹھے اور اپنے اپنے گھروں کو ہنستے ہنستے رُخصت ہوئے لیکن میں ان کے انداز سے بھانپ گیا کہ انہیں میری باتوں کا یقین نہیں ہے۔

انسان نے دُنیا میں عمرِ جاوداں تو پائی نہیں۔ میرا وقت آ پہنچا۔ موت کے بعد میں یہاں آیا۔ حسد سے نہ صرف توبہ کی تھی بلکہ مقدور بھر تلافیٔ مافات کی

کوشش بھی کر چکا تھا۔ اس لئے ایک ماہ کے معمولی معائنہ کے بعد مجھے مقام محمود میں جانے کا حکم ملا ہے، گناہوں میں پڑ کر توبہ کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ بعض لوگ سلسلہ گناہ بھی جاری رکھتے ہیں تو بہ توبہ بھی پکارے جاتے ہیں حالانکہ بُرے عمل کے اثرات محض بنی نوع کی خدمت سے دُور ہو سکتے ہیں۔ بعض نادان توبہ توبہ کا وظیفہ کر کے تلافیٔ مافات کرنا چاہتے ہیں۔ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو سکتی ہے۔ عمل بد کا کفارہ لفظی عبادت سے نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ مبارک ہیں جو مردم آزاری سے توبہ کر لیں اور تلافیٔ مافات کریں، یا جن کو تکلیف دی ہو ان سے معافی چاہیں۔

دُنیا میں لاکھوں نوجوان ہیں جو بلا وجہ میری طرح بنا بر حسد در پئے آزار ہوتے ہیں۔ سب لیاقت اور محنت اپنی ترقی کے بجائے دوسروں کے تنزل کی کوششوں میں کھو دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی دُنیا اور آخرت دونوں خراب ہوتی ہیں۔ الحمدللہ کہ میں کمینہ حرکات سے باز آیا اور تلافیٔ مافات کی، آج مقام محمود کو جا رہا ہوں۔ میں یہاں سے اُٹھا، مقام محمود کو جانے والی چند بیبیاں جہاں بیٹھی تھیں وہاں چلا گیا۔ ایک بی بی آپ بیتی بیان کر چکی تھی، دُوسری نے اپنی سرگزشت شروع کی تھی کہ میں پہنچا۔ وہ بی بی اپنا دوپٹہ سنبھال کر ذرا سرک کر آگے ہو بیٹھی اور بولی :-

ایک کینہ ور عورت کی کہانی

صاحبو! قدرت نے مجھے حُسن کی دولت سے بہت کم حصّہ دیا تھا۔

مگر علم کی روشنی اتنی پائی تھی کہ اس کی تابانی سے عقلِ انسانی کی نگاہیں خیرہ تھیں۔ لیکن میرا علم جہالت سے بدتر تھا۔ کیونکہ وہ نفس کی برائیوں کا محاسبہ نہ کرتا تھا۔ میرے ہمسایہ میں ایک پارسا نوجوان رہتا تھا جس کی بیوی نے جنّت کی حوروں کا سا حُسن پایا تھا۔ میاں اُسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ وہ دونوں عاشق و معشوق کی طرح رہتے تھے۔ اُنہیں دم بھر کی جُدائی شاق تھی۔ میرے وسیع صحن میں آم کا پیڑ لگا تھا۔ برسات کے موسم میں عورتیں جھولا وہیں ڈالا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ساون کے مہینے میں محلّہ کی لڑکیوں نے جھولا ڈالا۔ سب عورتیں دیکھنے آئیں۔ بعض گوری عورتوں کے سر پر کالے دوپٹے مجھے بڑے پسند آئے۔ میں نے بھی اگلے دن سیاہ دوپٹہ اوڑھا۔

میری ہمسائی نہ صرف خوش رُو تھی بلکہ بذلہ سنج بھی تھی۔ جوں ہی اندر سے نکل کر میں آنگن میں آئی وہ بولی۔ بہن کپڑا اوڑھو۔ ننگی نکل آئی ہو۔ سیاہ دوپٹہ جسم کے ہم رنگ تھا۔ یہ پھبتی مجھ پر ٹھیک چسپاں ہوتی تھی۔ اس پھبتی پر سب لوٹ گئیں۔ میں بھی کھسیانی ہو کر ہنسنے لگی۔ اس نے تو بات بھلا دی۔ میرے دل میں ناسور پڑ گیا، عورتیں جھولا جھولنے میں مصروف ہو گئیں۔ میں مغموم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ سبز ڈالیوں میں سیندوری آم لٹک رہے تھے، خوش رنگ طوطے کبھی بیٹھے بیٹھے اُڑتے تھے، کبھی اُڑتے اُڑتے بیٹھتے تھے، سیاہ گھٹاؤں میں سفید بگلے اُڑ اُڑ کر عجب بہار پیدا کرتے تھے، میرے دل پر بغض کی کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کامیاب انتقام کا خوش آئند خیال گھٹا میں بجلی کی طرح چمک جاتا تھا۔ میں نے جی ہی جی میں کہا کہ تمہیں اس دل لگی کا خوب مزا چکھاؤں گی۔ تو

روئے گی۔ میں مُنہ پھرا مسکراؤں گی۔ میں جانتی تھی کہ بیوی کے حُسن کی ناقابل برداشت جلوہ ریزیوں سے خاوند کی طبیعت اکثر بدگمان ہو جاتی ہے اور تھوڑی سی کوشش سے یہ شک یقین میں بدل سکتا ہے۔

تریا چلتر:۔

چنانچہ جب وہ میکے گئی تو میں نے اُس کے خاوند کو اس کی غیر حاضری میں یوں سمجھایا کہ بھائی کچھ کہنے کی بات نہیں۔ سوچتی ہوں کہ کہوں یا نہ کہوں۔ کہتی ہوں تو تیرے اطمینان کی دُنیا درہم برہم ہو جائے گی، چُپ رہتی ہوں، تو ضمیر مجرم قرار دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ رُو متغیر ہو گیا اور اُس نے دیوار کا سہارا لیا۔ میں نے کہا آج تو تمہاری طبیعت پہلے ہی کچھ خراب معلوم ہوتی ہے ایسی بات بتا کر اور صدمہ کیوں پہنچاؤں۔ یہ کہہ کر میں گھر چلی آئی۔ وہ سر جھکا کر اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ میرے پُر اسرار انکار میں ہزار اسرار پوشیدہ تھے، گو میری زبان نے مطلب بیان نہ کیا مگر میری طرزِ ادا نے سینکڑوں خوفناک مطالب اس کے تصور میں پیدا کر دیئے جب بیوی واپس آئی تو خاوند کو مغموم پایا ہزار لطیفے بیان کئے لیکن زندگی بے لُطف رہنے لگی۔ اس نے روز افزوں آرائش و زیبائش سے خاوند کا دِل بہلانا چاہا اور محبت اور پیار سے دِل لُبھانے کی سعی کی مگر خاوند کے دل میں شکوک اور بڑھے مزاج بیش از پیش برہم ہوا۔

جب سب جتن کر ہاری تو ایک دن میرے پاس آئی۔ زانو پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس کو مصیبت میں دیکھ کر پہلی دفعہ خوشی محسوس ہوئی۔ میں نے ایسی بے اعتنائی اور رُکھائی دکھائی کہ اسے دُکھ سُکھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی ا

تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ میں برابر ادھر اُدھر کے کاموں میں لگی رہی۔ وہ گھر جہاں میاں بیوی کے ہر وقت قہقہے رہتے تھے۔ اب وہاں آواز سنائی نہ دیتی تھی پریشانی دونوں کے چہروں پر چھائی تھی۔ مایوسی نے ہر طرف اُن کو گھیر رکھا تھا میاں کو ہر راہ گیر بیوی کا آشنا معلوم ہوتا تھا۔ جو نوجوان معصومانہ کھانستا جھانکتا دروازے سے گزرتا اسے بدنظر اوباش نظر آتا تھا۔ بیوی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ خاوند کے دل میں کیا خیال گزر رہے ہیں۔ محبت کی بجائے دونوں کے دلوں میں وحشت بڑھ رہی تھی اور میں اُن کے چہروں کا مطالعہ کر کے خوش ہو رہی تھی۔ آتشِ عناد دلوں کو بھسم کرنے سے پہلے کب فرو ہوتی ہے۔ ادنیٰ سی بات نے جو ہلکی سی چنگاری لگائی تھی، اُس سے شعلے بھڑک اُٹھے۔ مگر میری ابھی تک تسلی نہ ہوئی تھی۔

میں میکے گئی۔ ایک مردانہ طلائی جوتا خریدا۔ ایک ململ کی پگڑی خریدی اُسے رنگریز سے گلابی رنگ کرایا۔ اور گھر آ کر موقعہ کی منتظر رہی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ میرا ہمسایہ بی بی کو تنہا چھوڑ کر خود کسی برات کے ہمراہ کہیں گیا۔ میں نے یہ موقعہ غنیمت جانا، اندھیری رات تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ دو تین بجے کا عمل ہوگا۔ میں نے پگڑی اور زریں جوتا نکالا۔ اُس کے تلووں کو زمین سے گھسا تاکہ معلوم ہو کہ پہنا جا چکا ہے۔ ایک ریشمی رومال کو خوشبو لگائی، کوٹھے پر چڑھ کر اُن کے آنگن میں اُس بی بی کی چارپائی کے قریب، تینوں اشیاء کو پھینک دیا۔ وہ چونک کر اُٹھی اور جوتے کو دیکھ کر گھبرا گئی، چور چور پکاری۔ گلی محلے کے لوگ جمع ہو گئے۔ خوشنما جوتا اور معطر رومال اور شوخ رنگ پگڑی دیکھ

کر لوگوں نے ایک دوسرے کو اشارے کئے کہ اچھا چور تھا۔ معطر رومال، زریں جُوتا اور رنگین پگڑی پہن کر چوری کرنے آیا تھا۔

ایک لفنگا پکارا کہ چلو صاحبو! چور نہیں تھا بہُو کا بھائی تھا۔ دُوسرا بولا۔ ہاں صاحب یہ روپے پیسے کا چور نہیں تھا حسن کا ڈاکو تھا، اپنا کام کر کے چلتا بنا۔ وہ بی بی بھانت بھانت کی بولیاں اور طعنے سُن کر زمین میں غرق ہوئی جاتی تھی۔ سارا دِن ندامت سے روتی رہی، شام کو میاں گھر آئے۔ لوگوں نے باہر ہی طنز یہ طور پر چور کے گھر آ گھُسنے کا قصہ کہہ سنایا، گھر پہنچ کر جُوتا رومال اور پگڑی دیکھی۔ دونوں ہاتھوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک یُونہی بیٹھا رہا۔ پھر نہایت حوصلہ اور اطمینان سے اُٹھا۔ بیوی کے پاس آ کر اس کے سارے کپڑے اُتار ڈالے اور اسے ننگا کر کے گھر سے باہر نکال دیا۔ میرے کان میں ننگی نکل آنے کی پھبتی متواتر گونج رہی تھی۔ میں دوڑی دوڑی اُس بی بی کے پاس پہنچی۔ مُنہ کان کے قریب لے جا کر کہا کہ ہیں بہن کپڑا اوڑھو ننگی نکل آئی ہو۔ یہ کہہ کر میں نے شیطانی تبسم اور اطمینان سے اس کو تاکا۔

پہلے اس نے میری بات کو ہمدردانہ کلام سمجھ کر سر اُٹھایا، پھر میرے مفسدانہ خیالات کا اندازہ کر کے سر نیچے کر لیا اور رونے لگ گئی۔ بہت سے مرد عورتیں جمع ہو گئیں۔ میں فاتحانہ انداز سے گھر میں داخل ہو گئی۔ اب میں کامیابی کے نشے میں سرشار تھی، دُنیا کی ہر چیز مسرور نظر آتی تھی۔ میں خوش تھی۔ در و دیوار سے خوشی ٹپکتی تھی۔ زمین و آسمان ذرّے اور پتے رقصاں تھے۔ میں چونکہ اپنے انتقام میں کامیاب ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر خوش خوش بیٹھی رہی۔ زیادہ

خوشی اور کثرتِ غم دونوں اضطراب انگیز ہوتے ہیں۔ میں کام میں مصروف ہونا چاہتی تھی مگر خوشگوار اضطراب کی وجہ سے کام میں دِل نہ لگتا تھا۔

میں پھر دروازہ پر آئی، دیکھا کہ ایک غریب عورت اُسے اپنی اوڑھنی اوڑھا کر گھر لے جا رہی ہے اور خوشحال گھروں کی عورتیں دونوں کی ہنسی اُڑا رہی ہیں۔ میں جب یہ واقعہ سوچتی ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتی ہوں کہ نرم ریشم پہننے والوں کے دِل سخت پتھر ہوتے ہیں۔ موم کے دل موٹا جھوٹا پہننے والوں کے ہوتے ہیں۔ مگر آہ مجھ بدنصیب گنہگار کو دوسروں پر نکتہ چینی کہاں زیب دیتی ہے جس نے رائی سی بات کا پہاڑ کے برابر بدلہ لیا۔ پیارے بھائی اور بہنو! منتقمانہ خوشیاں بہت عارضی ہوتی ہیں۔ بُری خواہشات کا راستہ ہر چند کانٹوں سے پٹا پڑا ہے۔ مگر گنہگار شرابی کی طرح منزل کے خطرات سے لاپروا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب مقصد کو پا لیتا ہے تو تلوے چھلنی پا کر گھبراتا ہے اور آہستہ آہستہ نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔

ندامت:۔

میری خوشی کی تکمیل کے بعد غم کی ابتدا ہوئی۔ انتقام کی پیاس نے جو پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا وہ سامنے سے اُٹھ گیا تو معلوم ہوا کہ میں تو عصیاں کے تپتے ریگستان میں آنکلی ہوں جہاں ہر طرف بگولے اُٹھ رہے ہیں۔ ریت کے ذرے کروڑوں سُورج بن کر آنکھوں کے سامنے چمکتے ہیں۔ رات کو سونا چاہا۔ مگر شیطانی عمل کی وحشت نے آرام نہ لینے دیا۔ یک بیک مایوسیوں کی کالی گھٹاؤں میں ایک اُمید کی کرن نمودار ہوئی۔ دماغ نے دِل سے کہا، موقعہ موجود ہے،

صبح اس کے خاوند کے سامنے اپنی بدکیشی اور زباں کوشی کا اقرار کرو اور معافی مانگو اور لوگوں کو اس عفیفہ کی عصمت کا یقین دلاؤ۔ میں نے پہلے دل قوی کیا پھر حوصلہ ہار دیا۔ بہشت کا دروازہ نمودار تو ہو گیا مگر کھولنے کی ہمت نہ ہوئی دُنیا میں لاکھوں ایسے ہیں جو معصوموں پر خطرناک تہمتیں تراشتے ہیں، تھوڑے ہیں جو پشیمان ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر ایسے ہیں جو جھوٹی تہمت لگا کر دل میں پشیمان ہوتے ہیں اور کسی معصوم کی عزت بچانے کے لئے اپنے گناہ کا بروقت اقرار کرتے ہیں۔ میں نے سوچا میرے اقرارِ گناہ سے بیشک وہ دُنیا کی نظر میں محبوب ہو جائے گی۔ خاوند کی پیاری بیوی کہلائے گی۔ مگر اس اقرار کے بعد میری حالت کیا ہو گی۔ جو سُنے گا وہ مجھ پر لعنت بھیجے گا، جو دیکھے گا وہ تھوکے گا، گناہ کے اقرار نے جو جنت کا راستہ دکھایا تھا اس عقوبت کے خیال نے اُسے نظروں سے اوجھل کر دیا۔ صبح ہو گئی۔ سُورج سوگوار نکلا۔ قدرت ماتمی لباس پہنے دِکھائی دی۔ دِل کے غم نے ہر چیز پر مایوسی کا سایہ ڈال رکھا تھا۔ اس روز سُورج کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں پڑی تھیں اور ایسا سُست رفتار تھا کہ دِن قیامت کا ہو گیا۔ کیا کہوں کیسے کٹا، خیر جیسے کٹا کاٹا۔ شب کی تاریکیاں جب عصیاں کی ظلمتوں کے ساتھ مل کر آئیں تو لاکھوں ڈراؤنی رُوحیں اُن کی آغوش بلاخیز میں کھیلتی دکھائی دیتی تھیں۔ میں آنکھ کھولتی، ڈرتی، بند کرتی چونکتی تھی۔ اِدھر اُدھر سے زمین و آسمان سے مجھے لعنت برستی دکھائی دیتی تھی۔ میں اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ کہا، اے دل۔ دِل دُکھانے والوں اور جھوٹا الزام لگانے والوں کا یہی حال ہوتا ہے، مایوسی کی یہ انتہا عزمِ نیک کی ابتدا ہو گئی۔ جو دل اپنے آپ کو

ضمیر کی ملامت کے مستحق سمجھ لیتا ہے اور عقوبتِ گناہ اُٹھانے کو تیار ہو جاتا ہے اُسے اطمینان کا خزانہ بخش دیا جاتا ہے۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ صبح پہلا کام یہ ہو گا کہ اُس کے خاوند کے پاؤں گر کر اپنے گناہ کی معافی چاہوں گی اور ہاتھ جوڑ کر اس بی بی کو مناؤں گی۔ لوگ مجھے شرمناک فتنہ پرداز کہیں گے لیکن اس تلخ سچ کو خندہ پیشانی سے سنوں گی اور ٹھنڈے دل سے برداشت کروں گی۔ کتابِ مقدس پر ہاتھ رکھ کر لوگوں کو اس عورت کی عصمت کا یقین دلاؤں گی۔ ندامت کے ساتھ عزمِ خیر نے مل کر تاریکیوں کو دُور کیا۔ اچھے خیال نے زمین و آسمان کو نُور سے بھر دیا۔ دُنیا کی فکر سے آزاد و لاپرواہ بچے کی طرح اطمینان کی نیند سو گئی۔ صبح اُٹھی۔ دل میں خوشگوار انقلاب پایا۔ طبیعت میں نہ خوشی تھی نہ غم۔ میرے چہرے پر اُس شہید کا سا اطمینان جلوہ ریز تھا جو توبہ کے بعد گناہ کی عقوبت کو برغبت برداشت کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پھر دُنیا کی راحتیں اور غم دونوں اسے حقیر نظر آتے ہیں اس کی رُوح ان طمانیتوں اور مسرتوں کا ادراک کرنے لگتی ہے جو فرشتوں کو خدا کے دیدار سے حاصل ہوتی ہیں۔

الغرض میں صبح اُٹھی ہمسائے کے گھر گئی اور گھر خالی پا کر واپس آگئی۔ اپنی دہلیز پر دیر تک بیٹھی رہی جب میرا ہمسایہ نہ آیا تو اُٹھ کے اندر چلی گئی۔ کسی کے پاؤں کی آہٹ پائی تو پھر بھاگی آئی صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی مگر وہ نہ آیا۔ اگلے روز میں علی الصبح اُٹھی۔ مکان کو جوں کا توں کھلا پایا۔ اپنے خاوند کو سنایا کہ ہمارا ہمسایہ کل سارا دن گھر نہیں آیا، وہ معمولی بات سمجھ کر خاطر میں

نہ لایا رحسب معمول کام کو چلا گیا۔

تیسرا دن ہُوا، مکان کھُلا دیکھ کر اور لوگوں کو بھی تشویش ہوئی۔ کچھ نیک دِل بندوں نے جستجو شروع کی۔ تالاب کنویں میں جھانکا۔ ایک پُرانے تاریک کنویں میں کسی کو کچھ کپڑے تیرتے نظر آئے۔ لوگ بھاگے گئے۔ غور کیا تو لاش نظر آئی۔ نکال کر دیکھا تو بدنصیب ہمسایہ پہچانا گیا۔ میں چھت پر کھڑی تھی۔ باہر سے لوگ نعش کو چارپائی پر لا رہے تھے۔ جب ہمسائے کی خودکشی کی خبر اُڑتی اُڑتی میرے کان میں پہنچی۔ ایسا معلوم ہُوا کہ آفتاب کے سامنے ابر چھا گیا، اور دُنیا کے چہرہ پر تاریک پردہ آ گیا ہے۔ پاؤں نے گنہگار جسم کا بوجھ برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ میں بیٹھ گئی۔ ضمیر نے برملا کہا کہ تو اس کی موت کا باعث ہوئی۔ کسی نامعلوم آواز نے آہستہ اور غمگین لَے میں کہا، توبہ کے دروازے سب بند ہو گئے۔ خدا نے معافی کا قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ حُوروں نے اُمید کے جس پیمانے میں تیرے لئے اطمینان کی شراب بھری تھی، وہ گر کر ٹوٹ گیا ہے۔

میں اندرونی خیال کی دُنیا میں تھی۔ باہر ایک سہیلی مجھے نعش دیکھنے کے لئے بُلا رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ مگر ضمیر نے پاؤں تھامے ہوئے تھے۔ بول نہ سکتی تھی۔ صرف سر ہلا کر اشارہ کر دیا کہ نعش جا کر دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں، مَیں خود نہیں گئی۔ مگر بعد میں سُنا کہ خاوند کی لاش پر عورتیں بیوی کو سہارا دے کر لائیں۔ وہ چیخی نہ روئی۔ پاس بیٹھ کر اطمینان سے بولی تم ناراض کس بات سے ہو بولتے کیوں نہیں۔ جس نے سُنا، رو دیا لوگوں کو روتے دیکھ وہ ہنس دی اور سب کے سامنے اُٹھ کر ہاتھ باندھ کر کہا۔

سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ وُہ رُوٹھ گئے ہیں۔ مَیں خود ہی مناؤں گی۔ جب لوگ نہ گئے اور رونے لگے تو وہ غصّے میں آ گئی اور خفا ہو کر پوچھا۔ کیوں تمہارا کوئی مر گیا ہے روتے ہو؟ پھر لکڑی اُٹھا کر لوگوں کو مارنے لگی کہ جاؤ جاتے کیوں نہیں۔ یہاں کوئی تماشا ہے۔ وُہ رُوٹھ گئے ہیں تو مَیں خود ہی مناؤں گی تمہیں کیا۔ لوگوں نے ہاتھ سے لکڑی چھین لی اور کہا یہ تو پگلی ہو گئی ہے۔

جب لوگ کفن پہنانے لگے تو وہ پُکاری کہ تم سب جاؤ۔ مَیں اپنے مالک کو خود ہی کپڑے بدلواؤں گی۔ آخر لوگوں نے اس کو کوٹھڑی میں بند کیا اور لاش کو لے کر چلے گئے۔ جوں ہی مجھے یہ دلخراش تفصیل معلوم ہوئی۔ کیا بتاؤں میری کیا کیفیت ہوئی۔ مجھ سے کیا سُنتے ہو خود ہی میرے حال کا اندازہ لگاؤ۔ روئے زمین پر مجھ سے زیادہ رُوسیاہ بدنصیب کون ہو سکتا ہے جس نے دو محبت کرنے والے دِلوں کی بہشت سے زیادہ پُرامن اور خوشگوار زندگی کو اپنی بہتان طرازیوں سے ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا۔ اب تو مَیں آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے اور ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے کے قابل نہ رہی تھی۔ سُورج پُوری آب و تاب سے چمکتا ہو گا مگر مجھے دھوپ پھیکی اور زرد معلوم ہوتی تھی۔ ہر ہنسی فغان ماتم اور ہر صدا صدائے یاس بن گئی۔ میرے دروازے کے ساتھ تو دروازہ تھا۔ دُور دُور سے لوگ اُسے دیکھنے آئے تھے مگر میں دیکھنے نہ گئی کیونکہ مجھ میں اُسے نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ تھی۔ ایک دن میری سہیلیوں نے باصرار کہا کہ جا کر دیکھ آؤ۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے صدمہ ہو گا۔ اُنھوں نے واپس آ کر بتلایا کہ پگلی کی حالت عجیب ہو گئی ہے۔ وہ اب بھی اپنے

خیال میں خاوند کو زندہ سمجھتی ہے۔ آج نہائی دھوئی سُرمہ کنگھی کرکے بیٹھی ہے جو جاتا ہے اُسے کہتی ہے کہ وہ کئی روز سے رُوٹھ کر چلے گئے ہیں۔ آج آئینگے تو میں پاؤں پکڑ کر مناؤں گی۔ تم سب کہنا کہ اپنی لونڈی پر یہ عتاب اچھا نہیں، کبھی اضطراب سے اُٹھ کر دروازہ کی طرف جاتی ہے۔ سر باہر نکال کر گلی کی طرف دیکھتی ہے، پھر کہتی ہے، آج خیر ہو کہ بہت دیر ہوگئی۔ ابھی تک آئے نہیں، کس کو بھیجوں۔

الغرض وہ پگلی ہر صبح اُٹھتی، نیا لباس پہنتی، خاوند کے لئے روٹی پکاتی اور اس کے انتظار میں چُولھے کے پاس بیٹھ جاتی، پتّا بھی ہلتا تو اُمید سے سر اُٹھا کر دیکھتی۔ کسی کو نہ پا کر مایوس ہو جاتی۔ اس طرح وہ مرجع خلق بن گئی۔ اور یہ افسانۂ محبّت زبان زدِ خلائق ہُوا۔ میری حالت زیادہ قابلِ رحم ہوگئی۔ دل دردِ پنہاں سے بے قرار تھا اور سینہ خوشیوں کا مزار تھا۔ میں غم سے مر رہی تھی مگر کسی کو محرمِ غم بنانے کا حوصلہ نہ تھا۔ یہ خوفناک راز افشا کروں تو کیونکر، چھپائے رکھوں تو کیسے؟ یہ دو سوال عقدۂ لاینحل ہو گئے، ضمیر کی ملامتوں اور خیالات کی پریشانیوں نے میری رات کی نیند اور دِن کا آرام حرام کر دیا، دنیا دوزخ نظر آتی، کیونکہ میرے دِل کو ایسی آگ لگی تھی جو بُجھ نہ سکتی تھی۔ اگر دوزخ میں جا کر اس غلطی کی تلافی ہو سکتی تو دوزخ کو بہشت سمجھ کر قبول کر لیتی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ میری فتنہ پردریوں نے دو انسانوں کے درمیان موت کی خلیج حائل کر دی ہے۔ موت کا اعجاز نُما ہاتھ ہی ان دونوں کو ملا سکتا ہے۔ کوئی جتن اور سعی اب حالات کی درستی نہیں کر سکتی۔

میں نے واقعہ کو بھلانا چاہا مگر گناہ کی بار بار تکلیف دہ یاد ہی تو
ا نے دنیا میں گنہگار کی سزا رکھی ہے - میں جتنا بھلاتی تھی اُتنا ہی
آتا تھا -

خودکشی :-

میں نے عالمِ یاس میں ملال و غم سے بچنے کے لئے اپنا قصہ مختصر رنے کا فیصلہ کیا - جب میرا خاوند باہر گیا - میں نے اس کی پگڑی نکالی - مت سے باندھی، گلے میں ڈالی - آہ زندگی بے عیب محبوب زندگی، جو کبھی بہشت کی ٹھنڈی چھاؤں سے زیادہ فرحت افزا جنت کی ہواؤں سے یادہ رُوح پرور تھی، کوثر اور تسنیم کے پانیوں سے نہانے والی حُوروں سے یادہ دلکش تھی - آج تجھ میں تاریکیاں ہیں، ہزاروں بلائیں ہیں جہنم کے چھوٹے بڑے شیطان ناچتے دکھائی دیتے ہیں - ایسی زندگی کو میں ختم کروں گی - میں مرجانا چاہتی تھی - لیکن حوصلہ نے جواب دے دیا - میں ونچی چوکی پر کھڑی تھی، پگڑی گلے سے نکال دی - گھٹائیں آسمان پر چھائیں، سفید بگلے کالی گھٹا میں اُڑنے لگے - سبز ڈالیوں میں سیندوری ام لٹک رہے تھے، طوطے کبھی بیٹھتے تھے کبھی اُڑتے تھے - دروازہ بند تھا، مکان تاریک - میں ڈر کر باہر نکل آئی - ایک سال پہلے کا واقعہ یاد آگیا - یہی موقعہ تھا - اسی صحن میں عورتیں جھولا جھولنے کے لئے آئی تھیں - اس معصوم بچی نے بھولے سے ایک بات کہہ دی تھی - میں نے اس جگہ کھڑے ہو کر انتقام کا عہد کیا تھا - سال ختم ہو گیا - میرا انتقام پورا ہو گیا

کیا میں خوش ہوں۔ نہیں، دنیا میں سب سے زیادہ ماتم زدہ اور سوگوار عورتیں ابھی آرہی ہوں گی وہ جھولا ڈالیں گی۔ آہ میں انہیں کن آنکھوں سے دیکھونگی پھر مایوسی اور غم نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے کہا کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ دوزخ میں اس سے کہیں زیادہ اطمینان ہوگا۔ میں ایسی پریشانی اور مایوسی کو برداشت نہیں کرسکتی۔ جوش کے عالم میں اندر گئی۔ پگڑی چھت سے لٹک رہی تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس پگڑی کا رنگ بھی سرخ تھا۔ میں نے کہا کہ اے خونی سرخ پگڑی ایک ہمسایہ کا خون کیا۔ اب میری جان بھی لے۔ یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کیا، پگڑی گلے میں ڈالی۔ جسم پر موت کے خوف سے لرزہ طاری ہوگیا۔ گلے سے پھندا نکال کر پھر الگ کھڑی ہوگئی۔ آہ موت، باوجود دنیا کی مصیبتوں کے میں تجھے قبول نہیں کرسکتی۔ لعنت ہے مجھ پر کہ میں معمولی بات کے لئے ایک نوجوان کو اسی خوفناک موت کے گھاٹ اتارنے کا باعث ہوئی۔ ندامت طوفان کی طرح امنڈ آئی۔ میں اس میں مایوس ہوکر غرق ہوگئی۔ پگڑی کو پکڑ کر سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ ندامت اور مایوسی مل کر بزدلوں میں بھی شیر کا حوصلہ پیدا کردیتی ہیں۔ میں نے پھر دل سے کہا کہ دوسروں کی جان لینے میں وہ عجلت اور اپنی جان دینے میں یہ پس وپیش، ظالم، ایسی ہی عزیز اس شخص کی زندگی بھی تھی، جو ندامت اور مایوسی سے ڈوب مرا۔

اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے گلے میں پھندا ڈالا جلدی سے جھٹکا دیا اور اپنا کام تمام کرلیا۔ جان کنی کی مصیبت اور موت کی کہانی کو تو اس

دُنیا والے سب جانتے ہیں، اُسے کیا دُہراؤں، البتہ اعمالنامہ کی ابتدائی تحریر
آپ کو سناؤں تاکہ معلوم ہو کہ میں نے کیا سمجھا تھا۔ یہاں کیا دیکھا۔ میرے
خلاف اس خوفناک جُرم سے زیادہ سنگین الزام یہ تھا کہ میں نے خدا کی رحمت
سے مایوس ہو کر خودکشی کی۔ اے کاش دُنیا والوں کو کوئی میری سرگزشت
سنائے اور مایوس ہو کر خودکشی کرنے سے ڈرائے۔ میرے اعمالنامہ میں
جو مرقوم ہے سنو!

"گناہوں سے ندامت توبہ کی قبولیت کا ثبوت ہے جو کئے پر نادم ہو
کر اصلاح کا عہد کرتا ہے، اُسے موقعہ سے محروم نہیں کیا جاتا۔ وہ آواز جس نے
کہا کہ توبہ کے دروازے بند ہو گئے اور خدا نے معافی کا قلم ہاتھ سے رکھ
دیا ہے شیطان کی آواز تھی۔ خدا آخری سانس تک مرنے والے قلب کو
دیکھتا ہے جو سچے دل سے توبہ کر کے خلق سے حُسن سلوک کا عہد کرتا ہے۔
وہ بخش دیا جاتا ہے۔ لاتعداد لوگ ایسے تھے جنہوں نے گناہ کر کے توبہ کی اور
باقی زندگی میں خدمتِ خلق کی۔ ان کے گناہ سے نیکیاں بڑھ گئیں اور
فلاح پائی۔ تیری ندامت نے توبہ کے دروازے کھول دیئے تھے۔ مایوسیوں
کے تاریک پردے کی وجہ سے تو دیکھ نہ سکی اور گھبرا کر خودکشی کر لی۔ اگر
تُو توبہ میں ثابت قدم رہتی، خلق خدا کی بھلائی کی کوشش کرتی تو تیرا بال
بیکا نہ ہوتا اور تو بخش دی جاتی۔ مگر شیطان نے تجھے بہکایا اور کہا کہ توبہ
کے دروازے بند ہو گئے۔ خدا نے معافی کا قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔
جوروں نے اُمید کے پیمانے میں اطمینان کی جو شراب بھری تھی وہ بہہ گئی

حالانکہ یہ سب کچھ اس وقت ہُوا جب تُو نے پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈالا۔ حوروں نے تیری مایوسانہ خودکشی پر سر پیٹا اور ناچار وہ پیمانہ زمین پر پٹک دیا گیا۔

اے ناعاقبت اندیش عورت! خوفزدہ بچہ جب ماں کی آغوشِ عافیت میں پناہ لینے آتا ہے تو ماں کی گود کو ہمیشہ قبول کرنے کے لئے مستعد پاتا ہے۔ جب خدا کا نیک بندہ اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ بدتریں گنہگار کے لئے مغفرت کی دُعا کرے تو تُو نے خیال نہ کیا کہ خالق جو سب خوبیوں کا خلاّق ہے وہ کیسے گنہگاروں کی خواہشِ عفو کو مسترد کر سکتا ہے۔ آج تک خدا کے حضور مظلوم کی آہ اور ظالم کے اشکِ ندامت کب اثر سے خالی رہے، مگر تو نے دُنیا کے باغ میں بوقلموں میووں میں سے صرف مایوسی اور گناہ کا پھل چکھا ہے۔ اس لئے اب اس کی سزا بھگت۔ نادان عورت! اگر گناہ کے بعد توبہ اور توبہ کے بعد انسانوں کی کوئی خدمت انجام دی ہوتی تو آج صورتِ حال دِگرگوں ہوتی۔ اعمالِ صالح کی توفیق خدا کے عفو کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔ جو شخص توبہ کے بعد خلقِ خدا پر احسان کرنے میں ساعی ہوتا ہے، اس کی سعی کو مشکور کیا جاتا ہے۔ اگر تُو بھی اس ابتلائے عظیم کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی نیک کام کرتی تو تیرے عملِ قبیح پر قلمِ عفو پھر جاتا۔ اب بھی مایوس نہ ہو۔ اس دُنیا میں مخلوق کی بہتری کے لئے دُعا کرتی رہ اور اس طرح اپنے آپ کو خدا پذیری کے قابل بنا۔ دیکھ خدا اب بھی آغوشِ محبت کھولے بیٹھا ہے۔ حوریں اب بھی تیرے لئے دست بدعا ہیں۔ فرشتے بھی تیری اصلاح کے لئے سجدہ ریز

ہیں بس تو خدا سے مایوس نہ ہو۔ خدا تجھ سے مایوس نہ ہوگا۔
غرض صاحبو! پانچ ہزار برس کی نظربندی کا حکم تھا۔ مگر میری محنت ویکسوئی کے ازدیاد کو دیکھ کر پانچ سو سال کے بعد اب مجھے سنہری دُنیا کے قابل سمجھا گیا ہے۔ آج وہ روزِ سعید ہے کہ آپ الوداع کہنے کے لئے آئے ہیں۔ خدا آپ کو بھی یہ دن جلد دکھائے اور خدا کرے کہ اہلِ دُنیا کو بھی اپنی ارضی حیات میں بہشت میں آنے اور رہنے کا ڈھنگ آ جائے تاکہ وہ سب اس عالم کی عقوبت اور دوزخ کی آگ سے بچ جائیں۔"
ہیں نیک عمل سے مایوس اور خدا کی رحمت سے نا اُمید اہلِ دُنیا کے ق میں دُعائے خیر کرتا وہاں سے اُٹھا ایک اَور گروہ کی طرف آیا۔ یہاں بھی دُنیا کی بیتی سننے کا شغل جاری تھا۔ ایک صاحب اپنا قِصّہ بیان کر رہے تھے۔ یکایک گھنٹی بجی۔ سب لوگ کھڑے ہوئے۔ ہم سب آہستہ آہستہ گاڑی کی طرف روانہ ہوئے۔ عورتیں تہنیت کے گیت اور تقدیس کے نغمے گا رہی تھیں۔ مرد بھی خدا کی عظمت اور برتری کے نعرے بلند کرتے ہوئے پیچھے پیچھے چلے۔ اُنھوں نے گاڑی میں بیٹھ کر سب کو الوداع کہی۔ گاڑی آہستہ آہستہ چل دی۔ ہم نے پھول برسائے اور ہار پہنائے۔ ان کو رُخصت کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہم بھی اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔ کبھی کبھی کے میلے گاہے ماہے کا مِلاپ کیسا پسندیدہ ہوتا ہے۔ مدت کی نظربندی اور قید کی کلفت کے بعد یہ پہلا اجتماعِ محبوب کے پہلے بوسۂ محبت کی طرح ایک خوشگوار دیرپا اثر چھوڑ گیا۔

میں شاداں و فرحاں گھر پہنچا۔ گویا ماہِ صیام کے بعد عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا ہوں۔ میں نے اپنے تاثرات اپنے بدخشانی دوست سے بیان کئے۔ قیدی کے لئے بھیڑ بھاڑ کا تصور کیسا دلکشا اور فرحت افزا ہے۔ وہ میرے بیان سے بڑا محظوظ ہوا۔ اور دیر تک میلے کے حسین تصورات میں کھویا رہا۔ پھر بولا، کاش یہ موقعہ مجھے بھی نصیب ہوتا۔ اس کے بعد بھی کئی روز تک وہی الوداعی تقریب موضوعِ گفتگو رہی۔ تم جانتے ہو لذیذ کھانوں کا معمول لذتِ کام و دہان کو کم کرتا ہے۔ حسین سے حسین نظاروں کی روزانہ رویت بتدریج ذوقِ تماشا کو ضائع کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہر روز کے ایک ہی موضوع کلام میں بھی لطف نہ رہا۔

ایک روز دِن نکلتے ہی گھنٹوں کی گوش آشنا میٹھی آواز سنائی دی۔ فرشتہ نے بھی آکر بتایا اور اعمالنامہ میں بھی لکھا پایا کہ آج اجتماعِ عظیم ہے۔ میں خوشی سے جامہ میں پھولا نہ سمایا۔ چنانچہ نئے کپڑے بدل کر تیار ہوا۔ آج وہ بدخشانی دوست بھی بگلے کی طرح اُجلا لباس پہن کر میلے میں جانے کے لئے خوش خوش آیا اور بولا کہ چلئے مجھے بھی اجازت مِل گئی ہے۔ ہم دونوں روانہ ہوئے۔ ہنسی خوشی وہاں پہنچے۔ لوگوں کے کثیر ازدحام اور رنگا رنگ کے لباس سے میدان گلزار معلوم ہوتا تھا۔ آج رخصت ہونے والے مہمانوں کی کئی گاڑیاں بھری آ رہی تھیں۔ پھر یک بیک 'بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ' کا شور ہوا۔ سب بدستورِ سابق سایہ دار درختوں کے نیچے کرسیوں پر آ بیٹھے۔ مجھ کو سابقہ مشاہدہ کے خلاف اس دفعہ سامنے ایک بڑا سفید نورانی پردہ نظر

آیا۔ اور ہر ایک درخت میں بجلی کا ایک قمقمہ جگمگاتا دکھائی دیا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ آج دُنیا کی چند محترم ہستیوں کا ظہور ہوگا اور وہ ہمیں پیغامِ محبت سنائیں گی۔

اگرچہ دن کی ابتدا اور مطلع صاف تھا مگر شام کی طرح تاریکی بڑھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ بالکل اندھیرا چھا گیا اور بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ سارا جنگل بقعۂ نور بن گیا۔ آنکھوں کو یہ نظارہ بڑا اچھا لگا۔ لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ یک بیک بجلی بجھ گئی اور ہش ہش کی آواز نے خاموشی کا عالم پیدا کر دیا۔ سب کی نظریں سامنے پردے پر جم گئیں۔ گو ہر سمت اندھیرا تھا۔ مگر آویزاں پردے پر جسدِ خاک میں چار ارواحِ پاک نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوا گویا صبحِ صادق کا ظہور ہو گیا۔ اُن کی نورانی صورتوں پر تبسمِ روحانی کھیل رہا تھا۔ اور شرمگیں آنکھوں سے حیا ٹپک رہی تھی۔ وہ ازبا علم و حلم کی طرح مسکرائے۔ منکسر المزاج لوگوں کی طرح فرش گیاہ پر بیٹھ گئے۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ صرف اُن کی چاند سی صورتیں روشن نظر آتی تھیں ۔۔

باب چہارم

حضرت آدم اور دوسری پاک روحوں کی آمد اور تقریریں

اُن میں سے ایک نے اُٹھ کر پہلے خدا کی حمد اور تقدیس بیان کی پھر ہمیں مخاطب کر کے کہا کہ اے احباب و اصحاب!

دُنیا میں جو جو خدا کا پیغام بر ہو کر گیا۔ وہ یہی پکارا کہ خدمتِ خلق، رحم سلوک، محبت ہی مذہب کی جان ہے۔ یہی خدا کا پیغام ہے۔ لیکن اُمتیں متفرق ہو گئیں۔ ہر پیغمبر کا بُت بنایا گیا اور اُن کے نام پر دُنیا میں جنگیں کی گئیں۔ پیغمبروں کو مانا مگر اُن کی تعلیم سے انکار کیا۔ عیسٰے دنیوی بادشاہ نہ بنا تا کہ امیر و غریب کا امتیاز اُٹھ جائے۔ وہ بھیڑوں سے بھی زیادہ بے ضرر اور سادہ طرح لوگوں کو بچاتا اِس جہان سے رخصت ہوا۔ پھر مسیح کے نام پر لوگ اُٹھے۔ بھیڑیوں سے زیادہ طاقتور اور بے ضرر لوگوں کو مغلوب کیا۔ درندوں سے زیادہ خونخوار ہونے کے باوجود خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کا یقین لئے مرے۔ گوتم بدھ نے غریبوں میں شامل ہونے کے لئے تاج و تخت چھوڑا۔ اہنسا کو پرم دھرم کہا۔ خدمتِ خلق کو وجہِ نجات بتایا۔ مگر لوگ [illegible]

لگے رہے۔ اکرشن غریبوں کا بھوجن کھاتے۔ پریم کی بنسری بجاتے پھرے لیکن دُنیا داروں نے غریبوں سے محبت کا برتاؤ نہ کیا۔ میں نے مساواتِ انسانی کی بنیاد ڈالی۔ بادشاہت کا تاج سر پر نہ دھرا۔ پیٹ بھر کر نہ کھایا مگر میرے اُمتی ہونے کے دعویداروں نے مساوات کو ترک کیا۔ نسل اور خون کے امتیاز پر فخر کرنے لگے۔ شہنشاہی کے تاج سر پر رکھے۔ ہمسایہ فاقے مرا۔ خود پیٹ بھر کر کھایا۔ میرے قول اور عمل کے خلاف سب کچھ کیا مگر تاہم اُنہیں میری شفاعت کا پُورا یقین رہا۔

قسم ہے خالق کی جو شخص مخلوق پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائیگا جو دُنیا میں لوگوں کی خدمت نہیں کرتا وہ آخرت میں اجر نہیں پائے گا۔ مردو! جب تک تم خدمتِ خلق میں غلو نہ کرو۔ تمہاری حور وش بیبیاں جن کی نظریں جنت میں حیا سے جُھکی ہوئی ہوں گی، محبت بار آنکھوں کو اُٹھا کر تمہیں نہ دیکھیں گی۔ اے بی بیو تمہارے غلمان صفت بھولے بھالے خوبصورت بچے تب تک پیار سے تمہارے پاس نہ آئیں گے جب تک ان کو تمہاری نیکوکاری اور پرہیزگاری کا یقین نہ ہوگا۔ یہ نیکوکاری اور پرہیزگاری کیا ہے فقط لوگوں کی خدمت کرنا اور معصیت سے باز رہنا۔ لوگو! انصاف برتنا اور رحم کرنا سیکھو۔ انصاف یہ نہیں کہ امیر دسترخوان پر بیٹھ کر مرغن غذائیں اُڑاتے اور غریب ریزہ چینی کی اُمید پر دُھوپ میں کھڑا سُوکھے یا جاڑے میں ٹھٹھرتا رہے۔ امیر فاخرہ لباس پہن کر نکلے۔ غریب حیرت و استعجاب سے اُس کو دیکھے صاحبِ زر جب نادار کو کچھ دیتا ہے تو تکبر سے اکڑتا ہے کہ اس نے بڑی نیکی

کی ہے حالانکہ اس کے اس عمل کی مثال اس لٹیرے کی سی ہے جو پہلے بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کو لوٹتا ہے، پھر اس لوٹ میں سے ایک فی صدی واپس کر کے فخر کرتا ہے کہ اس نے بڑی نیکی کی۔ چند آدمی جو بہت سا روپیہ جمع کرتے ہیں، کثیر التعداد آدمیوں کا حق غصب کرتے ہیں۔ دُنیا میں دولتمند جس قدر بڑھتے ہیں اُسی تناسب سے لوگ غریب ہوتے ہیں۔ پیدا ہوتے وقت انسان ننگا اور خالی ہاتھ آتا ہے۔ خدا کی زمین جو مخلوق کی یکساں ملکیت ہے اس میں ہوشیار آدمی اپنے جائز حق سے زیادہ حاصل کرتا ہے۔ سیدھے سادھے لوگوں کو فریب دیتا ہے۔ غاصب حقوق ہو کر امیر کہلاتا ہے۔ البتہ وہ امیر جو موت سے پہلے خود پیدا کی ہوئی جائداد لوگوں کی بہبود کے لئے چھوڑ جائے منصف ہے۔

اے لوگو! مذہب کی روح خدمت، سلوک اور معاملہ ہے۔ نماز اور وظائف محرکات میں سے ہیں۔ حق اللہ سے حق العباد کو زیادہ مقدم سمجھو، کسی کا دل نہ دُکھاؤ۔ بلکہ بے ریا خدمت سے اپنی جگہ بہشت میں بناؤ۔ خدا کی خوشنودی کو دکھاوے کی نمازوں اور ریا کے سجدوں سے خریدنے کی بیہودہ کوشش نہ کرو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب تک انسان مظلوم کے لئے اپنا خون گرا کر بے کسوں کے لئے پسینہ بہا کر کوئی آبدار تحفہ اپنے مالک کے لئے نہیں لے جاتا۔ خدا اس کی خالی نمازوں اور عبادتوں پر توجہ نہیں فرماتا۔ نمازیں میں نے بھی پڑھی ہیں اور پڑھائی ہیں تاکہ لوگوں کی ہمت بڑھے اور شوقِ خدمت ترقی کرے لیکن جب نماز پڑھی اور خدا کو یاد کیا، مخلوق کی خدمت کا نیا عزم لے کر

ملے۔ ابوبکر رض نے نماز پڑھی۔ اثاث البیت بیت المال میں جمع کر کے اسلام
ں امیر و غریب کا امتیاز مٹایا۔ باوجود حکومت کے فاقہ مستی اور تنگ دستی سے بسر
ں مگر کوئی یہ نہ کہہ سکا کہ حاکم وقت مجھ سے بہتر حال میں ہے۔ نیکی کی ابتدا
، ہے کہ آدمی رات دن محنت کر کے کمائے لیکن اپنی ذات پر ایک غریب سے
یادہ خرچ نہ کرے۔ موت سے پہلے سب مال و منال قوم کے سپرد کر جائے۔

خدا جو سب انسانوں کا باپ ہے اپنے کنبے میں امیر و غریب کی مغائرت
تحمل نہیں۔ ایک بھائی گلچھرے اُڑائے اور دوسرا فاقے اُٹھائے۔ اس
ردناک نظارے کو کوئی باپ برداشت نہیں کرسکتا۔ خدا جو سب انسانوں کا یکساں
پ ہے، ایسی تفریق کو پسند نہیں کرسکتا۔ امیر و غریب کا امتیاز قائم
رکھ کر نیکیاں مشتبہ اور گناہ یقینی ہو جاتے ہیں۔ اے عزیزو! اپنے آرام و
سائش کے لئے محنت نہ کرو بلکہ قوم اور ملک کی مشترکہ دولت میں اضافہ کرنے
کے لئے خون اور پسینہ بہاؤ۔ انسانوں میں سے سیاسی، نسلی، مالی
متیاز کو مٹاؤ۔ امتیاز سے انسانوں میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔ خدا متکبر کا دشمن
ہے، سلوک اور معاملہ سے نیکی اور بدی کو پہچانو۔ جو تم میں سب سے زیادہ
پرہیزگار، ایذا رسانی سے باز رہنے والا اور حسن سلوک سے لوگوں کو خوش
کرنے والا ہے وہی اللہ کے نزدیک ممتاز اور بڑا ہے۔ لوگو محنت کر کے
کھاؤ۔ پیغمبروں کے حالاتِ زندگی کی روشنی میں اپنے اعمال کو جانچو۔ ان
کی مشترکہ خصوصیت یہ تھی کہ سب کے سب جفاکش اور محنتی تھے، رزق کماتے
تھے اور کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتے تھے۔

پیغمبروں اور نیکوکاروں کا دِل کبھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ جب تک ایک انسان دُنیا میں بھوکا ہے وہ پیٹ بھر کر کھائیں یا سرمایہ داروں کی طرح محنت کر کے خود کچھ نہ کمائیں اور سُود اور منافع کے حیلہ اور بہانہ سے دوسروں کی کمائی کھائیں ۔ وہ اولاد کے لئے ترکہ نہیں چھوڑتے ۔مبادا سرمایہ داری سنت قرار دی جائے ۔اور صاف دِل مزدور اور سادہ لوح کسان کی کمائی ہوشیار سرمایہ دار کھا جائے ۔۔اے صاحبِ زر اور تاجور لوگو! خدا پر یہ بہتان نہ باندھو کہ اس نے شاہ و رعایا، امیر و غریب، آقا و غلام کا امتیاز قائم کیا ۔ یہ تو چالاک اور نفس پرور آدمیوں کی ابلہ فریبیاں ہیں پیغمبر جو اہلِ دُنیا کے لئے مشعلِ ہدایت تھے ان میں سے نہ کوئی شاہ نہ کوئی امیر اور آقا تھا ۔ اُنہوں نے نسل و رنگ، آقا و غلام، شاہ اور رعایا کے امتیاز کو مٹا کر خدمت اور محبت کی اساس پر آئینِ عالم کی بنیاد ڈالی جس نے زیادہ خدمت کی وہی بڑا مخدوم ہوا، جس نے مخلوق سے محبت کی وہ خالق کا محبوب ٹھہرا ۔ اے لوگو! خدا سے ڈرو ۔ کمزوروں سے نہ لڑو، خدمت اور محبت کا سلوک کرو ۔ نسلِ آدم کے امتیازات کو مٹاؤ ۔ محنت سے کماؤ، بانٹ کر کھاؤ، یہی پرہیزگاری اور اصل عبادت ہے ۔

اے ہادیانِ دین! لوگوں کو تھوڑی عبادت سکھاؤ اور عمل کرنے پر زیادہ زور دو ۔ اے لوگو! نماز پڑھو، وظیفے چھوڑو، اللہ کا فضل ڈھونڈنے کے لئے نکل جاؤ ۔ اللہ کا فضل کیا ہے محنت سے کمانا اور خدمتِ خلق میں مصروف ہو جانا ۔ قوم کے بچوں کی تعلیم صحت اور صفائی کی کوشش کرنا ہر

شخص کے لئے ترقی، آرام و آسائش، خوشی و راحت کے یکساں مواقع بہم پہنچانے
میں ساعی ہونا۔ اے لوگو! اللہ کا فضل ڈھونڈو اور بھائیوں کی خدمت کا موقع
تلاش کرو۔ اے لوگو جو بہشت میں رہنا چاہتے ہو جنّتیوں کی عادتیں اختیار کرو۔
وہ عادتیں کیا ہیں۔ سب کی خدمت کے لئے مستعد رہنا، کسی کو زبان سے
بھی آزار نہ پہنچانا، دوسروں کو خوش کرنے کے لئے خود تکلیف اُٹھانا۔ اے
وہ شخص جو مرض الموت میں مبتلا ہے، تو اگر سفرِ زندگی ختم کر چکا تو کیا ہوا۔ مایوس
نہ ہو۔ آخری لمحے میں توبہ کر، ہاتھ پاؤں سے عاری ہو گیا ہے تو زبان سے
مخلوق کی بہتری کی دُعا کر۔ زبان ساکت ہے تو بنی نوع انسان کی خدمت کا
تصوّر باندھ۔ نیک عمل اور نیک خیال کی ہی جنّت کی سنہری دُنیا میں گنجائش
ہے، مفسد اور شریر وہاں گذر نہ پائیں گے۔ وہی خلد میں داخل کیا جائیگا۔
جو مخلوق کو نہ ستائے یا اس نے گناہ کیا ہو تو اُس پر اصرار نہ کرے۔ یا اس
کی نیکیاں اس کے گناہوں سے بہت زیادہ ہوں یا موت سے پہلے
بُرائیوں سے تائب ہو کر نیک عمل یا کم از کم نیک دعاؤں اور نیک خیالات
میں مصروف ہو جائے، اعمالِ صالح کے بعد خیر اندیشی کا درجہ ہے اچھے
عمل نہ ہوں تو نیّت ہی نیک لے کر جائے۔

اے مخاطب دوستو! دُنیائے عمل کا زریں موقعہ تم نے کھو دیا۔ اس
عالمِ خیال میں عمل کی اتنی گنجائش نہیں اپنے خیال کی اصلاح کرو۔ خیر اندیشی سے
کام لو۔ ہمیشہ مخلوق کی بہتری کا خیال رکھو تا کہ جب بہشت میں جانے کا موقعہ
آئے تو نیّت میں فساد نہ آنے پائے۔ بیشک آپ کی پابندیاں لمبی اور سخت

دردناک ہیں مگر عفوِ عام کا افسوسناک تجربہ جو ہو چکا ہے اس کی بنا پر خداوند تعالیٰ کی مشیت میں دخل دینے کی جرأت نہیں ہوتی ورنہ دعاؤں اور التجاؤں سے اس کے رحم سے اپیل کی جاتی کہ گنہگاروں کی بخشش کر۔ اس عفوِ عام کی اندوہناک کہانی ہمارے جدِّ امجد آپ کو سنائیں گے۔ اُمید ہے کہ خدا کے انصاف کے متعلق تمہیں شکایت کی گنجائش نہ ہو گی۔

حضرتِ آدمؑ کی تقریر

خطیب لبیب اپنی جگہ پر تشریف فرما ہوئے اور ان حضرات میں سے ایک بزرگ خضر صورت نیک سیرت کھڑے ہوئے، بڑھاپے سے ان کے پاؤں نہیں اُٹھتے تھے، رعشہ سے ہاتھ کانپتے تھے اور سر کی جنبش مسلسل دائرے بنا رہی تھی۔ اُنہوں نے بلند آواز میں خدا کی بزرگی بیان کی اور کہا، اے بچو! میرے فرزند ارجمند نے مختصر طور سے بیان کر دیا ہے کہ مذہب کی روح حق العباد کی نگہداشت اور اہلِ عالم سے عمدہ سلوک و محبت ہے جو اس اصول کو مدِ نظر نہیں رکھتا، وہ اب بہشت میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے اب کہتا ہوں کہ جب میری توبہ قبول ہوئی اور میں زندگی کی منزل پوری کر کے بہشت میں داخل ہوا تو جنّت کی جُدائی کے تلخ تجربہ سے مجبور ہو کر میں نے تڑپ تڑپ کر دعائیں مانگیں کہ بارِ خدایا میری اولاد میں گنہگار بھی بہشت کی بخشش سے محروم نہ رہیں۔

پرانی بہشت

رحمتِ حق تو ہمیشہ بہانے کی متلاشی رہتی ہے۔ میری دعائیں

در سجدے منظور ہوئے، گناہگار اور نیکوکار دونوں بہشت میں داخل کئے گئے
ر گنہگاروں کی بری خصلتیں جو دنیا میں اخذ کی تھیں رنگ لائیں۔ باوجود اس
کے کہ انہیں میری اولاد ہونے کا اعتراف تھا اور بہشت کی سبز وادیاں اُن
ر برابر تقسیم کی گئی تھیں پھر بھی اُنہوں نے ملکیت پر جھگڑے شروع کر دیئے۔
یک دوسرے کا حق دبانے لگے۔ جو لوگ دُنیا میں بھی مالدار تھے وہ اپنی
سرمایہ دارانہ عادتوں سے باز نہ آئے حیلہ اور بہانہ سے سادہ لوح لوگوں کو لوٹا۔
ا قتوروں نے کمزوروں کا حق دبایا جنہیں حکومت کی لت پڑ چکی تھی اُنہوں
نے عجب جوڑ توڑ وعدے وعید کر کے حکمت سے گروہ بندیاں شروع کیں اور
آوارہ لوگوں کو شامل کر کے کمزوروں کو لوٹنا شروع کیا۔ پہلے سردار جماعت بنے، پھر
سر پر آرائے تخت ہوئے، پھر شہنشاہی کا تاج سر پر پہن کر اپنے بھائیوں کو غلام بنایا سارے
مدنی حقوق کا نفاذ ان کی ذات سے وابستہ ہوا۔ اُمراء وزراء نے مزے اُڑائے
غرباء کا کچومر نکلا سب غریب روتے میرے پاس آئے کہ باباجان ہماری جان سرمایہ داری
کے عذاب سے بچاؤ۔ دُنیا میں اسی خیال پر روزے رکھے تھے کہ آخرت میں
پیٹ بھر کر ملے گا۔ ہمارے لئے تو یہ جنت بھی دوزخ ہو گئی۔ یہاں تو دُنیا سے
زیادہ عذاب ہے۔ جو غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ اور لاکھوں لوٹتے ہیں، وہ
یہاں بھی ساہوکار اور سردار کہلاتے ہیں۔

میں نے ہزار سمجھایا کہ جانِ پدر تم سب انسان میری اولاد ہو بانٹ کر
کھاؤ، ایک دوسرے کو نہ ستاؤ۔ بھائی کو سزاوار نہیں کہ بھائی کا حق دبائے
یا اس کو ستائے دیکھو میری جان آپس میں نہ لڑو بلکہ ایک دوسرے کی خدمت

کرو۔ ہم میں امیر غریب چھوت اچھوت آقا غلام نہ ہونا چاہیے۔ میری اولاد میں بڑے بڑے فلسفی سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا، بابا جان، تم اچھے زمانے کی پرانی نشانی ہو، آثارِ صنادید کے طور پر اپنے مکان میں محفوظ رہو۔ وہاں آپ کے دیدار فیض آثار سے بہرہ اندوز ہو لیا کریں گے۔ یہ سادہ لوح عقلمندوں کی دُنیا میں کیوں آباد ہیں۔ کمزور طاقتوروں کے پڑوس میں کیوں رہتے ہیں، بلّی کے پاس چوہا بسیرا کرے گا تو جان گنوائے گا۔ سانپ کے بل میں مینڈک جائے گا تو ہضم ہو جائے گا۔ یہ آئینِ عالم اور سنّتِ باری تعالیٰ ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جائے اور بڑے پیڑ کے پاس چھوٹا پودا پلنے نہ پائے۔ عقل دامِ مکر بچھاتی ہے، فریب سے سادہ لوح کو بلاتی ہے اور پھانس لیتی ہے۔ عقل کی غیر مساوی تقسیم کا ذمہ دار خدا ہے۔ خدا کے قانون کے خلاف اعتراض باباجان ٹھیک نہیں۔ تم پہلے بھی نافرمانی کر کے بہشت سے نکلے تھے۔ ہمیں تمہاری طرف سے اب بھی یہی احتمال رہتا ہے کہ خدا کے قانون کی اصلاح کی سعی میں کوئی اور دُنیا آباد کرنے کا پاسپورٹ نہ لے لو۔

یہ بزرگ پہلے نافرمانی کر کے سزا پا چکا تھا۔ یہ تقریر سُن کر ڈر گیا اور معتکف ہو کر اللہ اللہ کرنے لگا۔ تھوڑی ہی مدت میں گنہگاروں نے نیکوکاروں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، زرداروں نے ناداروں کو فوج میں بھرتی کر کے لڑائیاں شروع کیں۔ بہشت میں موت کا گزر کہاں مگر خوب سر پھٹول ہوئی۔ حالات سے تنگ آ کر نیکوکاروں نے متفق ہو کر خدا سے شکایت کی کہ بارِ خدایا دُنیا میں جنت

کے سبز باغ دکھا کر اب عجیب مصیبت میں پھنسایا اور دُنیا اور آخرت دونوں جگہ آرام ہم غریبوں پر حرام رہا۔ اپنے نام کا واسطہ اپنا وعدہ پورا کر۔ حکم ہوا کہ آدم کی پیاری اولاد ہم نے بہشت کی خوبصورت بستی صرف تیری آسائش کے لئے بنائی تھی۔ مگر تیرے باپ کی محبتِ پدری نے گوارا نہ کیا کہ کچھ بچے سزا اُٹھائیں اور کچھ سُنہری خوبصورت بستی کی سیر کریں۔ لامحالہ تمہارے حق میں سے ان کو حصہ دیا گیا۔ اب اُنہوں نے تمہیں بالکل محروم کر دیا۔ تم اسی طرح روتے اپنے جدِ امجد کے پاس جاؤ، اسے لے کر جلدی مشرق کی سمت ہجرت کر جاؤ۔ عنقریب یہ جگہ آگ کا سمندر بنا دی جائے گی۔ یہاں سے ایک گنہگار ہستی بھی رہائی نہ پائے گی۔ چنانچہ سب نیکوکار وہاں سے چل دیئے۔ گنہگاروں نے خوشی کے نعرے لگائے جس طرح رشتہ دار کی موت پر املاک میں اضافہ بعض شقی القلب انسانوں کی مسرت کا باعث ہوتا ہے وہ بھی نہال ہو گئے کیونکہ اب ان میں سے ایک ایک کی املاک میلوں تک پھیل گئی تھیں مگر حریص کی چشمِ تنگ کو صرف قناعت پُر کر سکتی ہے باوجود اضافہ ملکیت کے حرص اور بڑھی۔

بھلے بُرے آدمیوں کی مشترکہ آبادی میں نظام کا قیام اور قانون کا احترام ممکن ہے۔ مگر خالص مجرموں کی بستی کا قیاس کرو۔ جہاں ایک بھی نیک عمل اور نیک نیت نہ ہو وہاں امن اور قانون کی کیا کیفیت ہو گی۔ جب سب نیکوکار وہاں سے ہجرت کر گئے تو وہاں ایک قیامت بپا ہوئی، کوئی برائیوں کو روکنے والا نہ رہا۔ آرام طلبوں کی بستی میں فصل کون بوئے، کس کس چیز سے بچائے۔ باپ بیٹے کو اندر سے کوئی چیز اُٹھانے کے لئے کہے تو وہ چیز تو اُٹھا کر

لا دیتا مگر ایک آدھ اور چیز بھی ساتھ ہی چرا لیتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کی چیز چرانے جاتا تھا واپس آتا تو اپنی گم پاتا تھا۔ دوست دوست سے ملنے آتا۔ آنکھ بچی تو کوئی چھوٹی موٹی چیز بغل میں دبا کر نکل جاتا۔ جب دوسرا محبّت سے مجبور ہو کر جاتا تو بھی وہ آتا آتا کچھ نہ کچھ جیب میں ڈال لاتا تھا۔ غرض تحفہ تحائف سے دوستوں کا دل خوش کرنے کی بجائے چوری چکاری سے احباب کی طبیعت مکدر ہوئی۔ کسی کو کسی پر اعتبار نہ تھا۔ بہن بھائی کی محبت اور شفقت افسانہ ہو گئی۔ بہن بھائی کے جانے یا بھائی بہن کے آنے ایک دوسرے کو سرقہ کا گمان ہوتا تھا۔ کیونکہ میل ملاپ محبّت پر مبنی نہ رہا تھا۔ جہاں ذرا سی تکرار ہوئی وہاں لوگ بھاگے جاتے۔ جھگڑا چکانے کی بجائے فریقین کو بھڑکاتے اور اُکسا اُکسا اور چمکا چمکا کر لڑاتے تھے۔ بازاروں میں ہر وقت جوتا چلتا تھا۔ راہ گزروں کی پگڑیوں پر چپکے سے چھیچھڑے رکھ دیتے تھے۔ چیلیں جھپٹتی تھیں، پگڑیاں اچھلتی تھیں، بے عزتی کے اس نظارے سے سب خوش ہوتے تھے۔ چلتے چلتے بے خبری میں دھول مار کر بھاگ جانا تو معمول تھا خوشی اور محبّت سے رنگ نہ اُڑاتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے اُوپر غلاظت گراتے تھے ایک محلّے سے دوسرے محلّے تک جانا گویا منزلوں کی مسافت طے کرنا تھا۔

فصلیں تباہ، باغ ویران، بازار بے رونق ہو گئے عورتیں تو کجا مردوں کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا یوں تو سب کے سب مصیبت میں مبتلا تھے مگر شرارت سے باز پھر بھی نہ آتے تھے ایک دوسرے پر مل کر ڈاکہ ڈالنے والے تو سب تھے لیکن مل کر مدافعت کرنے والا ایک نہ تھا۔ رات کی نیند اور دن کا آرام سب پر حرام تھا تاہم کوئی کلمۂ خیر

کہنے والا نہ تھا۔ کوئی طاقتور کمزور کو مارتا تو وہ کمزور ایک کمزور تر راہگذر کو پکڑ پچھاڑتا
جو بلہر مار کھا کر گھر جاتا۔ وہ بچاری بیوی پر ہاتھ اُٹھاتا۔ غصہ کی آگ کو بے موقعہ
طاقت کے استعمال سے فرو کرتے لیکن صبر نہ کرتے تھے۔

نئی بہشت

ادھر کرم خداوندی نے سمت مشرق میں ہمیں ایسی سرزمین عطا کی۔ جس کی
زرخیزی قوت بیان سے باہر تھی نیکو کاروں نے آہستہ آہستہ اس کو آباد کیا
جنگل کو کاٹ کر گلزار بنایا، زمین کا جگر چیر کر نہریں نکالیں۔ سونے کے پہاڑ توڑ
کر فرش بچھایا۔ لعل و یاقوت کی سلیں نکال کر مکان بنائے۔ درختوں اور پودوں میں
نشوونما کا یہ عالم تھا کہ جتنا کاٹو توڑو اتنا بڑھتے تھے۔ کچھ طبیعتوں میں قناعت کچھ
پیداوار کی فراوانی۔ محبت کے سلوک اور مشقت کی عادت نے مل جل کر نئی بہشت بسائی
یہاں فتنہ فساد کا نام نہ تھا، خدمت اور انسان کی کوشش نے ہر دل کو غم سے
دور اور خوشیوں سے معمور کر رکھا تھا۔ اس دنیا کا نام بعض نے سُنہری دُنیا رکھا بعض
اس کو اسی پرانے محبوب نام پر بہشت کہتے ہیں۔ یہ جگہ خلد اور جنت کے ناموں سے
مشہور ہے۔ پرانے بہشت کے سرمایہ دار اور حکومت پسند باشندوں کی حریص نگاہیں
ہماری طرف اُٹھنا شروع ہوئیں۔ پرانے بہشت کی عام آبادی چاہتی تھی کہ ان کے
اپنے مشاغل میں فرق نہ آئے مگر ہمارے پسینے کی کمائی لُوٹ کھائیں۔ نئے بہشت
کی نیکو کار آبادی پر خوف دہراس چھا گیا۔ سلب آزادی اور غصب املاک کا یقین ہو گیا

دوزخ کیونکر تیار ہوا

اُنہوں نے زاری والحاح سے دُعا مانگی جو منظور ہوئی اور حکم ہوا کہ مطمئن رہو

اب یہ شرارت کا موقعہ نہ پائیں گے، اور تم پر ہاتھ نہ اٹھائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پرانے بہشت کے تاجداروں کے نئے بہشت کے متعلق دو گروہ ہو گئے ان میں سے ہر ایک ہم پر مسلط ہونا چاہتا تھا۔ پرانے بہشت والے نئے بہشت کی تقسیم پر متفق نہ ہو سکے۔ بلکہ ہم پر چڑھائی کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے گرد ہو گئے۔ سائنس والوں نے ہلاکت خیزی کے سامان ایجاد کئے۔ اژدر دہاں توپوں نے آگ اگلنا شروع کی۔ گولیوں کی چادریں برسیں۔ زہریلی گیسوں سے کرۂ ہوائی کو مسموم کر دیا گیا۔ طرفین نے آنکھوں سے پانی جاری کرنے اور ناک سے خون رواں کرنے والے دھوئیں چھوڑے ہوتے تو ایک ہی دفعہ مقدر ہے سو آ چکی تھی اسی لئے باوجود ہلاکت سامانیوں کے موت واقع نہ ہوتی تھی۔ مگر پرانے بہشت کی ساری آبادی مبتلائے مصیبت ہو گئی۔ صلح، عفو، سلوک محبت احسان تو انہوں نے دنیا میں نہ سیکھا تھا۔ اب ان سے اس کی امید کیا تھی۔ کوئی فریق مر کر ختم نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہر روز ایک دوسرے کے لئے نئی اذیت کی صورت سوچتے تھے۔ دم گھٹنے والی گیسوں نے دو طرفہ ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ موت مانگتے تھے مگر موت کسی کو میسر نہ تھی لامحالہ پیش از پیش تندہی سے یہ گناہگار مصروف بیکار ہو جاتے تھے، ہر فریقین نے آتشگیر مادہ اور زہریلی گیس کی آمیزش سے سانپ اور بچھو بنائے جو جسم کے ساتھ چھو کر چھٹ جاتے تھے۔ آتشگیر مادے سے زخم ہوتا گیس زخموں میں زہر بھر دیتی تھی اور ساری عمر وہ ناسور رستا رہتا تھا۔ جوں جوں مہینے سال صدیاں گزرتے گئے آلات ایذا رسانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ انتقام انتقام ہر شخص کی زبان پر

تھا۔ یہی وہ جذبہ ہے جو دُنیا میں گنہگار کے دل میں پرورش پاتا ہے۔

اوّل اوّل تو نئی بہشت بسانے والوں کو اندیشہ رہا کہ شاید وہ باہمی جنگ سے اُکتا کر ہمارے درپئے آزار ہوں، بالآخر یقین آگیا کہ شریروں میں صلح ممکن نہیں۔ دُنیا میں اُنہوں نے فساد میں خوشی حاصل کی تھی۔ وہ جب تک زندہ ہیں ایک دوسرے کی موت کے سامان ڈھونڈتے رہیں گے۔ غرض جُوں جُوں مدّت گزرتی گئی آتش انتقام بھڑکتی گئی ،عناد کے شعلے زیادہ زیادہ بلند ہوتے گئے، انسانی عقل نے ایذا رسانی کی اختراع میں کمال کر دکھایا رال اور پہاڑوں کے پتھروں کو مِلا کر مشینوں کے ذریعہ پگھلایا اور دریا کے پانیوں کی طرح مخالفوں کی طرف بہایا۔ جو جو اس کی لپیٹ میں آیا اس کی جلد جلی چربی نکل آئی۔ یہ کیمیائی مادہ اتنا تیز رو اور کھولتا اُبلتا جاتا تھا کہ دُور سے دیکھ کر ڈر آتا تھا۔ یہ لاوا بہ کر نشیب میں آیا پہلے ایک چھوٹی جھیل بنی پھر بڑھ بڑھ کر خلیج ہوگئی۔ آخر لاوے کا سمندر متلاطم ہوا تاہم طرفین کی آتش انتقام فرو نہ ہوئی۔ طرفین کے ارباب عقل اور صاحب علم سائنسدانوں نے اور غضب ڈھایا کہ اس لاوے میں پانی سے زیادہ رقیق ریڈیم کی قسم کے جوہر مِلائے جس سے وہ مادہ مستقل طور سے سیال اور اُبلتا کھولتا بہنے لگا اور برف باری میں بھی اس کا ٹھنڈا ہونا ممکن نہ تھا۔ ان کی ضرر رسانیوں اور ستم کوشیوں نے یہ صُورت اختیار کی کہ اسیران جنگ کو اس آتشیں سمندر میں گرانا شروع کیا۔ گرنے والوں کے مُنہ سے آہ وُ بکا نکلتی تھی۔ شور و غغاں سے قیامت برپا ہوتی تھی، مگر ان کے حال پر کسی کو رحم نہ آتا تھا کیونکہ رحم

کرنا تو ان میں سے ایک نے بھی نہ سیکھا تھا۔

جلد جلی، چربی نکلی، چربی پگھلی۔ پنجر رہ گیا۔ گویا وہ مقام چلتے پھرتے مُردوں کا پُرانا میوزیم تھا۔ ان کو دیکھ کر انسان کو خوف آتا تھا۔ جسم کی ہڈیوں اور رگ وریشہ میں عجب خاصیت پیدا ہوگئی تھی کہ اُس آگ سے اس پر اثر نہ ہوتا تھا۔ ان اسیرانِ جنگ کی عناد پرور طبیعت میں آگ میں پڑ کر بھی خیال جنگ و جدل جاری رہا۔ دھاڑیں مار مار کر ایک دُوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے، چیختے چلاتے کاٹ کھانے کو آتے تھے۔ پہاڑوں کے سب پتھر پانی کی طرح بہ نکلے۔ قریباً ساری وہ زمین لاوے سے پٹ گئی۔ کل آبادی تدریج آگ میں ڈال دی گئی۔ چند تنومند طرفین سے بچ رہے۔ ان کی صُلح اِس بات پر ہوئی کہ اہلِ نار سے جنگ جاری کی جائے اور ان میں سے کوئی باہر نکلنے نہ پائے۔ اہلِ نار بھی اب آگ کے کیڑے ہوگئے اور نار کو گلزار سمجھنے لگے تھے۔ وہ اسی حال میں خوش تھے۔ جب کبھی آتشی آبادی میں سے کوئی باہر آنا چاہتا تو باہر کے باشندے لمبے نیزوں سے حملہ آور ہوتے اور پھر آگ میں دھکیل دیتے، یہ اُن کی مرغوب تفریح اور کھیل تھا۔

دارُالاِصلاح کیونکر بنا؟

ان شریروں کی مفسدہ پردازیوں سے قطع نظر نئے گنہگاروں کا سوال درپیش تھا۔ سعید ارواح تو فوراً بہشت میں داخل ہو جاتی تھیں۔ مگر پلید انسانوں نے عالمِ اجسام سے آکر مزید مہلت طلب کی اور عادات کی اصلاح

کا مزید موقع چاہا۔ خدا کی انصاف پسندی کا اقتضا یہی تھا کہ جب پرانی بہشت میں پلید اور سعید دونوں کو یک جا رہنے کا موقع دے کر اصلاح حال کی مہلت دی تو نئے گنہگاروں کو سزا کے قبل مہلت دی جائے۔ مزید برآں بہشت کے نیکو کاروں کی استدعا یہ تھی کہ مہلت اور موقعہ کی صورت مدرسہ کی ہو جہاں مختلف طریقوں سے باہمی محبت اور سلوک سے رہنے کی عادت پیدا کی جائے، اور دُنیا کی بُری عادتیں چھڑائی جائیں باوجود اس سعیٔ نیک کے اگر وہ اصلاح پذیر نہ ہوں تو انہیں مناسب سزا دی جائے۔ نیکوں کی یہ دُعا قبول ہوئی اور یہ جہان آباد ہوا تا کہ لوگوں کی بد عادات کو چھڑایا جائے اور انہیں بہشت میں رہنے کے قابل بنایا جائے۔

حضرت آدم کی مکرّر تقریر

اے میرے پیارے عزیز بچو! تم نے یہاں آ کر دیکھ لیا کہ وہ لوگ جو دُنیا میں عمل بد سے نادم ہو جاتے ہیں وہ یہاں آ کر بہت جلد ترقی کرتے ہیں، جو دُنیا میں بغیر توبہ کے مرتے ہیں یا افعال قبیح پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ وہ یہاں آ کر لمبی مدت پابندی اُٹھاتے ہیں اور اکثر باوجود کوشش کے اصلاح نہیں پاتے جو یہاں سے مردود ہو کر جاتے ہیں، وہ پرانی بہشت میں ڈالے جاتے ہیں جس کو انسانوں نے ہی اپنی عقل و محنت سے دہکتی آگ کا گہرا سمندر بنا دیا۔ اس پرانے بہشت کو نیکو کاروں نے دوزخ کا نام دیا ہے۔ ناری نے اس کو جہنم بنا دیا ہے۔ اے میری پیاری اولاد، اس

جہنم کی آگ سے بچو۔ جو روح اور جسم دونوں کو جلاتی ہے۔ کیا تم میں سے ایک بھی ایسا ہے جو دوزخ کی زندگی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے؟ تم اپنی زبان سے جواب نہ دو مگر میں صورتوں سے حالِ دل کا اندازہ لگاتا ہوں اور جواب نفی میں پاتا ہوں۔ صفائی صحت کے اصول محبت اور پیار کا سلوک سیکھو تاکہ بہشت کے دروازے جو نیکوکاروں کی بستی ہے تمہارے لئے کھول دیئے جائیں۔

یاد رکھو کوئی فتنہ فساد کا خوگر یا محنت سے جی چرانے والا یا غیر کا حق دبانے والا اب وہاں نبھا سکے گا۔ گندی عادتوں سے اس خوبصورت دُنیا کو بدنُما بنانے کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی۔ اس لئے دِل لگا کر بہشتیوں کے اوصاف پیدا کرو اور اس آخری موقعہ کو ضائع نہ کرو۔ تم اپنے لئے نہیں بلکہ غیروں کے لئے زندہ رہنا سیکھو۔ خادم بنو مخدوم نہ بنو۔ جس سے واسطہ پڑے اُس سے خوش خلقی کا برتاؤ کرو، حسنِ معاملہ، حسنِ سلوک سے کام لو۔

اصحابِ جنّت

جب تم بہشت میں آؤ گے تو وہاں کے باشندوں کا عجب حال پاؤ گے۔ پریم کی رس بھری باتوں سے دِل لبھاتے ہیں۔ محبت بار آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی بڑھانے کی سعی میں رہتے ہیں صبح پھولوں کے خوبصورت دستے ایک دوسرے کے گھر لے جاتے اور تحفے تقسیم کرتے ہیں۔ اگر کبھی برسوں کی کاوش کے بعد کوئی مفید ایجاد کرتے ہیں، یا کوئی کتاب لکھتے ہیں تو دوستوں یا ہمسایوں کے نام معنون کر دیتے ہیں۔ نئے سے نیا پیوند لگا کر بہشت میں رنگا رنگ کے نئے پھول پیدا کرتے ہیں اور عزیزوں کے

نام پر پھولوں کا نام رکھتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ دوسروں کی خوشی اور تفریح کا سامان پیدا کیا جائے۔ وہاں ایک بھی کاہل یا سست فقیر یا حیلہ بہانہ سے دوسروں کا حصّہ غصب کرنے والا سود خوار مہاجن موجود نہیں، سب خدا کی زمین پر محنت کر کے کھانے والے ایک دُوسرے کو سُکھ پہنچانے والے ہیں۔ اس لئے وہاں خالص شہد اور تازہ دُودھ کی روانی ہے باوجود اشیائے خورد و نوش کی افراط کے ایک شخص ایسا نہیں جو ایک دن بھی بے کار بیٹھے۔ بڑھاپا، بیماری جو تفکرات اور ناموزوں آب و ہوا کا نتیجہ ہے وہاں نام کو نہیں، ہر شخص جوان تندرست خوبصورت ہے۔ وہاں کا پانی صحت زا، ہوا فرحت افزا ہے، جدِّ امجد ہونے کی رعایت سے صرف مجھے بزرگی عمر کی ظاہری نشانیوں سے ممتاز رکھا گیا ہے۔ میری اولاد کا ہر فرد سبزہ آغاز جوان ہے۔ وہ کون ہے جو وہاں رہنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔

میرے بچّو! تم جواب اثبات میں نہ دو۔ تمہارے چہرے تمہارے دل کی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ صاف عیاں ہے کہ تم صدقِ دِل سے اسی پاکیزہ مقام میں رہنا چاہتے ہو۔ اس لئے پیارے بچّو۔ بہشتیوں کی عادات سیکھو ہر وقت دِل میں بھلائی کا خیال رکھو۔ بُرے خیال کو پاس نہ آنے دو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہو۔ وہ غفور و رحیم تو تمہیں اب بھی بخشنے کے لئے بیتاب ہے اور تم پر رحم کرنا چاہتا ہے مگر سابقہ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان اپنے بھائیوں کو بخشنے اور ان پر رحم کرنے پر آمادہ نہیں۔ تم میں سے جس پر بخشش و رحم کا یقین ہو جاتا ہے اُسے فوراً بہشت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ لیکن آہ میری اولاد میں سے

بعض کو غیروں پر تو کیا اپنے اوپر رحم نہیں آتا۔ وہ باوجود عقوبت کے یقین کے عادات بد کی اصلاح نہیں کرتے۔ وہ بخشش اور رحم چاہتے ہیں مگر اپنے بھائیوں پر بخشش اور رحم نہیں کرتے۔ تم خود شہادت دو کہ اگر دوبارہ گنہگار اور نیکوکار ایک جگہ اکٹھے کر دیئے جائیں تو پھر کیا کیا قیامت برپا نہ ہو جائے۔ اس وقت تم کس قدر آرام اور صبر و تحمل سے بیٹھے ہو۔ اگر یہاں کی نا ترقی یافتہ آبادی یعنی دُنیا کے نو وارد گنہگار تم میں شامل کر دیئے جائیں تو اپنی جگہ پر بیٹھنا اور ایک لفظ سُننا مشکل ہو جائے۔ اگر اس جہاں میں آنے کے ساتھ ہی پابندیاں ہٹا دی جائیں تو یہ دُنیا بھی نمونۂ دوزخ بن جائے۔

دوبارہ عفو

تم خود کہو ایسے حالات میں کیا کیا جائے۔ اہلِ جنّت یوں تو سب فقر و فاقہ سے مامون و مصئون ہیں مگر اہل دوزخ کی بدحالی سے بحالتِ زار اور تمہاری پابندیوں سے بے قرار ہیں اپنے بھائیوں کے حال کا اندازہ کر کے بہشت دوزخ ہو رہی ہے۔ اب پھر سوچ رہے ہیں کہ خدا سے عفوِ عام کی استدعا کی جائے اور گنہگار بھائیوں کے ساتھ رہ کر ان کے اصلاح حال کی کوشش کی جائے لیکن ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ آج آپ کو یہ بات سُنانے آئے ہیں۔ تم خود اپنی آبادیوں میں یہ بات جا کر پہنچاؤ۔ لوگوں کی رائے طلب کرو، ہم موقعہ مناسب پر پھر آئیں گے اور استفسار کریں گے۔

اے گنہگارو! نیکوکاروں کو تمہاری بھلائی کا جو خیال ہے اس کا ہزارواں حصّہ بھی تمہیں ان کا لحاظ ہو تو بہشت میں نباہ ہو سکتا ہے۔ عفوِ عام

کا حال جو دیکھا اس سے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں پھر عفوِ عام ہو جائے اور تم ہیں فساد و عناد کی آگ بھڑک اُٹھے تو بہشت بھی دوسرا دوزخ بن جائے اور نیکو کاروں کو کوئی اور بستی بسانی پڑے، پھر اس بزرگ نے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھایا۔ چشمِ پُرنم سے آسمان کی طرف دیکھا اور پکارا۔ اے خدا میری اولاد پر رحم فرما۔ ان کو امن، انصاف، محبت اور پیار سے رہنے کی توفیق دے تاکہ ہمیشہ تک بہشت میں تیرے انعامات سے شادکام ہوں۔ آمین آمین۔

ہم سب دُعا میں شامل ہوئے۔ یکسوئی کے لئے آنکھیں بند کیں۔ زور سے آمین کہی۔ آنکھیں کھولیں تو وہ سب حضراتِ کرام جا چکے تھے۔ ہمارے مجمع میں سے ایک صاحب اپنی کرسی پر کھڑے ہو گئے۔ چند کلمات گوش گزار کرنے کی اجازت چاہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر کے لئے اجازت طلبی کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ آج سے پہلے یہ جسارت کسی نے نہ کی تھی سب خاموش تھے۔ وہ خاموشی کو نیم رضا سمجھ کر بولا:۔

دوبارہ عفو کی مخالفت

اے احباب و اصحاب تم نے پاک طینت جنتیوں کی کرم فرمائیوں کو دیکھا کہ دُنیا اور آخرت دونوں جگہ ہم گنہگاروں کے ہاتھ سے زخم خوردہ ہونے کے باوجود نہ صرف ہماری فلاح و صلاح کے لئے بیتاب ہیں بلکہ ہمارے گناہوں کی کامل معافی کے خواستگار ہیں اور تم نے اپنی حالت کا اندازہ کیا کہ کس بے تکلفی سے ہم سب نے عفوِ عام پر دلی مسرت کا اظہار کیا۔ حاشا اگر اہلِ شفاد ہمارے لئے بیتاب نہ ہوتے تو وہ بہشت کے انعامات کے مستحق نہ ٹھہرتے

اور اگر ہم خود غرض نہ ہوتے تو اس جہان کی مصیبت اور آفت میں نہ پھنستے۔ اصحابِ خلد کی سب سے بڑی نشانی ان کی قربانی ہے اور اصحابِ نار کا طغرائے امتیاز اِن کی خود غرضی ہے۔ ہم کو خود غرضی سے مجبور ہو کر بہشت میں جانا نہیں چاہئے (بہت سی آوازیں "ہرگز نہیں") تم "ہرگز نہیں" کہتے ہو۔ بہت اچھا۔ کیا تمہیں یہ گوارا ہے۔ اگر آج ہی وہ بلائیں جو یہاں نظر بند ہیں ان کے دروازے کھول دیئے جائیں (بہت سی آوازیں "ہرگز نہیں") تو خدارا بتاؤ اگر عفوِ عام ہو گیا تو نئی جنت میں یہ خبیث ان طیّب روحوں سے کیونکر نباہ کریں گے۔ کیا وہ جگہ بھی جلدی نمونۂ دوزخ نہ بن جائے گی (بہت سی آوازیں "سچ ہے") اس لئے ہمیں صاف کہہ دینا چاہئے کہ ہم اپنے آرام کے لئے اہلِ جنت کو تکلیف میں پھنسانا نہیں چاہتے ("ٹھیک ہے" "غلط ہے" کی گوناگون آوازوں سے طوفان اُمڈ آیا۔ آپس میں ہاتھا پائی کی نوبت پہنچ گئی۔ اس نے پھر تقریر آغاز کی)۔ اہلِ جنت میں صبر و تحمل ہے۔ آپ کو اپنی رائے کے خلاف بات سُننا گوارا نہیں۔ اگر یہی عادتیں لے کر بہشت میں جاؤ گے تو اُمید ہے کہ بات بات پر تکرار ہو گی اور بے چارے اہلِ جنت کو جاتے ہی آزادیٔ تقریر سے محروم کر دو گے۔ (پھر "ٹھیک ہے" کا شور ہوا) اس لئے ہمارے لئے مناسب یہ ہے کہ عفوِ عام کے خیال سے درگزریں (پھر "ہرگز نہیں" "بے شک" "درست ہے" "غلط ہے" آوازیں آئیں۔ بعض جگہ دھینگا مُشتی تک نوبت پہنچی۔ بیچ بچاؤ سے امن بحال ہوا مگر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجمع منتشر ہونے لگا تو مہمانوں کو الوداع کہنے کا خیال آیا اور ان پر پھول برسا کر رخصت کیا اور ہم بھی گھر لوٹے۔

رات سوچ بچار میں گزری۔ صبح جب سیر کے لئے دونوں ملاقی ہوئے تو سرگزشت دیروزہ پر بحث ہوئی۔ ہم دونوں اس پر متفق ہو گئے کہ نیکوکاروں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی صلاحیت ہم میں ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر عفوِ عام ہو بھی گیا تو یہ بہشت بھی دوزخ بن جائے گی یا کم از کم دُنیا کی سیاسی ابتری ضرور پیدا ہوگی۔ دُنیا میں نیکوکاروں نے ہم گنہگاروں کے لئے کیا کیا سر نہیں مارا۔ مگر سعی ناکام رہی گویا ہر نیکی کی تحریک خطرناک بدی پر ختم ہوئی۔ کل دیکھا کہ اُمتوں کے یہ سردار آپس میں کس طرح ایک دوسرے کی عزت و احترام کرتے ہیں اور محبت اور پیار سے رہتے ہیں مگر دُنیا میں ان کے پیرو نہ صرف ایک دوسرے پر اعتراض کرنے اور جھٹلانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں بلکہ ہوشیار لوگوں نے مذہب کو ظلم کی آڑ بنا لیا ہے۔ غرض کئی روز اس واقعہ کا چرچا اور ذکر رہا۔

ہم پر تنگی کا زمانہ گزر گیا۔ نقل و حرکت میں اور آزادی ہوئی۔ اپنی بستی کے علاوہ دوسرے مقامات میں آنے جانے کی سہولتیں بھی پیدا ہو گئیں تنگی کے بعد فراخی کے دن گزرتے نہیں۔ بھاگتے ہیں۔ پوری خوشی اور عین عیش میں تو وقت بھاگتا نہیں اُڑتا جاتا ہے۔ ان دنوں باتوں میں وقت کٹتا۔ لیٹتے تو صبح اُٹھتے چلتے پھرتے شام ہو جاتی تھی۔ اس واقعہ کو سال گزر گیا۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ماجرا کل گزرا ہے۔ پھر یوم وداع آیا۔ پھولوں کی جستجو ہوئی۔ کپڑوں میں خوشبو لگائی۔ خوشی خوشی روانہ ہوئے۔ انسان بالطبع شوقین ہے۔ اس کی جدت پسند طبیعت نت نئے ہنگاموں کو چاہتی ہے۔ متانت مآب زاہد اکثر مذہب کی خشک راہوں سے

اُکتا جاتا ہے۔ تو رندانہ گرم جوشیوں پر اُتر آتا ہے۔ سابقہ یوم وداع کے غُل غپاڑہ کی زبان خواہ کتنی مذمت کرے مگر دل اس کی تکرار چاہتا تھا۔ چنانچہ شکاری کا شوق اور تماشبین کی اُمنگیں لے کر وہاں پہنچے مہمانوں کی آمد و رفت تو معمولی بات تھی اس کا ذکر خالی از دلچسپی ہے۔ البتہ یہ معلوم کر کے اطمینان ہُوا کہ سب اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس جہان میں تزکیۂ نفس کے بغیر بہشت میں جانا مناسب نہیں مبادا اہلِ حق ہم سے ناحق تنگ ہوں۔ اب جب لوگوں نے اس شخص کی صحتِ کلام پر آپس میں اتفاق پایا تو نگاہیں اس کے لئے متجسّس ہوئیں۔ اُسے مجمع میں سے ڈھونڈ نکالا۔ دو کلمے بیان کرنے کی استدعا کی وہ شاید یہی چاہتا تھا فوراً تیار ہوا۔ لوگ گوش بر آواز ہوئے۔ وہ بولا:۔

صاحبو! میں خوش ہُوں جو کل میری رائے تھی وہ آج آپ کی ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ میں جنّتیوں کی سی طبیعت پیدا ہو گئی ہے۔ اہلِ خلد کی صفت مشترک یہ ہے کہ اپنے آرام کو دوسرے پر قربان کرتے ہیں۔ خود مصیبت اُٹھاتے ہیں دوسروں کو دُکھ نہیں دیتے۔

اِصلاح نایافتہ رُوحوں کی رائے

مَیں نے اس عرصہ میں نظر بند بھائیوں کی رائے معلوم کی تو اُنھوں نے بلا استثنائے احدے سُنہری دُنیا میں جانے کے لئے بیتابی ظاہر کی۔ آپ میں اور اُن میں یہ اختلافِ رائے قدرتی ہے۔ انہیں گناہ کی دُنیا سے

آئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ تمہیں تزکیۂ نفس کی کوشش میں ایک عرصہ ہو چکا ہے اس لئے وہ خود غرضی کے خیال کو دل سے دُور نہیں کر سکے۔ لیکن ہمیں اُن پر ملامت کی بجائے رحم کرنا چاہیئے۔ وہ ہمارے مصیبت زدہ بھائی ہیں۔ آؤ مل کر ہم سجدے میں گر جائیں اور رُوٹھے خدا کو منائیں تاکہ جلدی ہمارا اور ان بھائیوں کے نفس کا تزکیہ ہو جائے اور ہم اہلِ جنت کے ساتھ امن و آشتی سے رہنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ کہا اور وہ سجدے میں گر گیا۔ ہم سب ساتھ ہی خاک بوس ہوئے۔ سجدے میں دیر ہوئی۔ میں نے دل برداشتہ نمازی کی طرح ذرا سا سر اُٹھا کر دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ لوگ برابر سجدے میں پڑے تھے۔ پھر اسی ڈر سے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے میں پھر سجدے میں گر پڑا۔ ہم دیر تک سجدے میں رہے۔ پھر خاک سے سر اُٹھایا۔ نامۂ اعمال کو پڑھا۔ اس پر یہ لکھا ہُوا پایا:۔

"وہ دُعائیں جو غیروں کی بھلائی کے لئے کی جائیں اور وہ کام جو دوسروں کے فائدے کے لئے کیا جائے خالی از اثر نہیں۔ تمہاری دُعائیں منظور ہوئیں اگر تمہارے نظر بند بھائی آپس کے گناہ معاف کریں اور ایک دوسرے کو بخش دیں تو بہشت کے دروازے ان پر کُھل جائیں۔ یاد رکھو خدا کسی سے نہیں رُوٹھتا انسان خدا سے رُوٹھتا ہے اور روگردانی کرتا ہے۔ دُنیا میں خود بُرے عمل کرتا ہے، الزام شیطان پر دھرتا ہے، عاقبت کا راپنے لئے خود دوزخ تیار کرتا ہے اس کو قہر خداوندی کی طرف منسوب کرتا ہے۔ تم میں سے دس آدمی جاؤ، گنہگاروں سے یہ بات منواؤ کہ وہ ایک دوسرے کے گناہ بخش دیں۔"

جونہی یہ نوشتہ دیکھا۔ اللہ اکبر کا نعرہ بے ساختہ میری زبان پر آیا۔ مُبارک مُبارک کا شور اُٹھا۔ سب خوش تھے مگر وہ شخص سر جُھکائے گہری سوچ میں کھڑا تھا آخر وہ آنسو بھر کر بولا! صاحبو! اس نامبارک خبر پر کیا مبارکباد پیش کرتے ہو۔ اگر عفو کی عادت ان لوگوں میں ہوتی تو یہ دُنیا آباد کیوں ہوتی۔ یہ سیدھے بہشت کو جاتے۔ اپنے مخالف پر رحم اور اس کی فلاح کی خواہش صرف اعلیٰ لوگ کر سکتے ہیں۔ گناہگاروں سے یہ توقع بے سُود ہے۔ سب نے اس خیال سے اختلاف کیا۔ آخر قرار پایا کہ ایک سال تک ان کو سمجھاؤ اور اس ڈھب پر لاؤ کہ وُہ اُس بدسلوکی کو جو اُنہوں نے دُنیا میں باہم روا رکھی بھول جائیں اور ایک دُوسرے کو معاف کر دیں۔

چنانچہ دس آدمی ایسے چُنے گئے جن کی اپنی مُدتِ قید اب بہت تھوڑی باقی تھی اور جنہیں نقل و حرکت کی پُوری آزادی تھی۔ ان کے سپرد یہ خدمت ہوئی کہ وہ لوگوں کے پاس جائیں اور سب کو سمجھائیں کہ بھائی تمہاری رہائی اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس مصیبت کو یاد کرو اور آئندہ محبت سے رہنے کا عہد کرو۔ ایک دوسرے سے گلے ملو۔ بہشت میں جانے والے مہمان اہلِ جنت کو بتائیں کہ ابھی وہ ہمارے لئے کوشش نہ فرمائیں بعدازیں ہم بہشت کے محترم مسافروں کو الوداع کہہ کر واپس آئے ہیں دیر تک سوچتا رہا کہ کون دیوانہ گنہگار ہوگا جو اس بہتریں موقعہ سے فائدہ نہ اُٹھائے گا اور دوسروں کو معاف کر کے اپنی نجات حاصل نہ کرے گا۔

میں رات کو سونے کے لئے لیٹا اور عشرت جہان کے بہکانے اور مجھے اس مصیبت میں پھنسانے کا خیال آیا تو آتشِ انتقام بھڑکی سوچا کہ اب

اُسے تو سیدھا جہنم پہنچاؤں۔ یہ خیال آیا تھا کہ میں اس شخص کی صداقتِ کلام کا قائل ہو گیا۔ اور دل سے کہا کہ اے دل اتنی مدت کے تزکیۂ نفس کے بعد تیری یہ حالت ہے، تو جن کے زخم تازہ اور طبیعت ابھی بدستور خراب ہے، ان کی کیفیت کیا ہو گی چنانچہ یہی نتیجہ ہوا۔ آئندہ یوم وداع پر جو ہم اکٹھے ہوئے تو منتخب احباب نے رپورٹ پیش کی کہ نظر بند احباب نے تنگ نظری کا ثبوت دیا اور کہا کہ ہم بھی مصیبت میں مریں گے مگر اپنے ستانے والوں سے درگزر نہ کریں گے کیا ہمارے دشمن یونہی چھوٹ جائیں۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ تم بھی تو دکھوں سے نجات پاؤ گے۔ تم اپنے ستانے والوں پر رحم کرو جو تمہارے ہاتھوں سے ظلم رسیدہ ہیں وہ تم پر رحم کریں گے، اسی طرح سب رہائی پائیں گے ان کی عقل نے تو بات کو قبول کر لیا مگر دل نہ مانا۔ جب وہ اپنے مخالفوں کے کھلے بندوں پھرنے اور بہشت کے مزے لوٹنے کا تصور کرتے تھے تو ان کے دل بیتاب ہو جاتے تھے اور وہ اپنی مصیبتوں کو بھول کر ان کو مصیبت میں پھنسائے رکھنے میں راحت محسوس کرتے تھے۔ اس لئے باوجود ہمارے اصرار کے اُنھوں نے بات ماننے سے انکار کر دیا اور صاف کہا کہ نہ بہشت میں خود جائیں گے نہ دشمنوں کو جانے دیں گے۔ اگر آپ سب کی طرف سے متفقہ زور ڈالا جائے تو شاید بات بن جائے۔

عفوِ عام ہو گیا

چنانچہ پھر سب نے پیشانی کو خاک پر رکھ کر دعا کی کہ خدایا ہم پر سے پابندیاں اُٹھا تاکہ ہم بھٹکتے ہوئے بھائیوں کو راہِ راست پر لائیں اور اپنی اپنی عاقبت

کا واسطہ دے کر انہیں منائیں۔ وہ دُعا منظور ہوئی اور ہمیں ہر جگہ جانے اور لوگوں کو مل کر سمجھانے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ پورے ایک سال کی محنتِ شاقہ کے بعد ہم کامیاب ہوئے۔ رب نے ایک دوسرے کو بخش دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پابندِ مصیبت حضرات رہائی کی اُمید پر خوش اور ہم آزاد مدتِ انتظار کے جلد خاتمہ پر مسرور تھے جب ہم پھر یومِ وداع پر جمع ہوئے تو سب نے ایک دوسرے کو حقیقی مبارکباد دی سب کے اعمالناموں پر یہ خوشخبری تحریر تھی:۔

"آج سے سات روز بعد فرشتوں کے محافظ دستے واپس بُلا لئے جائیں گے اور سب گنہگار رہائی پائیں گے۔ یومِ رہائی کے ایک ہفتہ بعد بشرطِ امن سب بہشت میں داخل ہو جائیں گے"۔

یہ نوشتہ آنکھیں مل مل کر پڑھتے تھے اور سب خوش ہوتے تھے۔ بعض طفلانہ مزاج بغلیں بجاتے تھے اور متانت مآب زیرِ لب مسکراتے تھے۔ اور بہشت کے فرحت زا تصورات میں کھوئے جاتے تھے۔ سبز وادیاں نظر کے سامنے اُٹھتی تھیں اور شفاف پانی کی جاں افزا نہریں کناروں تک بھری ہوئی قیمتی پتھروں سے منقوش بہ رہی تھیں۔ ان کی تہ میں کوہِ لُور سے زیادہ قیمتی ہیرے اور خوبصورت جواہر آہستہ آہستہ بہتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر شخص گھر آ کر بھی اسی کیفیت میں بیٹھا تھا ہزاروں حسین نظارے عالمِ تصور میں پیدا ہوتے تھے گویا غلمانِ بہشت کے شیریں میووں کے بھرے تھال لئے ہمارے منتظر کھڑے ہیں جنت کی حوریں شگفتہ پھولوں کے گجرے پہنانے کو آ رہی ہیں زریں پر اور رنگیں منقار بلبلیں سبز پتوں کی اوٹ میں بیٹھی کبھی چہچہا کر پُرسکون

فضا میں راگ اور ساز سے زیادہ خوشگوار اثر پیدا کر رہی ہیں۔ جنت کے خیلل کی یہ روح افزا بہاریں سارا دن پیشِ نظر رہیں۔ شام بھی عاشق کی صبح مراد کی طرح روشن تھی۔ خوابِ خوش سے رات دن کی طرح تابندہ و درخشندہ نظر آئی۔

اس بہارستان کے پہلو میں انتظار کا جو خارستان تھا وہ ایک دن رات تو نظر سے اوجھل رہا۔ اگلے دن اضطراب بڑھا۔ میں چاہتا تھا کہ دو ہفتے جلد گزریں اور سنہری دنیا کی راحت افزا وادیوں میں جا پڑیں، مگر وقت اڑیل ٹٹو کی طرح رکا کھڑا تھا، جتنا چاہا کہ جلد بڑھے اتنا ہی یہ قدم پیچھے ہٹتا نظر آیا۔ تیز رو گاڑی میں بیٹھ کر جس طرح پیادہ پا مسافر باوجود آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح میری برق رفتار عجلت پسندی کے مقابلہ میں وقت ترقیِ معکوس کرتا تھا اور اس روایتی عاشق مزاج نابینا کی طرح جو شبِ وعدہ کے انتظار میں بیتاب ہو کر صبح سے ہی لڑکوں سے غروبِ آفتاب کی جاں بخش خبر دریافت کرتا ہے اور جواب خلافِ امید پا کر مایوسی سے کہہ اٹھتا ہے کہ شاید آج سورج چھپے گا ہی نہیں۔ میں بھی بول اٹھتا تھا کہ شاید یہ عشرہ گزرے گا ہی نہیں۔ رات کالی دن پہاڑ نظر آتا تھا آج معلوم ہوا کہ انتظار موت سے مہیب تر ہے۔

خدا خدا کر کے ایک ہفتہ گزرا ئیں گویا موت کے منہ سے نکلا۔ تمام نظر بند آزاد ہو گئے۔ ہر طرف مبارک مبارک کا شور بلند ہوا۔ لوگ گروہ در گروہ ادھر ادھر گھومتے نظر آئے۔ جملہ پابند حضرات ہم آزاد لوگوں کے تہِ دل سے ممنون تھے کبھی پاؤں چھوتے ہاتھ چومتے بغلگیر ہوتے اور کبھی ہم کو کندھے پر اٹھاتے تھے

وہ بھی خوش ہم بھی راضی تھے۔ کیونکہ سب کو ایک ہفتہ کے بعد بہشت سے فائز المرام ہونے کا خوش کن خیال تھا۔ دل کنول کی طرح کھلا تھا۔ دماغ میں پھر جنت کے دلکش مناظر پیدا تھے۔ دوپہر تک معلوم ہوا کہ فرطِ انبساط سے لوگ فرائض زندگی کو بھول گئے ہیں۔ کھانے پکانے کی کسی نے فکر نہیں کی۔ خیر مدت کی پابندی کے بعد آزادی کا اول روز تھا۔ ہوا خوری میں کٹ گیا۔ اگلے روز آزادی کے احساس نے برابری کا دعویٰ کیا۔ اب سب آقا تھے۔ باورچی کی نوکری کون کرے، تو آزاد لوگوں نے درخواست کی کہ ہم نے اتنی دیر تمہاری خدمت کی ہے اب چند روز تم ہمارا کھانا پکاؤ خود کھاؤ ہمیں کھلاؤ۔ درخواست مطالبہ کے لہجہ میں تھی۔ ناگوار تو معلوم ہوئی مگر بات مبنی بر انصاف تھی اس لئے ہم نے کمریں کسیں، کام کو لگ گئے۔ طرح طرح کے کھانے پکائے سب کو کھلائے بہشت کے داخلہ میں تین دن باقی تھے۔ وقت کٹنا پھر مصیبت ہو گیا۔

دُنیا میں جنگِ عظیم

معلوم نہیں انتظار کی اذیت سے میرا کیا حال ہوتا مگر میری قسمت سے ایک اور دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میرا بدخشانی دوست دوڑتا ہانپتا آیا اور کہا کچھ سنا؟ میں نے گھبرا کر پوچھا کیا؟ کہا کہ دُنیا میں جنگِ عظیم برپا ہے۔ برِ اعظم سے برِ اعظم ٹکرا گئے۔ ملکوں پر فوجیں چڑھ دوڑیں۔ قوموں سے قومیں لڑیں کشتوں کے پشتے لگ گئے، خون کے ندی نالے بہ نکلے۔ آسمان سے آگ برستی ہے۔ پانی میں دھماکے ہوتے ہیں۔ انسان تو انسان طائرانِ ہوا اور ماہیانِ آب کو

کہیں پناہ نصیب نہیں۔ میں نے بات کاٹ کر کہا عزیز از جاں نصیبِ اعدا ہذیان تو نہیں ہو گیا۔ اس نے ہانپتے ہانپتے کہا۔ نہیں نہیں۔ چلو چل کر محافظ فرشتوں کی حالت دیکھو۔ وہ آج کس قدر پریشان ہیں یہ کتنے کم گو تھے اور اکثر اشاروں سے بات کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے آج دنیا کی ہولناک جنگ کے وحشتناک حالات اس دردناک تفصیل سے بتائے ہیں کہ سننے کی تاب نہیں رہی۔ میں نے کہا تفصیل تو پوچھی مگر وجہ جنگ بھی دریافت کی یا نہیں۔ وہ بولا۔ بات کا بتنگڑ ہی بن گیا معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک گاؤں میں مندر اور مسجد ملحق تھے، شام کی آرتی اور مغرب کی نماز کے وقت آوازِ اذان اور شورِ ناقوس کہیں بیک وقت بلند ہوئے۔ پھر کیا تھا۔ برہمن بولا دھرم بھرشٹ ہو گیا۔ شیخ پکارا کہ مذہب ناپاک ہو گیا۔ بڑے بڑے ودوانوں اور ملاؤں کا اجتماع ہوا مگر یہ طے نہ ہو سکا کہ اذان پہلے کہی جائے یا سنکھ پہلے بجے۔ جو ہٹ چھوڑے وہ ہیٹی محسوس کرتا تھا۔ دونوں طرف کے جوشیلے نوجوان اٹھے۔ زوال سے پہلے ہی اذان اور دوپہر کو بھی اپاسنا شروع کر دی۔ طرفین کے کچھ بہادر روکنے کو بڑھے۔ لاٹھی چل گئی پھر کیا تھا۔ اسلامی اخبارات نے "ہندوستان کے کفرستان میں اسلام کو خطرہ" کی سرخیاں قائم کیں اور ہندو صحیفہ نگاروں نے "بھارت ورش میں ترک راج کا قیام" کا عنوان باندھا، بات کونے سے نکل کر طول و عرض ہند میں پہنچی۔ اخبارات کی مبالغہ آرائیوں پر جب چرب زبان پھکڑوں نے رنگ چڑھایا تو جگہ جگہ آتشِ فساد بھڑکی مقرروں نے تو تقریر کے بھس میں چنگاری ڈالی، چلتے بنے، بےگناہ راہ گزر مارے گئے۔ نسلی اور مذہبی فسادات میں تو ہمیشہ بے قصور ہی تہ تیغ ہوتے ہیں ہوشیار فتنہ پرور محفوظ جگہ بیٹھ کر

آگ لگاتے رہتے ہیں۔ بیچارے اِکّے دُکّے مسافر پر حملے شروع ہو گئے۔ ظالموں کی چھُری چاقوؤں نے گناہگاروں کو نہیں پوچھا۔ عمّالِ حکومت اور وزرائے سلطنتِ دِل کو قائم رکھ کر انصاف اور قانون کے نفاذ پر ڈٹے رہتے تو امن و امان بحال ہو جاتا مگر اُنھوں نے بھی درپردہ اپنے ہم مذہب مُفسدوں کی حمایت کی۔ شدہ شدہ خبریں ہندوستانی سرحد کے پار ہوئیں۔ مغربی سرحد کی بے چینی سے ہند و سیاسین کا اضطراب بڑھا۔ چین سے جاپان تک تدبیر کے گھوڑے دوڑانے۔ جاپان نے افغانستان کو دھمکایا۔ وہ بھی باش باش کہتا اُٹھا۔ انگلستان اور ہندوستان کا تعلق دیرینہ تھا۔ اس نے جاپان افغانستان دونوں کو ڈانٹا۔ روس نے انگلستان کی اس ڈانٹ ڈپٹ کو ایشیا میں مداخلت سے تعبیر کیا۔ ہندوستان کی مسجد اور مندر کے جھگڑے سے یورپ کا توازن بگڑا۔ روس اور انگلستان میں اعلانِ جنگ ہو گیا اور اس کے بیس منٹ کے اندر اندر تمام یورپین ممالک ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو کر آتشِ جنگ میں کود پڑے۔

میں متعجب ہو کر اُٹھا۔ حیرت سے باہر نکل کر فرشتوں کی قرار واقعی پریشانی کو دیکھا۔ سب کے سب گھبرائے ہوئے اور حواس باختہ خلد کو اضطراب اور بیقراری سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا صاحب آج کیا کیفیت ہے۔ اُس نے کچھ جواب نہ دیا اور برابر خُلد کو تکتا رہا گویا کسی دُور کی چیز کو دیکھ رہا ہے۔ میں نے بلند آواز سے کہا خیر باشد۔ اس نے تیوری چڑھا کر دیکھا گویا وہ اس وقت مداخلت کا متحمّل نہیں اور پھر بدستور خُلد کو گھورتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد یک بیک وُہ پکار اُٹھا۔ آفت، قیامت۔ کیا سچ مچ دُنیا تباہ کر دی جائے گی

اب تو میری بھی حیرت کی انتہا نہ رہی میں بیساختہ پکار اُٹھا کچھ تو کہو یہ ماجرا

کیا ہے وہ برابر دیکھتا رہا اور جھنجھلا کر بولا کہ دیکھتے نہیں صبح سے زمین کے اوپر اور ہوا کے اندر پانی میں سمندر پر اژدرد ہاں توپوں سے ہوائی جہازوں سے آبدوزوں اور ڈرڈناٹوں سے مسلسل جنگ جاری ہے۔ اٹلی نے آلاتِ نشرِ صوت کے ذریعہ چار دانگ عالم میں اعلان کر دیا ہے کہ برقی لہروں سے دشمنوں کے ملک کو تہ و بالا کر دیا جائے گا۔ لوسنو، دوسرے ممالک کے وزرائے حرب نے بھی کہا ہے کہ اس کا ویسا ہی جواب دیا جائے گا۔ گویا وہ بھی تیار ہی بیٹھے تھے۔ دیکھو تو عوام کس طرح آلات نشرِ صوت کے قریب گوش برآواز کھڑے ہیں۔ یہ خوفناک حالات سن سن کر چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں عورتیں لرزہ براندام ہیں بچے سہمے ہوئے ماؤں کی چھاتیوں سے لگے ہیں اٹلی نے دھمکی کو سچ کر دکھلایا۔ روس اور فرانس میں قیامت پھوٹ پڑی۔ زلزلہ آیا۔ دیکھو زمین شق ہو گئی۔ سرکاری ایوانوں اور دومنزلہ مکانوں میں سے ایک نہیں بچا۔ مرد اور عورت چونے اور اینٹ کے انبار کے نیچے کراہ رہے ہیں۔ کچھ مر گئے۔ جو زندہ ہیں وہ جان لے کر بھاگ رہے ہیں۔

اُف دوسرا جھٹکا ہوا۔ روس میں کوئی دیوار کھڑی نہیں رہ گئی۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑ رہے ہیں۔ فضا سے لاکھ لاکھ من کا پتھر برس رہا ہے پہاڑیاں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش اور ریزہ ریزہ ہوئی جاتی ہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ جرمنی نے فرانسیسی حلیف کی یہ درگت دیکھ کر اپنی برقی لہروں کا رُخ اٹلی کی طرف کر دیا ہے۔ انگلستان اٹلی کی تباہی کو کیسے ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکتا تھا۔ دیکھو اس نے آلاتِ برق کا نشانہ جرمنی کو بنایا ہے، جرمنی کی تباہی سے فرانس کی قوت اٹلی کے مقابلہ میں بہت بڑھ جاتی تھی اس نے چاہا کہ بے خبری میں فرانس کا کام تمام کر دے مگر فرانسیسی بہت خبردار نکلے، اٹلی کے ارادہ کو

پامال ہونا دونوں طرف سے برقی رو بڑھی۔ قیامت کے جھٹکے محسوس ہو رہے ہیں، تمام یورپ برباد ہو گیا ہے۔ صرف دو بڑے یورپ کے حربی مرکز باقی ہیں جو برق اور دوسرے کیمیاوی مادے سے تیار کئے گئے تھے تاکہ مخالفوں کی ہلاکت خیز سرگرمیوں سے محفوظ رہیں۔

تہذیبِ یورپ کے تمام نشانات معدوم ہو رہے ہیں۔ سمندر کا پانی برقی رو سے متلاطم ہو کر خشکی پر طوفان برپا کر رہا ہے۔ خوشنما مکانات اور خوبصورت سڑکوں کا نام تک باقی نہیں رہا۔ دیکھو یورپ میں جھٹکے پر جھٹکے محسوس ہو رہے ہیں۔ زلزلے پر زلزلہ آرہا ہے۔ آہ اے انسان تیری شقاوتِ قلب! یورپ کی تباہی کی تکمیل کر کے اب ان کی توجہ ایشیا کی طرف ہو گئی ہے۔ یورپ کی استعماری حکومتوں نے مخالفین کے مشرقی مقبوضات پر قیامتیں ڈھانی شروع کیں۔ مغرب کی ایشیائی حکمرداریاں اور زیرِ اثر علاقہ جات آن کی آن میں سب تہ و بالا ہونے لگے۔ مشرق کے مذہب زدہ انسان کے پاس دُعا و زاری کے سوا مدافعت کے لئے اور کیا ہتھیار ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے زمین شق ہو رہی ہے، پہاڑ فضا میں اُڑ رہے ہیں۔ مچھلیاں پانی کے باہر تڑپ رہی ہیں۔ پرندے جھاڑیوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ چرندے بستیوں کی طرف بھاگ رہے ہیں وہ خود سہما ہوا سر بسجود ہے اور حسبی اللہ حسبی اللہ پکار رہا ہے اس بیچارے کو کیا خبر کہ اس ہولناک تباہی کا محرک ربِ رحیم نہیں بلکہ قہرمان مادی طاقتیں ہیں جن کی بے پناہ ہولناکیاں مدت سے نوعِ انسان کے لئے لعنت ثابت ہو رہی تھیں۔ مشرق کی تباہی بھی مکمل ہوئی۔ پہلے تو مسجد اور مندر میں مرد و زن سجدے میں گرے تھے اب معبدوں کے در و دیوار سجدہ ریز ہوئے۔ بلند عمارتوں کی ایک اینٹ کھڑی نہیں رہی ہے۔ عالیشان شہر خاک کے بڑے تودے بن گئے ہیں۔ ایشیا

یورپ اور امریکہ کی شہری آبادیاں بالکل فنا ہوگئی ہیں۔
یورپ اور امریکہ کے فوجی مرکز باقی تھے سو ان کا حشر بھی دیکھو کہ کس طرح وہاں
ہے۔ سائنس کے آلات منشور ہر فوجی مرکز میں لگے ہیں جہاں سے شعاع
ل کر آنِ واحد میں افواجِ قاہرہ کو موت کے گھاٹ اُتار رہی ہے فوجی چھاؤنیوں
کی خاموشی طاری ہے، مہلک ہتھیاروں کے مُوجد مر گئے مگر ملاکت خیز آلات سے
ارع موت نکل رہی ہے۔ بحر و بر میں اب ایک متنفس باقی نہیں رہا۔ تند ہوائیں زمین سے
رہی ہیں۔ آسمان پر بادل گرج کر کوس لمن الملک بجا رہے ہیں۔ ہوائیں چلنے
گئیں۔ بادل گرجنے سے بند ہو گئے۔ اے نیک مرد ہنگامہ خیز دُنیا میں ہولناک
حکمران ہے، ڈراؤنی تنہائی محیط ہے، کوئی پرندہ پر نہیں مارتا، کوئی متنفس سانس
لیتا۔ ہوا حرکت سے عاری، سمندر موجوں سے محروم، قدرت کرشموں سے خالی
وہ عالمِ عمل کے اس عبرتناک انجام پر سر دُھنتا ہوا سایۂ دیوار میں بیٹھ گیا، بس افسوس
ندر آیا۔ انسان کی عاقبت نا اندیشی کے خیال سے سر چکرایا تو پلنگ پر جا لیٹا۔

دارُالِاصلاح میں بلوہ

ایک گھڑی بمشکل گزری تھی کہ شہر میں کچھ شور ہوا۔ پل میں یہ شور شورِ قیامت بن
مضطرب ہو کر اُٹھا۔ باہر نکل کر دیکھا تو لوگوں میں بلوہ ہو رہا تھا۔ ہر ایک کے سر پر
ت سوار تھی، غصّہ سے دماغ کا توازن کھویا جا چکا تھا۔ بوڑھے بھی بچّوں کی طرح بلاوجہ
تھے، عورتیں مردانہ وار آستینیں چڑھائے باہم دست بگریباں تھیں کچھ نوجوان آپس
طرح مصروفِ پیکار تھے میری شامت جو آئی "نہیں نہیں" کرتا رو کنے کو بڑھا، ناصحانہ

انداز اختیار کر کے لڑنے والوں کو چھڑانا چاہا۔ جونہی دو کو پرے کیا ایک تیسرے نے میری گردن آ دبائی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ اس نے الٹے ہاتھ سے ایک چانٹا بھی رسید کیا اور بولا بدذات تو بھی حمائتی بن کر آیا ہے میں حیران بھی ہوا افسوس بھی کیا تاہم نہایت تحمل سے عذر کیا کہ کچھ غلط فہمی ہوئی ہے میں تو سچ مچ چھڑا رہا تھا مگر اس نے باور نہ کیا مجھے جھوٹا گردانا ایک گال کی پہلے تواضع کر چکا تھا اب دوسرے گال پر چانٹا رسید کیا۔

مجھے غصہ آیا اور آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے بھی آستینیں چڑھائیں اور اس کا گریبان پکڑا۔ دھول دھپا شروع ہوا۔ آن واحد میں بلوائیوں کا ایک اور ریلا آیا جس نے ہم دونوں کو علیحدہ کر دیا۔ میری پگڑی گردن میں پڑی تھی میں اس کو سنبھالنے لگا قریب ہی دو لڑنے والوں کو دیکھا ایک دوسرے پر تکہ تان رہے تھے۔ ایک نے سر بچایا دوسرے کا مکا میری کنپٹی پر پڑا۔ غصے نے عقل کو پہلے کھو دیا تھا۔ ہر چند میں جانتا تھا کہ یہ مکا بازی غیر ارادی طور سے ہوئی مگر مزاج کی پہلی برہمی اور کنپٹی کے اس صدمے نے قوت برداشت نہ چھوڑی میں نے اس کی ڈاڑھی پکڑی اور ایک دھول لگایا چاہتا تھا کہ کسی نے پیچھے سے ٹانگ کھینچ کر زمین پر دے مارا۔ گرتے ہی میرا سر چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھایا۔ ذرا سنبھلا تو دیکھا کہ کوئی اور ہی سینے پر سوار ہے وہ کمزور تھا میں زور کر کے اٹھا اور اٹھ کر ایک لات رسید کی۔ اس نے اچھل کر ناک پر ٹکر ماری پھر سر کو چکر آیا۔ میں لڑکھڑایا اور ایک شخص پر گرا۔ وہ اپنا حریف سمجھ کر مجھے لپٹ گیا ہم ایک دوسرے کی داڑھی پکڑے اٹھے۔ باہم وار کیا چاہتے تھے کہ بلوائیوں کا ایک اور ریلا آیا۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے میں مڑ کر بلوائیوں سے الگ ہوا۔ خانہ نشینی میں عافیت سمجھی۔ گھر پہنچ کر دم لیا۔ کواڑ اندر سے بند کر کے سجدۂ شکر بجا لایا۔

پورے دو دن کا بھوکا پیاسا گھر میں معتکف رہا۔ مگر بلوائیوں کا شور و شغب ایک لمحہ کے لئے بھی نہ تھما۔ خوفناک چیخیں اور مجروحوں کی گریہ و زاری زیادہ سے زیادہ سنائی دے رہی تھی اور میں سہما جا رہا تھا۔

تیسرے دن صبح اُٹھا تو شور و شر جُوں کا تُوں جاری تھا۔ رات کو میں کئی دفعہ گھبرا کر اُٹھا۔ اب بھی دل بیٹھا جا رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی میں نے دفعِ مصیبت کے لئے آیۃ الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ اُٹھ کر دیکھنے کی جرأت کس کو تھی وہیں بیٹھا رہا اور دفعِ بلیّات کے لئے تلاوت کا سلسلہ جاری رکھا آوازیں بھی آئیں، گویا مجھ کو کوئی بُلا رہا ہے۔ گوش بر آواز ہو کر پہچانا کہ محافظ فرشتہ ہے۔ ذرا جان میں جان آئی میں اُٹھا۔ بروجہِ احتیاط دروازہ کی دراڑوں میں سے دفعِ شک کے لئے دیکھا فرشتے کو تنہا پا کر تسلّی ہوئی۔ کواڑ کھولا۔ وہ داخل ہوا۔ میں نے جھٹ سے زنجیر لگا دی۔

میں تو متوحش تھا ہی میں نے اسے اپنے سے زیادہ پریشان پایا۔ وہ بیٹھتے ہی بولا۔ کیا قیامت ہے کہ فساد رُکنے میں نہیں آتا۔ لوگوں پر وحشت سوار ہے۔ مرد چھوڑ عورتوں اور بچوں پر زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ نیکوکاروں کی جلد بازی کا کیا عبرتناک انجام ہو رہا ہے۔ جب تک کما حقہٗ تزکیہ نہ ہو گنہگار طبائع کب شر انگیزی سے باز رہ سکتی ہے۔ نیک بندوں اور اصلاح یافتہ لوگوں کی بیتاب دعاؤں نے گنہگاروں کو قبل از وقت رہائی دلا کر اِس پُرامن بستی کو فتنہ و فساد میں مُبتلا کر دیا ہے جو نیک بخت چھڑانے جاتا ہے وہ بھی طوعاً و کرہاً مفسدوں میں شریک ہو جاتا ہے کچھ دیر پٹتا پٹاتا ہے۔ پھر پاؤں سر پر رکھ کر بھاگتا ہوا گھر آتا ہے اور تمہاری طرح معتکف ہو جاتا ہے۔

میں نے قطع کلام کر کے پوچھا کہ فساد کی ابتداء کا باعث کیا ہے۔ جواب دیا کہ معمولی سا واقعہ قیامت بن گیا ہے۔ لوگوں کی یک بیک رہائی سے سڑکوں پر بھیڑ بھاڑ تو آپ نے دیکھی ہوگی۔ کچھ دن تو گنہگار بھی پابندیوں سے مخلصی پا کر ممنون تھا شرانگیزیوں سے سب لوگ باز رہے مگر دنیا میں اغنک کی ہوئی عادتیں جلد ہی رنگ لائیں۔ دو راہگذروں کے کندھے بھڑ گئے پہلے تو تو میں میں ہوئی کچھ لوگ اکٹھے ہوئے۔ معاملہ سلجھانے کی بجائے دونوں کو اور بھڑکایا وہ باہم دست بگریباں ہوئے۔ پھر کیا تھا دونوں کے راہ چلتے خدا واسطے کے حمایتی آپس میں گتھم گتھا ہوئے جو چھڑانے آیا وہ بھی لڑائی میں شریک سمجھا گیا۔ صلح جو اور جنگجو میں کوئی تمیز نہ رہی اصلاح یافتہ لوگ بے قابو ہجوم کو امن و آشتی کا وعظ کہنے نکلے تھے۔ وہ خود پند و نصائح کے محتاج ہو گئے۔ دو چار دھکے کھا کر خود بھی بے قابو ہو گئے۔ جب ہجوم کے ہاتھوں زیادہ گت بنی تو گھروں میں پناہ ڈھونڈی۔ اب مصیبت یہ آئی ہے کہ گنہگار اصلاح یافتہ لوگوں کے مکانوں کو آگ لگا رہے ہیں اور بیچاروں کو گھر سے نکال نکال کر پیٹتے ہیں۔

میں نے یہ حال سنا تو دم بخود ہو گیا۔ پھر ذرا دم لے کر پوچھا کہ آپ حضرات مداخلت کیوں نہیں کرتے جواب ملا کہ مشیتِ پروردگار یہی ہے کہ ہم مداخلت نہ کریں تاکہ گنہگاروں کے وعدوں کا امتحان ہو جائے۔ آپس میں محبت امن اور صلح سے رہنا پابندیوں سے رہائی کی ابتدائی شرط تھی۔ دیکھو تو عاقبت نا اندیش انسان نے کس طرح اپنے وعدوں کو پس پشت ڈالا۔ آج اُن کو پابندیوں سے رہا ہوئے پندرھواں روز ہے۔ اگر یہ قلیل عرصہ امن سے رہتے تو بہشت کا دروازہ سب پر کھل جاتا ہر شخص بقیہ عمر خوشی و خرمی میں گزارتا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار کی قسمت میں سزا ہے۔

گنہگار سزا بھگتے بغیر فلاح نہیں پا سکتے۔ اگر مواقع میسر بھی آئیں تو گنہگار وہ تمام موقعے ہاتھ سے کھو دے گا۔

قیامت

صاحبو! اوروں کا ذکر کیا کروں، کیا جانے کیا ہونے والا ہے۔ آفرینش سے لے کر کل تک ہمیں اس کیفیت نے کبھی نہ گھیرا جسے تم غم کہتے ہو۔ صبح سے ہم خدا جانے کیوں غمگین ہیں۔ اس عالم میں کوئی بڑا انقلاب آنے والا ہے۔ یک بیک اس نے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیکھو کس طرح عالی شان مکان نذرِ آتش کئے جا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ شعلے بلند ہو کر آسمان سے باتیں کرتے ہیں دھواں اس دنیا پر محیط ہو رہا ہے میں خوف سے آتش فشانیوں کو دیکھتا تھا۔ دل سینے میں دھڑکتا تھا ناگہاں ایک عجیب آواز بلند ہوئی گویا کروڑ کروڑ گھوڑے کی طاقت کے لاکھوں انجن بیک وقت چیخنے لگے ہیں۔ کاغذی تعزیے کے درودیوار کی طرح جو تموجِ ہوا سے لرزنے لگتے ہیں تمام مکان جنبش میں آ گیا۔ فرشتہ محشر محشر کہتا باہر بھاگا۔ میں قیامت قیامت پکارتا نکلا۔ مکانوں اور دیواروں کے سائے تک سے بچتے ہم میدان کی طرف آئے، ہماری طرح ہزاروں متوحش انسان کھلی جگہ سمٹے آ رہے تھے۔ چہروں پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ کہتے کچھ تھے۔ مُنہ سے نکلتا کچھ اور تھا وہ آواز بلندی اور ہولناکی میں زیادہ زیادہ ہوتی گئی جس سے زمین کا ذرہ ذرہ کانپا۔ مکانات کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ کانوں کے پردے پھٹنے لگے اور لوگ کانوں میں انگلیاں دے کر پریشانی میں ادھر اُدھر نکلنے لگے

بہت سے آدمی عالمِ اضطراب میں اذانیں دے رہے تھے۔ کچھ بیتاب ہو کر بلند آواز میں کلمہ پڑھ رہے تھے آواز لحظہ بلحظہ بیش از پیش ہولناک ہو رہی تھی ساری زمین تھرتھراتی تھی۔ آبادیاں دیکھتے دیکھتے کھنڈر بن گئیں۔ وہ دنیا میدانِ محشر ہو گئی۔ کوئی دیوار اور درخت کہیں کھڑا نہ رہا۔ یک بیک ہم غیر ارادی طور پر چلنے لگے گویا ہمیں نشیب کی طرف چلایا جا رہا ہے۔ مدت تک چلتے گئے۔ ایک جگہ جا کر رکے۔ جہاں کی زمین اور خاک دنیائے عمل کی سی دکھائی دی۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی میدان اور چٹیل میدان تھا۔ آواز بدستور قیامت اٹھا رہی تھی۔ ناگاہ دھماکوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ زمین میں جابجا شگاف ہو گئے اس میں سے قطار در قطار انسان نکلنے شروع ہوئے وہ ہم سے زیادہ پریشان اور بدحواس تھے۔ زمین میں سے نکل کر بہت اضطراب سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے گویا بالکل ننگے تھے مگر خوف کے باعث کسی کو سر و پا کا ہوش نہ تھا۔ ان میں سے اکثر کی زبان پر "میدانِ محشر" "صورِ اسرافیل" کے الفاظ جاری تھے۔ انسانوں کی اس بھاگ دوڑ سے خاک نے آسمان کی طرف اڑ کر ابر سا بنا دیا۔ دم گھٹنے لگا۔ قریب تھا کہ سب دم گھٹ کر مر جائیں اللہ نے مشکل آسان کی۔ وہ ہیبت ناک آواز رکی، لوگوں کو اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ اب یہ حال ہے کہ جو جہاں کھڑا تھا کھڑا ہے اور کسی نئی آفت کا انتظار کر رہا ہے جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی انسانوں کے جنگل کھڑے تھے۔

حساب و کتاب

تھوڑی دیر کے بعد آسمان سے گرجتے ہوئے بادلوں سے مشابہ آوازیں

کوئی شخص عربی زبان میں بولا "ھٰذا یوم الدین یا معشر الناس"۔ عجب اعجاز تھا کہ اس عربی کو جاہل عجمی بھی صاف سمجھتے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ آج یوم حساب ہے تو لوگ اور حواس باختہ ہوئے۔ ہاتھوں کی طرف نظر گئی تو کسی کے دائیں ہاتھ میں، کسی کے بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال تھا جسے ہر ایک باوجود اَن پڑھ ہونے کے بھی پڑھ سکتا تھا۔ جس کے بائیں ہاتھ خالی تھے وہ خوشی سے اُچھلے جن کے دائیں ہاتھ میں کچھ نہ تھا وہ یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَاباً (اے کاش ہم مٹی ہوتے) پکارے۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ میں کتاب دیکھی تو مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ گنہگاروں نے گریہ وفغاں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور محشر میں محشر بپا کیا۔ آسمان سے بجلی کے کڑکنے کی طرح آواز آئی کہ اے گنہگارو۔ آج کے دن نہ بلبلاؤ اپنے کیے کی سزا پاؤ۔ اس کڑکے سے سب سہم گئے۔ آواز چھوڑ، سانس بھی سینے میں رُک گیا۔ آنکھوں کے سامنے ایک تاریکی کا پردہ چھایا۔ آسمان سے ایک اَور پُر ہیبت آواز آئی کہ خبیث اور طیب الگ ہو جائیں پیغمبر اور شہید وسط میں کھڑے ہو جائیں نیکوکار اور گنہگار یمین و یسار پر آ کر ٹھہریں میں بدقسمت بائیں والوں میں تھا۔ ساتھیوں کے ہمراہ میں بھی اعمالِ بد کو یاد کر کے رو رہا تھا مگر توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ رحم و رعایت کے سب موقعے جا چکے تھے۔ اب تو مکافاتِ عمل کی تیاریاں تھیں۔ گریہ وزاری پر کوئی متوجہ نہ تھا۔ اب آسمان پر نور سا چھا گیا۔ ایک آواز جس میں موسیقی، نرمی اور گداز تھا سُنائی دی۔ پیغمبروں کی زندگیاں بنی نوع انسان کی خدمت میں بسر ہوتی ہیں۔ شہداء کی موت کا مقصد بھی کم باعظمت نہیں ہوتا۔ اس لئے ایسی بے عیب زندگی بسر کرنے والے ایسی اچھی موت قبول کرنے والے کسی محاسبہ کی زحمت نہ اُٹھائیں گے اور بغیر حساب کے ہماری خوشنودی کی بہشت میں جائیں گے۔

چنانچہ پیغمبر اور شہید چند قدم آگے بڑھے۔ سجدۂ شکر میں گر گئے۔ مدت کے بعد اُٹھے، نورانی فرشتے آسمان سے اُترے پیغمبروں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ عزت و احترام سے ہمراہ لے چلے۔ جب وہ سب جا چکے تو سرخپوش فرشتوں کا ایک اور گروہ زمین پر اُترا۔ وہ شہیدوں کو محبت سے ملے اور بلند آواز سے پکارے۔ "مبارک ہیں جنہوں نے ملک و قوم کی عزت برقرار رکھنے کے لئے یا بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے جان دی اور اپنے خدا کی مانی ہمارے ہمراہ آؤ اور بہشت میں داخل ہو جاؤ کیونکہ شہیدوں کی موت ہی قوموں کی زندگی برقرار رکھتی ہے۔"

فرشتے یہ کہہ کر آگے بڑھے، شہید اُن کے ہمراہ آئے۔ جب وہ کچھ فاصلہ پر پہنچے تو بھیانک شکلوں والے ڈراؤنی آنکھوں والے سیاہ پوش اور دیوہیکل فرشتوں کا ایک اور گروہ آسمان سے اُترا اور انسانوں کی قطاروں کے رُو در رُو کھڑا ہو گیا۔ ایک خوفناک گرجتی ہوئی آواز آئی کہ وہ جنہوں نے اپنے ملکوں سے جنگ کے وقت غداری کی، قومی خطرے کے وقت عیاشی یا عبادت شروع کر دی انہیں دوزخ میں لے جاؤ۔ عذاب کے فرشتے جو چپ چاپ کھڑے تھے یہ سُن کر انسانوں کی قطاروں میں گھس گئے۔ عیاشوں، غداروں اور بُزدل عبادت گزاروں کو پہچان کر بغل میں دبا کر چل دیئے۔ رہائی کی صورت نہ پا کر وہ تڑپتے تھے، چلّاتے تھے۔ سب پر خوف طاری تھا۔ زبان خشک ہو رہی تھی۔ تاب دید نہ پا کر اکثر نے آنکھیں بند کر لیں تا آنکہ وہ نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔

اب آسمان سے ایک محبت بھری آواز آئی کہ وہ لوگ جنہوں نے امن کے دنوں میں اپنی زندگیاں لوگوں کی بھلائی کے لئے وقف رکھیں یا عمر بھر شخصی مفاد پر

ن مفاد کو ترجیح دیتے رہے یا کوئی ایسی ایجاد کی یا کتاب لکھی جس سے آنے والی
ملوں کے علم اور آرام میں اضافہ ہوا۔ ان کے شخصی گناہ جو قتلِ عمد کو نہ پہنچے
ے معاف کر دیئے گئے۔ انہیں حکم کیا جاتا ہے کہ وہ آگے آجائیں۔ چنانچہ بہت سے
تبانِ وطن، موجد اور مصنّف آگے بڑھے۔ آسمان سے فرشتے اُترے انہیں ہمراہ
ے گئے۔ پھر ایک خوفناک آواز آئی کہ پاکھنڈی ہٹے کٹے پیر اور فقیر نذر اور نیاز پر
ن کا گزارہ رہا جن کا وجود قوموں اور ملکوں کے لئے بوجھ تھا اور قوموں کے گلے
ں پتھر تھے اور جنہوں نے کبھی ہاتھ پاؤں ہلا کر ملک کی دولت میں اضافہ نہ کیا دوزخ
یں ڈالے جائیں گے۔ آسمان سے سیاہ پوش فرشتے اُترے۔ پہچان پہچان کر کھینچتے
چلاتے ایسے پیروں اور فقیروں کو لے گئے۔ مرنج و مرنجاں گوشہ نشین عبادت گزاروں
کے لئے حکم ہوا کہ وہ اعراف میں جا بیٹھیں۔ دوزخ کی آنچ اور بہشت کی راحتیں دونوں
سے محروم رہیں۔ چنانچہ غیر ارادی طور سے ان کے پاؤں کو حرکت ہوئی۔ وہ بھی حدِ نگاہ
سے پار ہو گئے۔ اب آسمان سے ایک اور آواز آئی جو نہ تو خوفناک تھی نہ محبت سے بھری
کہی جا سکتی تھی گویا معمولی آواز تھی۔ کوئی پکارا "اجتماعی، قومی یا جماعتی اعمال کی
بڑی جزا اور خوفناک سزا کے مستوجب کیفرِ کردار کو پہنچ چکے۔ اب شخصی عیب و ثواب
کا جائزہ لیا جائے گا۔"

سب نے دیکھا کہ آسمان سے فرشتے فوج در فوج اُترنے لگے۔ ہر انسان
کے ساتھ دو فرشتے ہو لئے۔ اعمال ناموں کی پڑتال شروع ہو گئی۔ انسانوں نے
ایسے سخت گیر سنگ دل محاسب کب دیکھے تھے جنہوں نے کسی کی جان لی تھی۔ یا
سخت اذیت دی تھی۔ یتیموں کا مال مارا تھا یا بیکسوں کو ستایا تھا۔ ان کا مواخذہ

کرلئے گئے۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں نیکوکار فضول خرچی خرابی صحت وصفائی سے لاپروائی کی بنا پر دوزخ کی طرف گھسیٹے گئے۔ وہ والدین جو بچوں کی تعلیم سے لاپروا تھے سخت ذلیل دیکھے گئے۔ نماز کے بارے میں ابھی پرسش ہورہی تھی کہ ٹھہرو ٹھہرو کی آواز فضا میں گونجی۔ فرشتے جہاں کے تہاں کھڑے ہوگئے۔

آواز آئی "اے مجرمو! تمام پیغمبر تمہارے لئے سربسجود ہو کر رحم کے طالب ہیں لیکن انصاف مانع رعایت ہے۔ پیغمبروں کے پاس خاطر سے رحم اور انصاف کے مختلف تقاضوں کو مدِّ نظر رکھ کر یہ رعایت کی جاتی ہے کہ حق اللہ کو معاف کیا جائے اور حق العباد کا سختی سے جائزہ لیا جائے۔ یہ سُن کر قرونِ اُولیٰ و وسطیٰ کے لوگ خوشی سے اُچھلنے۔ قرونِ آخر کے علماء پر مُردنی چھا گئی کیونکہ وہ خدمتِ خلق سے عاری اور محض عادات کے غازی تھے۔ غرض اُمتیں جو حق اللہ سے غافل رہی تھیں پیغمبروں کی سفارش سے فرشتوں کی گرفت سے بچ گئیں۔ حق العباد سے لاپروا انسانوں کو ملائک بغل میں دبا کر لے اُڑے۔

جہنم

ایک فرشتہ میری بھی گردن میں ہاتھ ڈال کر فضائے آسمانی میں پرواز کرنے لگا۔ میں بیکس چڑیا کی طرح جو پنجۂ شہباز میں ہو سہما ہُوا تھا۔ کبھی خوف سے آنکھیں بند کرتا تھا کبھی کھولتا تھا۔ میرے گرد و پیش لاتعداد فرشتے اَن گنت انسانوں کو اسی طرح دبائے لئے جا رہے تھے۔ کانوں میں پیہم یہ صدا آ رہی تھی "حق العباد سے غافل انسانو! اگر خدمتِ خلق کی طرف توجہ کی ہوتی تو آج تمہاری یہ دُرگت نہ ہوتی۔ اگر تم میں شیطنیوں کے

اوصاف ہوتے اور جنت میں رہنے کی صلاحیت ہوتی تو دوزخ کے دردناک عذاب سے محفوظ رہتے۔ افسوس ہے تم پر افسوس ہے۔ اب جاؤ اپنے کیے کی سزا پاؤ"۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے گرمی محسوس ہوئی گویا میں تپتے ریگستان کے درمیان سے گزر رہا ہوں۔ آخر گرمی حدت میں اور حدت آنچ میں بدلنے لگی۔ میں نے جانا کہ خدا کے خوفناک عذاب کا وہ ڈراؤنا مقام جسے جہنم کہتے ہیں اب قریب ہے، اُف بہت قریب ہے، دم گھٹا جا رہا ہے میں جلا جا رہا ہوں۔ الٰہی میں کس کرۂ نار کے قریب ہوں یہ ہولناک گرج یہ خوفناک چیخیں دردناک دھاڑیں نالہ و بکا کا شور کہاں سے اٹھ رہا ہے۔ ڈرتے ڈرتے زمین کی طرف نگاہ کی تو نار کا ایک بحر ناپیدا کنار نظر آیا۔ آگ بھڑک رہی تھی۔ شعلے بلند ہو رہے تھے۔ یک بیک عین دوزخ میں مجھے پتھر کی طرح پھینک دیا گیا۔ میں قلابازیاں کھاتا گرا شعلوں میں سے گزرا آگ کی لپیٹ میں سے گزرا اور دوزخ کے شکم میں پہنچا، دنیا کی آگ میں وہ التہاب کہاں، گوشت پوست چربی کی طرح پگھلا کاش احساس اذیت سے عاری ہو جاتا مگر یہ خدا کو منظور نہ تھا۔ آتش نمرود سے ہزار گنا سوزندہ تر آگ میں سر کے بل غرق ہوا جاتا تھا چیختا تھا چلاتا تھا مگر اس آتش کدہ کی تہ کو نہ پاتا تھا سمندر کی تو سطح پر ہی بھنور معلوم ہوتے ہیں اس کے اندر بھنور تھے۔ آگ کے اندر آگ کے مگرمچھ آگ کے اژدر آگ کے شیر اور چیتے دکھائی دیتے تھے۔ آگ کی اذیت کے علاوہ سخت خوف طاری تھا دوزخ کی اس مخلوق کے شکم جہنم کے شکم سے زیادہ گرم تھے۔ انسان کو تھوڑی دیر پیٹ میں رکھ کر اُگل دیتے تھے۔

کبھی کبھی آگ کے متحرک ستون پیدا ہوتے تھے ان کی لپیٹ میں آ کر طبیعت اور بیتاب ہوتی تھی، آگ کی تلواریں آتشیں کٹاریں جسم پر پڑتی تھیں۔ بے ساختہ

چیخ پر چیخ نکلتی تھی۔ اے کاش اگر دُنیا میں اس مصیبت کا تصور کر سکتا تو لاکھ برس کے عیش کے بدلے ایک لمحہ کی سوزش قبول نہ کرتا اور پیچھے دائیں بائیں کروڑوں تنوروں کی سوزش تھی۔ مسلسل گونج سنائی دیتی تھی۔ اس گونج میں اہلِ دوزخ کی چیخیں اور واویلا تھا۔ میں مرنا چاہتا تھا مگر دم نہ نکلتا تھا۔

اعراف

یک بیک ایک راحت زا آواز آئی کہ اے بچو نہ گھبراؤ۔ سجدے سے سر اُٹھاؤ تمہاری زاری منظور ہوئی۔ تمہارے محسن کے لئے آگ ٹھنڈی کر دی گئی۔ اس آواز کا آنا تھا کہ عذاب موقوف ہوا۔ مجھ پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ کبھی کبھی مجھ کو محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی فرحت زا مقام کی طرف سفر کر رہا ہوں۔ جب آہستہ آہستہ ہوش آیا تو دیکھا کہ میں ایک آرام دِہ مقام میں مقیم ہوں۔ وہی لڑکا لڑکی جو دُنیا میں تعلیم کے لئے میری سخاوت کے رہینِ منت رہے تھے، میری خبرداری اور خدمت گزاری کو موجود ہیں۔ میں نے اپنے اعضاء کو ہلایا۔ طاقت میں اپنے آپ کو رستم و اسفندیار پایا۔ تمام جسمانی عوارض اور روحانی کمزوریاں جا چکی تھیں۔ بیس سالہ جوان کی طرح خون میری رگوں میں دورہ کر رہا تھا۔ میں نے موجودات پر حاکمانہ نظر ڈال کر دیکھا۔ آج مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ خالق کا میں ہی خلیفہ ہوں۔ مجھے سب مخلوق پر شرف حاصل ہے۔ دِل سے کہا اے اشرف المخلوقات خدمتِ خلق میں ہی شرف ہے۔ خدمت سے ہی انسان مخدوم بنتا ہے۔ زندگی کا مقصد بجز بھلائی کے کچھ نہیں۔ اس جگہ پہلی دفعہ جو لب کشائی کی وہ اس سوال

کے لئے بھی کہ آیا اس جگہ خدمتِ خلق کا کوئی موقعہ ہے جس نے یہ سوال سُنا ہنس
دیا۔ طبیعت تشنۂ جواب رہتی۔ ایک سے نہیں بیسیوں سے پوچھا سوائے معنی خیز
ہنسی کے کوئی جواب نہ پایا۔ آخر اپنے وظیفہ خوار بچوں سے سوال کیا جنہوں نے
جواب دیا کہ جہاں مخلوق ہے وہاں خدمت کا موقعہ ہے۔ اللہ اللہ دوزخ بھی کیسی
رحمت ہے جو وہاں سے نکل کر آتا ہے خدمتِ خلق خدمتِ خلق کے الفاظ زبان
پر لاتا ہے۔ خدمتِ خلق بہشتیوں کا نشانِ امتیازی ہے۔

میں یہ سُن کر سجدے میں گر گیا۔ تڑپ تڑپ کر دُعا مانگی اور کہا اے اللہ!
کوئی دم بھی میں تیری مخلوق کی خدمت سے غافل نہ ہوں۔ میرے اندر خدمت کا ایک
خاص ولولہ اور دل میں ایک غیر متزلزل ارادہ تھا۔ مجھے خود محسوس ہو رہا تھا کہ
اب کوئی چیز میرے عزم کو فسخ نہیں کر سکتی۔ اس وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ
رہی تھیں۔ درخت سایہ دار تھے اور ہر طرف آبشاریں گر رہی تھیں۔ لوگ خوش نما
چبوتروں پر بیٹھے اللہ اللہ کر رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا بہشت ہے جواب
ملا نہیں اعراف۔ آپ دوزخ سے ابھی آئے ہیں اس لئے اعراف پر جنت کا گمان
گزرتا ہے ورنہ اس مقام پر تو خلد کا سایہ تک نہیں پڑتا۔ یہ جگہ اِن زاہدوں کے
لئے مخصوص ہے جو ہمیشہ قولی عبادت میں مصروف رہے اور جنہوں نے عملی عبادت
یعنی خدمتِ خلق کا موقع حاصل نہ کیا۔ یا اس جگہ وہ بُزدل عبادت گزار رہتے
ہیں جن میں بُزدلی کے باعث بُرائی کرنے کی ہمت نہ تھی اللہ اُنہوں نے بھلائی
بھی کبھی نہ کی۔ اِن باتوں کے دوران میں مجھے دوزخ کی اذیت یاد آئی
میں بےخود سا ہو کر کانپ اُٹھا اور پوچھا کہ بھلا کتنی مدت عذاب دوزخ

میں کٹی ہوگی۔ جو سوال دل سے کیا گیا تھا وہ بے خودی میں دماغ پر آ گیا۔ ممنونِ احسان بچوں نے بتایا کہ صرف پندرہ منٹ۔ میں حیران ہو کر پکارا کہ سچ! جواب ملا کہ ہاں ٹھیک۔ میرے لئے تکلیف کے یہ پندرہ منٹ پندرہ برس کے برابر تھے۔ سچ ہے مصیبت کا وقت گزرتا نہیں بلکہ ارد گرد گھومتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بچوں نے یہ کہا کہ یہاں بلا کی گرمی ہے، اعراف سے خدا بچائے۔ اہلِ جنت کے لئے یہ مقام دوزخ ہے چلئے بہشت آپ کی منتظر ہے۔

بچے آگے آگے ہو لئے۔ میں پیچھے پیچھے چلا۔ کچھ دُور چل کر ہم ایک خوبصورت سڑک پر جا نکلے جن کے جاں فزا سائے میں مختلف اللّون گھوڑوں کے مشابہ جانور سبز گھاس کے زمردیں فرش پر اِدھر اُدھر دوڑتے چرتے چگتے نظر پڑے۔ ان کی لمبی ایال ریشم سے زیادہ چمکیلی تھی۔ جونہی اُنھوں نے ہمیں دیکھا بگٹٹ بھاگتے ہماری طرف آئے۔ قریب پہنچ کر رُکے۔ میرے ساتھی بچوں نے ایال پکڑی۔ جانور گویا سدھائے ہوئے تھے۔ خود بخود اُونٹ کی طرح بیٹھ گئے۔ دونوں بچے سوار ہوئے تو وہ کمال احتیاط سے آہستہ آہستہ اُٹھے۔ میں نے بھی ایک کو ایال سے تھاما۔ ڈرتے ڈرتے سوار ہوا جس وقت وہ جانور چلے تو معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ آرام دہ اور سبک سیر سواری دُنیا میں کوئی نہ دیکھی تھی۔ اس کی خوش رفتاری سے اِک سُرور آتا تھا۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے راہ کی سبز وادیاں پھولوں کے تختے دو رویہ پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں دیکھ کر ہر منزل پر بہشت کا گمان ہوتا تھا۔ میں بار بار خوش ہو کر پوچھتا تھا کہ یہ جنت ہے جواب ملتا وہ بابرکت جگہ ذرا دُور ہے۔

بہشت

ہر منزل پر نیا منظر تھا، ہر منظر پر طرب و نشاط کی ہزاروں دلاویزیاں باغ سدابہار۔ میوے موسم کی قید سے آزاد، جگہ جگہ زعفران کے کھیت میلوں تک پھلا ہوا موتیا۔ گلاب کے مہکتے ہوئے تختے، سبز ڈالیوں میں انگور کے خوشے لٹک رہے تھے۔ ہرے بادام سبز پتے، آلوچہ خوبانی، ہرے درختوں میں سندوری آم۔ گویا ہر وقت فصل گل تھی اور ہر ایک میوے کا موسم تھا۔ بلبل کی خوشنوائی پپیہے کی پی پی قدم قدم پر سامعہ نواز تھی۔ ہم جا رہے تھے، دوسری منزل پہلی منزل سے زیادہ دلکش تھی۔ بلوریں چشمے اور نورانی آبشاروں کی آوازیں موسیقی کے تمام سُر تال ہو چکے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیاں جن میں ٹخنے ٹخنے پانی تھا جگہ جگہ بہ رہی تھیں۔ کوہِ نور سے بڑے بڑے اور بیش قیمت پتھر نیلم کے ٹکڑے شفاف پانی کی تہ میں زنگار رنگ کی جھلک مارتے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ ریت کی بجائے زمرد کے ریزوں پر پانی گذر رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا آیا بہشت یہی ہے۔ جواب ملا ابھی کچھ دور یوں ہی چلے جائیں۔

القصہ ہم شاداب باغات اور سیراب وادیوں کی سیر کرتے چاندی اگلنے والے چشموں اور سیمابی دھاروں والی آبشاروں سے لطف اندوز ہوتے آگے بڑھے۔ تھوڑی دور جا کر سر بفلک کشیدہ منمرّدیں دیواروں نے نظر کو روکنا شروع کیا قریب جا کر بلند بلوری دروازہ دکھائی دیا جو بالکل بند تھا۔ جونہی ہم قریب پہنچے وہ وا ہوا۔ ہم امن اور سلامتی کی دنیا میں داخل ہوئے۔ باغ جنت تو دنیا دار۔

تخیل سے وراء ہے اُس کی خوبی ضبطِ تحریر میں کیسے آئے۔ درختوں کے سیاہی مائل سبز پتے آنکھوں میں عجیب ٹھنڈک پیدا کرتے تھے۔ ہر شاخ سبز پر بلبلِ ہزار داستاں بیٹھی تھی۔ گوہریں منقار اور زمرّدیں پر پرندے ہر طرف چہچہا رہے تھے۔ گویا ہر درخت سے سینکڑوں باجے بندھے تھے۔ وہاں خوشنما پھول تھے۔ اور جاذب نظر کلیاں شگوفے پھول رہے تھے۔ ہر شگوفہ بجائے خود ہزار رنگ کا پھول تھا۔ مگر باغ فردوس کے نونہالوں کے حُسن اور خوبی کا قیاس باغ دُنیا کے پھول اور پھل سے نہ کرنا۔ یہاں کے خس و خاشاک پر دُنیا کے ہزار باغ قربان ہوتے ہیں یہاں نہریں بہتی تھیں۔ جن کے برفانی پانی میں بتاشے گھلے ہوئے تھے۔ وہ برف آب سے زیادہ سرد، دُنیا کے دُودھ سے زیادہ لذیذ۔ ایک پیالہ پیو۔ تمام عمر ایک کیفیت طاری رہے۔

یہ دُنیا بھی عجیب دُنیا تھی۔ پھول شاخوں سے تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ کہیں سبز شاخیں آبِ رواں پر جھک رہی تھیں۔ ہم سب نظاروں سے لطف اندوز ہوتے جا رہے تھے۔ ایک جگہ دیکھا تو موتی کے کناروں والی نہر میں قوس و قزح کی طرح ہفت رنگ پانی بہہ رہا تھا۔ گھنے درختوں کے ٹھنڈے سائے میں ہزاروں حسین مصروف نا و نوش تھے۔ یہ حُسن کی پتلیاں معصوم اداؤں سے ایک دوسرے کا دِل بہلاتی۔ بلوری گلاسوں میں رنگین پانی ایک دوسرے کو پیش کرتی تھیں۔ ایک بی بی نے بڑھ کے مجھے بھی گلاس دیا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور خوش ہو کر پیا۔ گویا حلاوت میں دُنیا کے تمام رُوح افزا شربت مات تھے تاہم بچوں نے بتایا کہ بہشت کا یہ غیر دلچسپ ساحصّہ ہے اور یہاں کا پانی بھی زیادہ خوش ذائقہ نہیں۔

یسے دلکش اور ایسے فرحت زا مقام کو غیر دلچسپ کہتا کچھ اچنبا سا معلوم ہوا مگر
ں چھ آگے بڑھے معلوم ہوا وہ مقام بیشک بہشت کا غیر آباد کوچہ تھا۔

اب تو قدم قدم پر دلچسپیوں کی نئی دنیا دکھائی دیتی تھی۔ نظارہ جگہ جگہ نظر کا
من تھامتا تھا۔ فوارے موتی اچھالتے تھے۔ نہریں دودھ بہا رہی تھیں۔ سبز پتوں
سے لدے درخت چھاتا تانے کھڑے تھے۔ پھلوں سے لدی ڈالیاں جھکی ہوئی
ھیں۔ پھولوں سے ہوا مہک رہی تھی۔ پاک دامن اور پری جمال عورتیں اپنے
اوندوں کے ساتھ ہر جگہ مصروفِ سیر تھیں۔ صورتیں ایسی پاک اور لباس ایسے
صاف کہ دنیا میں نہ دیکھے نہ سنے۔ غلمان کمر پر زریں پٹکے سجائے ہاتھوں میں میوؤں
کے تھال لئے سب کو پیش کر رہے تھے۔ ان بچوں میں سے ایک نے مجھے دیکھا۔ بھاگتا
ہوا میری طرف آیا ہاتھ میں نقرئی مجمع تھا۔ مجمع میں سونے کی تشتریاں تھیں اور تشتریوں
میں آم کی قاشیں۔

میں نے ایک قاش اٹھا کر زبان پر رکھی۔ ایسی خوشبودار اور اتنی لذیذ کہ دنیا
کے بہترین میوے اس کے مقابلے میں بے ذائقہ معلوم ہوئے۔ تاہم بچوں نے
بتایا کہ آموں کی کوئی یہ اچھی قسم نہیں۔ یہ جہاں لذیذ پھلوں تر و تازہ پھولوں انظر افروز
سبزہ زاروں، ستھری سڑکوں، خوشنما عمارتوں اور نزہت انگیز نہروں کی دنیا ہے
ایک میوہ دوسرے سے بہتر، ایک گل دوسرے سے تازہ، ایک وادی دوسری سے
شاداب، ہر حصہ نہروں سے سیراب ہے۔ لو اب آبادی قریب ہے، دیکھو کس شان
کی عمارتیں ہیں، کیسی ستھری سڑکیں ہیں، کیسی عمدہ نہریں ہیں۔ کیا اچھے باغات ہیں
تھوڑی دور درختوں کے جھنڈ میں سے ہو کر گزرے۔ گھنے درختوں اور سیاہی

مائل پتوں سے صبح شام ہوتی تھی۔

جونہی اس جھنڈ سے نکلے کوثر سے دُھلی ہوئی سنگِ سفید کی عمارتیں دیدہ افروز ہوئیں۔ ہر مکان تاج محل سے کہیں زیادہ خوبصورت اور ہر صحن میں چمن اور ہر چمن میں فوّارہ۔ عقب میں بڑے پاٹ کا دریا تھا جس کی چھاتی کو چھوٹی چھوٹی کشتیاں چیرتی ہوئی جا رہی تھیں۔ ہزاروں خوبصورت جوان عورتیں رنگا رنگ باس پہنے اپنے نوجوان خاوندوں کے ساتھ مصروف سیرِ دریا تھیں۔ کبھی لبھی کوئی مترنّم آواز میں گاتا تھا تو اک کیفیت چھا جاتی تھی۔ دریا کے دوسرے نارے اونچے نیچے پہاڑ، سبز جھاڑیاں، خوبصورت پھول، سفید پانی میں سنہری کرنیں ہار پیدا کر رہی تھیں۔ اس دُنیا میں تمام شہر شور سے محفوظ۔ یہاں نہ مزدور اور رمایہ دار کی جنگ نہ بیماری اور تکلیف کے قصّے۔ یہاں کی صبح راحت زا یہاں کی شام رحت افزا یہاں کی ہوا میں برکت، یہاں کے پانی میں امرت، زندگی مطمئن اور آسودہ۔

دو رویہ سڑکوں پر میوہ دار درخت تھے۔ سیب، انار، ناشپاتی کے اشجار ں ایک خوبصورت آم کا درخت تھا۔ رس بھرے آم لٹکتے دیکھ کر مُنہ میں پانی بھر یا۔ دل میں خیال گزرا تھا کہ شاخیں خود بخود جُھک گئیں۔ میں نے چند آم اُتارے ہر شاخیں خود بخود اُونچی ہو گئیں۔ آم کے رس میں مشکِ ختن کی آمیزش تھی۔ ایسا علوم ہوتا تھا کہ مدّتوں برفاب میں پڑا رہا ہے۔ میں کھاتا اور تعریف کرتا جاتا تھا۔ امنے سبزہ زار میں خوبصورت ہرن چوکڑیاں بھرتے دِل کو بہت بھائے۔ چاہا کہ ریب جا کر پیار کروں۔ اِدھر یہ خیال گذرا اُدھر سبزہ زار کے وہ غزال محبوب بھاگتے ئے میرے پاس آ گئے۔ میں نے کسی کو چُوما کسی کو پیار کیا۔ دل مسرور ہوا۔ تھوڑی

ں طرح خوش وقت ہو کر آگے بڑھے۔ اب دلفریب عمارتوں کا طویل سلسلہ
م ہو گیا۔ دُودھ سے زیادہ سفید کوثر کے پانی سے پاکیزہ تر سنگ مرمر کے
ت دیکھے۔ سنگِ سفید کی اس عمارت کے محرابی دروازوں سے سُنہری جھالریں
ں ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے کسی پری جمال کے کانوں میں خوبصورت آویزے
مارت میں کشادہ صحن تھا اور ہر صحن میں چمن۔ اس کے عقب میں دریا تھا۔
ں سے یہ گلزار سیراب ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی نہریں اور آبشاریں جاری تھیں۔
مکان اور اس کے متعلقہ گلزار میں دُنیا کی تمام آرائشیں اور آسائشیں موجود تھیں۔
ں ہر عمارت بجائے خود ایک چھوٹی سی جنت تھی۔ وہاں اشجار و اثمار کی
ات، پانی کی افراط، ہر طرف گلزار و سبزہ زار، یہی تو وہ چیزیں ہیں جن سے
نکھوں میں ٹھنڈک ملتی ہے۔ دل و دماغ میں سُرور پیدا ہوتا ہے۔
نظارہ جگہ جگہ نظر کا دامن پکڑتا مگر جنت کی فرحت زا ہوائیں آگے بڑھنے
ا تقاضا کرتی تھیں۔ چلتے چلتے ایک جگہ دیکھا کہ خلقت کا اچھا خاصہ جمگھٹا ہے
ن و مرد سب کے سب خوشنما لباس میں ملبّس ہیں۔ ہاتھوں میں تازہ پھولوں کے
ہار لئے کسی کے انتظار میں چشم براہ ہیں۔ میں نے چاہا کہ اس ہنگامے سے بچکر
گزر جاؤں مگر ہمراہی بچوں نے راستہ روکا کہ یہ آپ کے ہمسائے ہیں۔ آپ کے
استقبال کو آئے ہیں۔ میں قریب جا کر پیدل چلنے لگا۔ مرد گلے ملے۔ عورتوں نے
اس کثرت سے ہار پہنائے کہ گردن جھک گئی۔ لوگوں نے مجھے اور ہمراہی بچوں کو
آگے کر دیا اور خود پیچھے پیچھے چلے۔ راستے میں عطر بیزیاں اور گلریزیاں جاری ہیں
تا آنکہ ہم ایک عمارت کے سامنے پہنچے جہاں سبز پتوں کی خوشنما محرابوں پر

پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں ۔ تروتازہ میوے شاخوں سے لٹک رہے تھے ۔ جا بجا گلینے آویزاں تھے ۔ جونہی ہم غربی دروازہ سے داخل ہوئے پاکیزہ لباس اور خوبصورت لڑکیوں نے جو پہلے ہی ہاتھوں میں ساز لئے دو رویہ کھڑی تھیں ۔ "اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما" کا ترانہ شروع کیا ۔ لذیذ کھانے اور شیریں میوے میزوں پر چنے ہوئے تھے ۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور پھر کھانا تناول کیا ۔ میوے کھائے ۔ اختتامِ طعام پر ایک صاحب بولے ۔ بھائی یہ عمارت تمہاری آرام گاہ ہے ۔ دنیا میں تم نے ان بچوں پر احسان کیا تھا ۔ یہ اس کا بدلا دیں گے ۔ ہر حال میں تمہاری خوشیوں کو دوبالا کریں گے ۔ اس جگہ رنج و غم اپنا تاریک سایہ نہیں ڈال سکتے ۔ مسرتِ ابدی اور سرورِ سرمدی ہمیشہ جلوہ فرما ہیں ۔ موت اور مصیبت کا کسی کو وہم نہیں گزرتا یہاں کلیاں چٹک کر پھول تو بن جاتی ہیں مگر پھول مرجھا کر خاک نہیں ہوتے ۔ دنیا میں جو لوگ پیر کہن سال ہو کر مرتے تھے وہ یہاں جوان ہو جاتے ہیں اور پیرِ فرتوت تک جوانی کی ردا پہن لیتے ہیں ۔ غرض یہاں انسان پر ہمیشہ جوانی اور باغوں میں سدا بہار رہتی ہے ۔

بہشتِ بریں

میں نے سب کی عزت افزائی اور تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا ۔ وہ اجازت لے کر خوشی خوشی رخصت ہوئے ۔ جب شاہانہ سج دھج کی عمارت اور امیرانہ ٹھاٹھ کا سامان ، گلزار ، سبزہ زار ، ثمر شیریں سے جھکے ہوئے اشجار کو دیکھا تو میں نہال ہو گیا اس عالم کا کیا کہوں ، یہاں کا ہر ذرہ حسن کی دنیا ، ہر حباب خوبصورتی کا چشمہ ، ہر پتہ خوبی میں کامل ہے ۔ اس سلامتی کے گھر میں آ کر میں نے سجدہ شکر کیا ۔ رات

ہوئی تو یہ مکان بقعۂ نور بن گیا۔ در و دیوار سے نور برسنے لگا۔ باہر نکل کر دیکھا ہر خارے خوشنما سُرخ کرنیں پھُوٹ پھُوٹ کر نکلتی ہیں۔ ہر کلی ایک چھوٹے قمقمے کی طرح روشن ہے۔ جگنو کی طرح روشن جسم والے چھوٹے چھوٹے پرندے فضا میں منوّر گیندوں کی طرح اُڑتے تھے۔ ان کا نُورانی عکس آبِ رواں میں پڑتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سنہری بدن والی مخلوق پانی میں نہا رہی ہے۔ میں ایک عرصہ اس منظر سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر میں مسہری پر پڑ کر سو گیا۔ نیند کیا تھی۔ لُطفِ زندگی اور تجدیدِ جوانی تھی۔ صبح ہوئی اُٹھا تو خود بخود اُچھلنے کُودنے بھاگنے دوڑنے کو دل چاہا۔ حیاتِ تازہ رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ میں ٹہلتا ٹہلتا احاطے کے باہر نکل گیا۔ لطیف اور عطر بیز ہوا نے طبیعت میں ایسا سرُور و انبساط پیدا کیا کہ سبزہ زار میں دوڑنے لگا۔ نرم فرشِ گیاہ، لطافتوں سے بھری ہوئی ہوا کیا کہوں کیا لُطف اُٹھایا۔ دُنیا کی سیرِ صبح کی ہزار بہاریں قدم قدم پر قربان تھیں۔ تھوڑی دیر پیادہ پا گیا۔ پھر سواری کا خیال آیا۔ اسی سبزہ زار میں جگہ جگہ براق پھرتے تھے۔ میں ایک پر سوار ہُوا وہ کبھی گھوڑے کی طرح سرپٹ، کبھی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا دوڑا۔ میں ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ دُنیا میرے گرد گھومتی نظر آتی تھی۔ مگر یہ عالم تھا کہ سر ذرا نہ چکرایا اور نہ کوئی اور تکلیف ہوئی۔ اتنے میں سامنے سے ایک سدِّ سکندری نمودار ہوئی۔ براق ایک کھُلے پھاٹک کے سامنے ٹھیرا۔ اس پر خوشنما حروف میں وادئ مقدّس لکھا ہُوا تھا۔ مَیں نے بُراق کو بڑھانا چاہا۔ اُس نے خلافِ توقع اندر داخل ہونے سے گریز کیا۔ میں ناچار اُترا اور پا پیادہ اس خطّۂ پاک میں داخل ہُوا۔ سبز پوش پہاڑ ہر طرف جاذبِ نظر تھے۔ کہیں پھُولوں اور

پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں، کہیں بھینی بھینی نگہتیں کہیں خوشبو کی تیز لپٹیں باغوں کی زمین پھولوں سے پٹی پڑی تھی۔ ہر طرف خوشنما درختوں کی قطاریں جدھر نظر دوڑاؤ لالہ زار۔ متوالی ہواؤں میں ہریالی مست ہوکر جھومتی تھی۔ پتے تالیاں بجاتے تھے۔ موجِ رواں سے ساز کی آواز پیدا تھی۔ خوبصورت پرندوں کے طرب زا چہچہے فضا میں ایک کیف پیدا کرتے تھے۔ دل نے چاہا کہ عمر بھر یہیں قیام کروں۔ ایک راہ گیر سے جو پھاٹک کی طرف آرہا تھا سوال کیا کہ صاحب یہ کون سا مقام ہے۔ اس بستی کا کیا نام ہے۔ اس نے کمال محبت سے کہا تم پر سلامتی ہو وادیٔ مقدس ہے۔ ان محبانِ وطن کے لئے مخصوص ہے جن کی مساعیٔ جمیلہ قوموں اور ملکوں کے ذہنی اور مادی انقلاب کا باعث ہوئی جنھوں نے اپنی عمریں تمدنی اور ملکی اصلاح میں صرف کردیں۔ تم آگے بڑھو اور دیکھو کہ اب وہ کس طرح نور کے تاج سر پر پہنے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اے عزیز بھائی میں بھی تمہاری طرح اس جگہ سیر کو آیا تھا۔ اب لوٹا جاتا ہوں۔

میں جوں جوں آگے بڑھا۔ مناظر کی دلکشی میں اضافہ ہوتا گیا۔ خالص چاندی کی عمارتوں پر سونے کے عکس نظر آئے۔ ہر عمارت کے متعلق ایک باغ۔ ہر باغ میں بہار۔ اس رنگ و بو کی دنیا میں ہر طرف مسرت مسکراتی تھی۔ انسانی تخیل ایسے خطۂ زمین کی تخلیق سے عاجز ہے۔ فطرتِ آزاد کے ایسے مناظر اور کسی دنیا میں ہو سکتے ہیں؟ میں وہاں کے باشندوں کا جمالِ بے مثال دیکھ کر محوِ حیرت ہوگیا۔ خوش خصال اور شیریں مقال۔ سینے کنول سے زیادہ پاک۔ دِل مخلوق کی محبت سے معمور۔ سب کے سر پر کلاہِ پُر نور۔ اس جگہ جس سے ملا محظوظ ہوا۔ اُن

فرشتہ خصال لوگوں سے مل کر اور اس وسیع وبسیط بہار آفریں وادی کو سرسری نظر سے دیکھ کر میں واپس لوٹا۔ ایک بُراق پر سوار ہو کر گھر پہنچا۔

دُوسرے روز بھی صبح بہاریں اُڑاتی اور مسرت بانٹتی آئی۔ آج میں سمت مغرب کی طرف سیر کو نکلا۔ حسب معمول بُراق پر سوار ہوا۔ منٹوں میں میلوں کی مسافت طے کی اور "غازی آباد" میں داخل ہوا۔ جہاں غازی عشرتِ زیست کے مزے لیتے تھے۔ یہ مقامِ عالی ان کے لئے مخصوص ہے جنھوں نے عمر ملّی و مُلکی خدمت میں گذاری جو بزمِ طرب کو چھوڑ کر رزمِ پیہم میں مصروف رہے۔ جن کی بلند ہمتوں نے خارِ راہ کو پھُول تصور کیا۔ مُلک و ملّت کو موت اور غلامی کے مُنہ سے نکالا اور شکست کو فتح میں بدل دیا۔ باغِ خیال کے جتنے مناظر اس وقت تک پیشِ نظر رہے، یہاں کی سبزی ان سے بدرجہا بہتر پائی۔ اس سرزمینِ پاک کی لطافت لفظوں میں نہیں سماتی رواں پانی میں وہ ترنّم تھا کہ ذہنی موسیقی کے جانفزا نغمے مات تھے۔ باغ کے گل حسن و رنگ کے بہترین نمونے تھے سبز ڈالیوں نے پھُولوں کے نیلے پیلے گہنے پہن رکھے تھے ان پھُولوں کی کٹوریوں میں نُورانی شبنم کی شراب جھلک رہی تھی۔ لالہ وسمن میں وہ نزہتیں تھیں جن سے نظر میں نُور اور دل میں سُرور پیدا ہوتا تھا۔ بلبلِ رنگیں نوا کے ترانے محبت کے دلکش راگ سے زیادہ میٹھے تھے۔ ہوائیں عطر میں ڈوب کر آتیں اور کیف برساتی تھیں۔ یہاں سونے کی عمارتوں پر لعل و جواہر کے گنبد اک شان پیدا کر رہے تھے۔ فرشتوں سے پاک صُورت لوگ ہر طرف خوش وقت ہو رہے تھے جو ہاتھ کو قبضۂ شمشیر پر رکھتے تھے تو اُس سے نُورانی شعاعیں نکلتی تھیں۔ جن کو دیکھ

کردن میں انبساط کی لہر دوڑتی تھی - ان عالی مرتبت حضرات میں سے ایک نے دریافت کیا کہ اے صاحب کیا یہ سرزمین خدا کے انعامات میں سے بہترین انعام نہیں - آیا کوئی اور خطہ خوبصورتی میں اس کے برابر ہے - اس نے کہا کہ تم نے عشق زار یا شہداء کی بستی نہیں دیکھی - جہاں ہزاروں قسم کے نکہت بداماں اور ماہ در آغوش چشمے مناظرِ قدرت کو چار چاند لگاتے ہیں - جہاں زریں اور رنگیں منقار بلبلیں ہار سنگار کے خوبصورت ٹہنیوں پر بیٹھی زمزمہ سرائی کرتی ہیں - اس جہانِ رنگ و بُو کے ہر برگ و گیاہ میں ایسی رعنائی و زیبائی ہے جس پر لاکھ ایسی دُنیائیں قربان ہیں - پیارے بھائی وہ ان لوگوں کی بستی ہے جنھوں نے اس خاکی دُنیا میں اپنے عزیزوں، ہمسایوں اور ہم وطنوں کے لئے اپنا عیش و آرام، اپنا زر و مال اور جان تک نثار کر دی اور شہداء کہلائے یہاں اشجار مستوں کی طرح جھومتے ہیں اور سب بلبلیں خوبصورت درختوں پر لٹک کر پُر کیف نظارہ پیش کرتی ہیں - اس زمین کے آسمان پر قوس و قزح ہر وقت دِل کو محظوظ کرتی ہے - اس کا فرش کثافتوں سے ایسا پاک ہے کہ رات کو چاند اور تارے زمین پر جھلملاتے ہیں - وہاں برفانی چوٹیاں صبح کو چاندی کا انبار نظر آتی ہیں غروب آفتاب کے وقت سونے کے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں -

وہاں قدرت کا حُسن خود نمائی کے لئے بیتاب ہے - موج نکہتِ پُر نور کے ملکورے مسرت کی لہریں پیدا کرتے ہیں - متبسم شگوفے آسمان کے تاروں سے زیادہ جمیل نظر آتے ہیں - وہاں کی عمارتوں پر زور و جواہر نقش و نگار، دُلہن کے زر فشاں چہرے کی طرح دِل پسند ہیں - ان محلات کے سامنے تخت

طاؤس سے ہزار درجہ افضل سونے اور موتیوں کے تخت پر لوگ نورانی ہتھیاروں سے سجے پیکرِ انوار بنے بیٹھے ہیں اور خداوند کریم کے انعاماتِ بیکراں پر اطمینان کی نظر ڈالتے ہیں۔ اور مسرور ہوتے ہیں۔ سُورج کی زرّیں کرنیں گھنی سبز شاخوں سے چھن کر ان کی پابوسی کرتی ہیں۔ سامنے آبِ رواں پر ضیائے مرتعش کے بے قرار نقوش دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہیں۔ ان کے مردانہ حسن اور سپاہیانہ خط و خال کو دیکھ کر ہر شخص کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ لوگ جنّت کے شہزادے ہیں۔ اُن کے درجے سب سے بلند ہیں۔ میں بیتاب ہو کر پکارا کہ میں اس جلوہ ریز دُنیا اور وہاں کے خوش بخت باشندوں کو ضرور دیکھوں گا۔ وہ مردِ عالی مقام بولا۔ تم براق پر چڑھ کر مشرق کی سمت جاؤ۔ پہلے وادیٔ محبت کو طے کرو۔ پھر وہ روشن اور درخشندہ دُنیا صاف نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ براق پر سوار ہو کر مشرق کا رُخ کیا۔ وہ متکلّم ازراہِ عنایت رہنمائی کرنے کے لئے دوسرے براق پر ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر چل کر وادیٔ محبّت آ گئی۔ جہاں ہری ہری دُوب کا زمرّدیں فرش بچھا ہُوا تھا۔ دامنِ کوہ میں خاموش ندی آہستہ آہستہ بہ رہی تھی۔ پہاڑ سبز دوشالہ اوڑھے کھڑے تھے۔ درختوں کی چوٹیوں پر کچھ کچھ پالا جما ہُوا تھا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ فردوس جس کے مقابلے میں یہ عالم بہت بے کیف ہے اِس سے اُس کا مقابلہ کیا ہے۔ خاک کو عالمِ پاک سے کیا نسبت میری طبیعت اُکتا گئی۔ جُوں جُوں نظر دوڑائی۔ خیال گزرا کہ یہ جگہ میری دیکھی بھالی ہے۔ سوچتا ہُوں تو حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ حافظہ پر زور دیا مگر یاد نہ کر سکا۔ آخر سوچ کر بولا کہ یہ جگہ پہلے دیکھی ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔ ہاں سب نے

دیکھی ہے۔ روزِ آفرینش انسانی پیدائش تک رُوحیں حسین عورتیں بن کر اس جگہ رہی تھیں۔ ارواح جسم کی تاریکی کو دیکھ کر گھبراتی تھیں۔ تاآنکہ سازِ جسم سے محبت کا ایک شیریں نغمہ پیدا ہوا۔ روح جسم کے کیف آور نغمے کو سُن کر وصال کے لئے بیتاب ہو گئی۔ تمنائے وصال کی تکمیل کا نتیجہ دُنیا میں ہمارا ہبوط ہے۔

میں نے کہا۔ دوست تم مجھے گلستان سے نکال کر کسی خارستان میں لے آئے۔ اس نے کہا عزیز! وادیٔ محبت سے کوئی خطہ خوشتر نہیں۔ اسی مقام کا دوسرا نام بہشتِ بریں ہے۔ اسی وادی کا سفر کر کے اس جگہ جا سکتے ہیں جہاں وہ لوگ مقیم ہیں جنہوں نے مخلوقِ خدا کی خدمت کرنے میں جانِ عزیز تک قربان کی۔ جہاں خدا بندوں کے لئے سلامتی کے پیہم پیغام بھیجتا ہے عشق زار وادیٔ محبت کا آخری حصہ ہے۔ وادیٔ محبت کی مسافت کو طے کئے بغیر اس حسین دُنیا اور ان جنت کے شہزادوں کا دیدار ممکن نہیں

میں نے غور کی نظر سے گرد و پیش کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ میں تو شوالک کی محبوب و مانوس چوٹی پر آنکلا ہوں۔ جہاں رفیقہ حیات کے عشق جاں افزا کا پہلا خوشگوار تجربہ ہوا تھا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ محبت کا بھولا سبق یاد آگیا۔ دل میں میٹھا میٹھا سا درد اُٹھا۔ میں نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ تصور نے آنکھوں کے سامنے وہ پہلا عشق انگیز منظر کھینچ دیا۔ جب کہ میں نے اس چور کو سامنے والی چٹان پر نغمہ گر دیکھا تھا۔ پھر وہ غم انگیز منظر بھی سامنے آیا۔ جبکہ وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ غرض اس کے تصور نے میرا زاویۂ نگاہ بدل دیا۔ اب وہاں کی ہر چیز حسین تھی۔ اس کے جنت نگاہ جلوے آنکھوں

لے سامنے آ رہے تھے۔ اس کے فردوس گوش نغمے مدتوں کے بعد
ی کانوں میں گونج رہے تھے۔ یہاں کی مشتِ خاک بہشت سے لاکھ درجہ بہتر
ی جنت کے نظر افروز مناظر کا تصور بھی مجھے بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ وادی
بت کا ہر خار ایک شگفتہ گلزار نظر آتا تھا۔ جنت میں ہوائیں کتنی ہی عطر بیز
ہوں نہ ہوں، یہاں کی عشق انگیز اور کیف آور فضاؤں کا مقابلہ کہاں۔
بوب کا حسین تصور، اس کی محبت کی پیاری یاد ایک ایسی گرانمایہ نعمت
ہے جس کو کسی بہشت کے بدلے بیچا نہیں جا سکتا۔ ہواؤں میں اس کے
سانس کی آواز اور فضاؤں میں اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی
تھی۔ کبھی وہ اس غربی چٹان میں سے جھانکتی اور پھر پیچھے ہٹ جاتی
تھی۔ عشق کی شیریں یاد نے مجھے ایک نورانی دنیا میں لا ڈالا تھا۔ میں
چاہتا تھا کہ خیالی تجلیات اور دلربا نظاروں سے خاموش آبادی کی پرسکون
فضا میں بیٹھا مسرور ہوتا رہوں۔ مگر میرے ہمراہی کو اصرار تھا کہ میں آگے
چلوں۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ محبت کی وادیوں میں جو اپنے آپ کو کھو دیتا
ہے وہ خام رہتا ہے۔ جو آگے بڑھ کر عشق زار میں داخل ہو جاتا ہے۔
وہ مقاصدِ زندگی کو پا لیتا ہے۔ اے عزیز! شہادت کی موت جس
طرح محبت کی زندگی کی تکمیل ہے۔ اسی طرح وادیٔ محبت کا اختتام
عشق زار پر ہوتا ہے۔ میں تمہیں اور طرف لے چلتا مگر کیا کروں۔
عشق زار کو جانے کے لئے وادیٔ محبت میں سے گزرنا پڑتا ہے۔
بعض تیری طرح وادیٔ محبت میں رک کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ ہمت کر کے

عشق زار میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کی زندگی ابنائے وطن اور برادرانِ
ملت کے کام آئی۔ جنہوں نے مخلوق کی محبت میں موت کو زندگی سے
زیادہ خوشگوار سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے دُنیا میں تو نے بوالہوسی شعار کی۔
اب پھر عشق مجازی میں کھویا گیا ہے۔ حالانکہ عشق حقیقی کی منزل یعنی
شہیدوں کی بستی کچھ دُور نہیں۔ کاش تو وہاں پہنچ سکتا خلاقِ اکبر نے
اس سے زیادہ آرام دہ اور خوبصورت جنت کوئی نہیں بنائی۔ کیونکہ
وہ لوگ جو خدا کی راہ میں خلقِ خدا کی خاطر اپنا تن قربان کردیتے ہیں۔
وہ خدا کی نگاہ میں بے حد عزیز ہیں۔

اس شخص نے مجھے عشق مجازی کے کیف آور تصور سے بیدار
کرنے کی کوشش کی۔ میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اور میں بیدار ہوگیا۔ رفیقۂ حیات
کے حسین تصور سے نہیں بلکہ اس خوابِ گراں سے جو گورکھپور جیل میں
میری نگاہوں نے دیکھا تھا۔ دیوارِ زنداں کے قیدی پہرہ دار نے "سب
اچھا ہے حضور" پکارا۔ میں کلمہ پڑھ کر آنکھیں ملتا اُٹھا۔ صبح ہوچکی تھی۔
عارضِ فلک پر سُرخی چھا رہی تھی۔ فضا میں خاموشی تھی۔ طلوعِ آفتاب کی
تیاریاں تھیں۔ پرندے آزاد فضاؤں میں اُڑنا شروع ہوگئے تھے۔
خاموش فضا میں ان کی آواز سے نغمے برسنے لگے۔ ہوا کے جاں نواز جھونکوں
سے گدگدی محسوس ہوتی تھی۔ جیل کے قریب گاؤں کی ایک مسجد سے
مؤذن اللہ اکبر پکارا۔ تمام فضا اس حیّ و قیوم کے جلال و جبروت سے بھر
گئی۔ میں بھی دل میں لفظ دُہراتا رہا۔ آخر اس نے الصلوٰۃ خیرٌ

ینَ النَّوم (نماز نیند سے بہتر ہے) کہہ کر سوتوں کو جگایا۔ میری جان غفلتوں

سے بیدار ہو گئی۔ میں نے اُٹھ کر وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ دل میں موج

سرُور اور جذبے نُور جاری ہو گئی۔ میں نے نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر

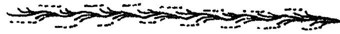
دُعا مانگی کہ " اے خدا! میری توبہ قبول کر۔ اے خدا مجھے نماز میں

ستقامت اور مخلوق کی خدمت کی توفیق دے۔ تاکہ اہلِ عالم کے امن

ور ترقی کا باعث بنوں۔ اور ایسا پاک جذبہ اور ایسا زرین موقع نصیب

کر کہ ملّت کے مفاد پر جان نثار کر کے دُنیا سے سُرخرو ہو جاؤں "

آمین ثم آمین



چودھری افضل حق کا نیا ادبی شاہکار

جواہرات

چودھری افضل حق کا زور قلم کسی تعریف کا محتاج نہیں آپ اپنی سابقہ تصنیفات سے دنیائے ادب میں بےمثل شہرت حاصل کر چکے ہیں اور ایک تصنیف پر ۵۰۰ روپیہ انعام بھی حاصل کر چکے ہیں

جواہرات

چودھری صاحب کی نئی ہنگامہ خیز تصنیف ہے جس نے فن افسانہ نویسی کو چار چاند لگا دیئے ہیں

جن اصحاب نے چودھری صاحب کی پہلی تصانیف دیکھی ہیں وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "جواہرات" کس پایہ کی کتاب ہوگی یہ دلگداز افسانوں کا مرقع جمیل ہے

حجم سوا دو سو صفحات　　قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک

اپنے شہر کے تاجروں سے طلب کریں

محبوبِ خدا

مصنفہ چودھری افضل حق صاحب

چودھری افضل حق صاحب نے شہرہ آفاق کتاب "زندگی" کو گورکھپور جیل میں تصنیف کیا تھا۔ یہ کتاب "محبوبِ خدا" آپ نے ملتان اور راولپنڈی جیل کی تنہائیوں میں بیٹھ کر لکھی ہے۔ کتاب کیا ہے عشق رسول اللہ کا بہتا ہوا دریا ہے جس میں علم ادب کی موجیں ہزار لطافتوں کو لے کر اٹھتی ہیں۔ جیل خانہ کی سلاخوں کے پیچھے اور محابس کی بلند دیواروں میں مقید ہو کر ایک مرد مجاہد کیا سوچتا ہے۔ اس کا تخیل پر پرواز پیدا کر کے یثرب و بطحا کی پاک سرزمین میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں انسان کامل نے اپنے عمل اور اخلاق سے دنیا کو سچی زندگی کا سبق دیا تھا۔ کہ اسکو پابندِ سلاسل کر کے قید خانہ میں بٹھا دیا گیا ہو اور پھر عرب کے مجاہد برحق اور آخری نبی کی سیرت قلمبند کرے جن لوگوں کی اپنی زندگی قول کے دائرے سے باہر نہ نکلی ہو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سرتاپا عملی زندگی کو کیا بیان کریں گے۔

اِس کتاب کا ایک ایک حرف درسِ حیات ہے اور مسلمانوں میں زندگی کا نیا احساس پیدا کرنے کا کفیل ہے۔ ایسی تصانیف کے پڑھنے سے افراد و اقوام کے دل میں خوشگوار انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

کتاب کا حجم ۲۰۰ صفحات اور سائز $\frac{22\times18}{8}$ کاغذ ولائتی نہایت عمدہ

لکھائی چھپائی دلفریب

جلد نہایت خوبصورت اور مضبوط قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

آزادیٔ ہند

اس رنگین افسانہ میں کتاب "زندگی" اور "محبوبِ خدا" کے فاضل مصنف نے
اس اچھوتے انداز سے ملکی تحریک پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ کتاب ادبی و افادی لحاظ سے
دورِ حاضر کی بہترین تصنیف سمجھی جانے کے قابل ہے وطن کو سب سے پیارا نام ہے لیکن
اس کی آزادی خون سے لکھی جانے والی حقیقت ہے جسے اکثر خشک مضامین میں بیان کیا جاتا
رہا ہے۔ اس کتاب کا ہر صفحہ بجائے خود افسانہ ہے پیرایہ ایسا سحر اثر ہے کہ محویت کا عالم
طاری ہو جاتا ہے وطن کی آزادی اور اہلِ وطن کی بھلائی کو افسانہ کے اندر دلنشین
کہانیوں میں بیان کر کے باغ میں بہار پیدا کی گئی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں
کے نصب العین کو ایک غیر فانی نقش چھوڑا ہے۔

یہ پر اثر افسانہ خود ہی دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے طبیعت
میں شرف اور سیاسی سربلندی پیدا کرنے کے لئے یہ کتاب انشاءاللہ
عدیم النظیر ثابت ہوگی۔ مصنف کا نام اور اس کی پہلی تصانیف اس امر کی کافی
ضمانت ہیں کہ جو کچھ اس افسانہ کے متعلق کہا گیا ہے درست ثابت ہوگا ۔
جن حضرات نے کتاب "زندگی" اور "محبوبِ خدا" کا مطالعہ کیا ہے ان سے
توقع ہے کہ وہ اس کتاب کی بھی خریداری قبول فرمائیں گے۔

قیمت

دو روپے